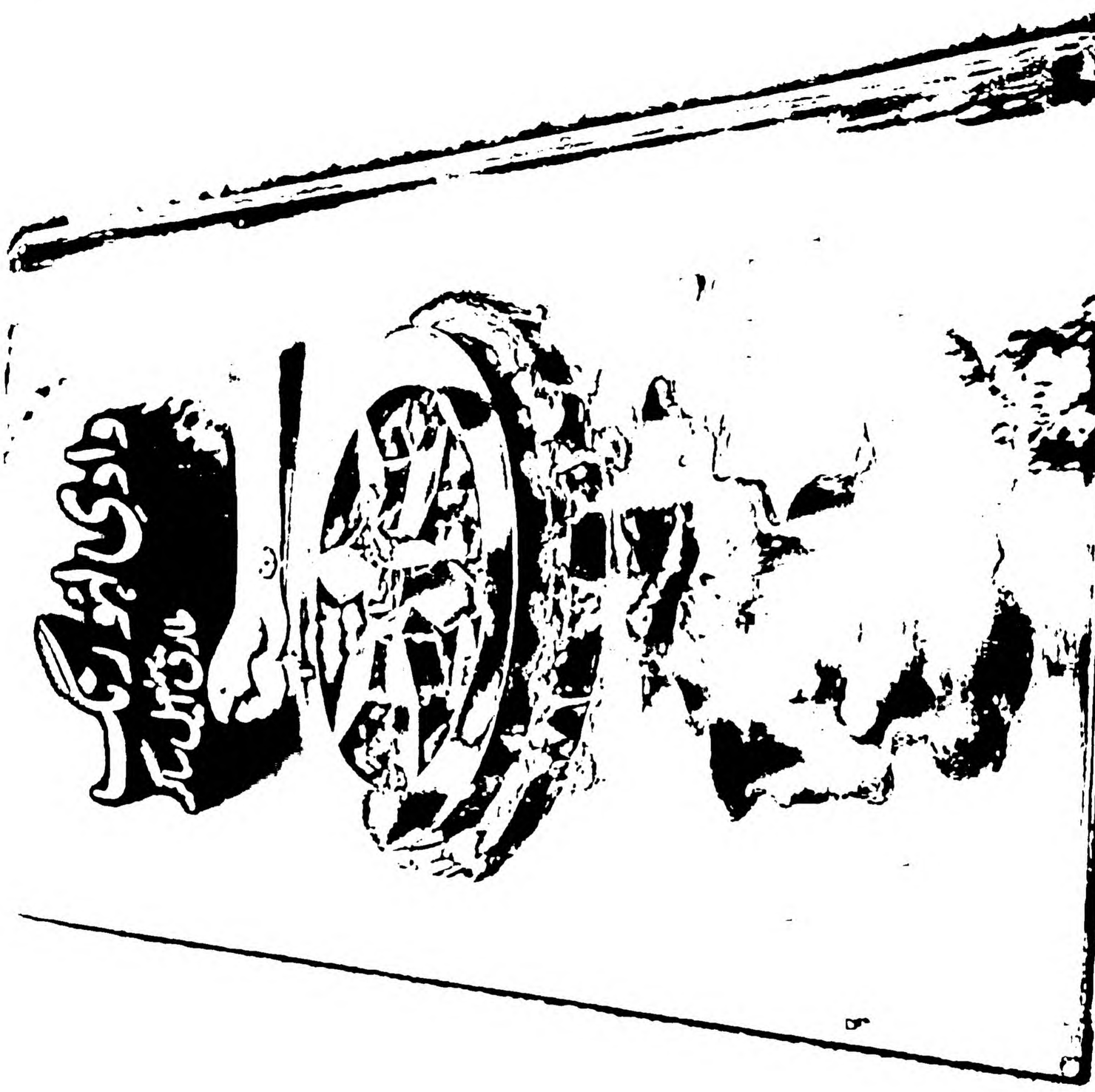

ترتیب

دیباچہ	9
خفیہ مشن	11
ماضی کے جھروکوں سے	19
پہلا معرکہ	29
شیرو	39
زہراں	53
سجاول خان	85
یلغار	101
موت کی شاہراہ	115
تجدید عہد	153
سلگتی آہیں	181
لہو کا چراغ	195
شہادت کی منزل	239
انجانی منزل کا مسافر	279
شیرو ڈکیت	315
اللہ کا سپاہی	337
جب دشمن نے للکارا	345
آپریشن نیپال	351
آخری حصار	357

پیش لفظ

"وادی نور ریگ" کی دلکش خوبیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے——
میں نے جب بھی قلم سنبھالا——!
ضمیر نے دست سوال بن کر شیشہ دل پر ایسی ضرب لگائی کہ میں لرز کر رہ گیا——!
ذہن سلگتے ہوئے سوالات کی آماجگاہ بن جاتا—— کوئی نادیدہ طاقت مجھ سے پوچھتی تھی——!
——کیا تم اپنے آئینہ دل میں کشمیر کے مکمل خدوخال دیکھ سکتے ہو؟
——تمہاری فگار انگلیوں میں اتنی سکت ہے کہ کشمیر کے سینے میں سلگتی کہانیاں صفحہ قرطاس پر بکھیر سکو؟
——اس کے درختوں کی ہریالیوں میں سرسراتی ہواؤں کے نوحے تمہاری سماعت کے اختیار میں ہیں؟ اور کیا تم
——مظلوموں اور نارساؤں کی آہوں اور آنسوؤں کو یکجا کر کے اپنے لیے نشان منزل تلاش کر لو گے؟
ان سوالات کے جوابات کھوجنے کے لیے جب بھی میں تاریخ کا سینہ ٹٹولتا۔ یہاں مجھے مصلحتوں اور وسوسوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔
میں ہار کر قلم رکھ دیتا——!
لیکن میری فطرت میں چھپا سپاہی مجھے کسی پل چین نہ لینے دیتا۔
وقت کی لہروں پر ہلکورے لیتا میرا ذہن تیرہ صدیاں پیچھے لوٹتا اور مجھے اٹلانٹک کے ساحلوں پر لے جاتا—— جہاں حضرت عقبہ بن نافع کا لشکر رکتا ہے—— اور وہ

انقلاب کی سرخی سوہنوں کو ہوا میں اچھال کر کہتے ہیں:

"مرب کعبہ کی قسم!
اگر میرے راستے میں یہ سرخی سوہنیں نہ آجاتیں تو خدا کی وحدانیت کا پرچم میں
یورپ کے میدانوں میں لہرا کر دم لیتا۔"

طارق بن زیاد کے وہ سوار جنہوں نے جن کا امیر لشکر اپنے جہاز جلا کر اسپین کو اپنے
گھوڑوں کے سموں سے روندتا ہوا فرانس کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا——!

میرے ذہنی افق پر خیرالدین بارباروسہ کا عزم کوندنے لگا جس نے سمندروں کی
طغیانیوں کو زیر کر کے یورپ اور افریقہ کے ساحلوں کو کھنگال ڈالا تھا۔

اور آخر تاریخ کا سرغنہ کرتا میرا تخیل مجھے اس برصغیر میں گھسیٹ لاتا جہاں محمد
بن قاسم نے ایک مسلمان زادی کی پکار کا مول چکایا تھا——!

اور جہاں سلطان محمود غزنوی پہاڑوں سے نکل کر سومنات کے غرور کو روندتا ہوا
ہندوستان کے کلیجے میں اتر گیا تھا——!

ان سرپھرے خوابوں کے سامنے "ہربرٹ صاحب" اور "بجرنگ بلی" کے نعرے دم توڑتے
دکھائی دیتے تھے——!

"دلی لو رنگ" وہی کہانی ہے۔
اپنے خون جگر سے لکھی یہ کہانی اس لیے آپ تک لے آیا ہوں کہ اب بھی اس
خاکستر میں کچھ چنگاریاں سلگتی دکھائی پڑتی ہیں——!
اللہ! کوئی بھڑکتی ہوئی چنگاری شعلے کا روپ دھار لے اور ان آنکھوں کو شعلہ
بن کر پھونک دے خاشاک غیراللہ کو—— کی تعبیر دیکھنے کو مل جائے۔

طارق اسمٰعیل ساگر

۲۰ ستمبر ۸۴

خفیہ مشن

پندرہ مئی ۱۹۶۵ء کی ایک شام:

جیپ انہوں نے گاؤں سے تقریباً ایک فرلانگ دور ہی روک دی تھی۔

——سورج کا آخری گولہ ان کے عقب میں بھی اس سرکنڈے کے درختوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا جو ایک طرح اس گاؤں کی حد بھی تھی—— انہوں نے دس میل کچا راستہ طے کیا تھا۔ کیپٹن ہیڈکوارٹر سے ان کی روانگی اتنی اچانک تھی کہ صوبے دار حکم داد پکا کر رہ گیا تھا۔ کیپٹن صاحب بغیر اطلاع اچانک آئے اور انہوں نے کوئی تمہید باندھے بغیر اسے جیپ تیار کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

انہوں نے ڈرائیور کو بھی ساتھ لینا مناسب نہ سمجھا اور اس وقت تو صوبے دار حکم داد حیران ہی رہ گیا جب کیپٹن نے اسے سول کپڑے پہننے کے لیے کہا۔

"ہم لوگ آرمی کی جیپ بھی استعمال نہیں کریں گے۔" انہوں نے کمرے کے باہر کھڑے کھڑے کہا اور قبل اس کے کہ صوبے دار حکم داد ان سے سوالات کا سلسلہ شروع کرے، وہ اندر داخل ہو گئے تھے۔

صوبے دار نے رینجرز کی جیپ کسی نہ کسی طرح حاصل کر لی تھی۔ اب یہاں وہ پرائیویٹ جیپ حاصل کرنے سے تو رہا۔ احتیاطاً اس نے ٹینکی پوری بھروالی تھی کیونکہ ابھی تک اسے اگلی منزل کا علم نہیں تھا۔

صوبے دار حکم داد پچھلے دو سال سے اسی سرحدی علاقے میں مختلف مقامات پر انٹیلی جنس ڈیوٹی کر رہا تھا۔ وہ ایف۔ آئی۔ یو سے وابستہ تھا اور اس علاقے کے چپے چپے پر اس کی نظر تھی۔ یہاں کے مقامی بدمعاش، اسمگلر، چور، خطرناک اور بے ضرر ہر طرح کے لوگوں سے اسے آگاہی تھی—— اس کی سروس کا زیادہ تر حصہ انٹیلی جنس ڈیوٹی ہی کی نذر ہوا تھا۔ صوبے دار حکم داد کی جہاندیدہ نظروں نے پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ سے پیش آنے والی تبدیلیوں کا بغور جائزہ لیا تھا اور اس کے تجربے نے اسے بتا دیا تھا کہ اب کچھ کر گزرنے کا

وقت آگیا ہے۔ اگلے چند دنوں کے دورے سے واپس آیا تو کمپنی ہیڈ کوارٹر میں ایک پیغام
تین صبح جب وہ جنرل ہیڈ کوارٹر سے اس کی خصوصی ملاقات کے ایک افسر انعام مشن پر
اس کا منتظر تھا۔۔۔ جنرل ہیڈ کوارٹر سے اس کی طلبی کا مطلب کیا ہے۔۔۔ یہ اچانک
آ رہے ہیں۔۔۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔۔۔ یہ اچانک
ہی۔ ایچ۔ کیو دنوں کو کیا سوجھی؟ اشارہ تک بھی کوئی پیشگی اطلاع اسے نہیں ملی تھی اور نہ
کیپٹن صاحب ہی۔ ایچ۔ کیو سے آنے والے وہ بھی کچھ کم پراسرار ثابت نہیں ہوئے تھے۔ اگر ان
کا شناختی کارڈ ان کے پاس نہ ہوتا تو صوبے دار حکم داد شاید انہیں گرفتار کر لیتا۔۔۔ ان کی
قد کاٹھ ایسی ہی تھی۔

☆○☆

جیپ کے اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ رکھے وہ غصہ چوکس ان کی آمد کا منتظر تھا۔ اس کی
تو ہی زندگی کیپٹنوں اور میجروں سے ملتے ملاتے ہی گزری تھی، لیکن اس چھریرے بدن کے
سانولے رنگ والے نوجوان کیپٹن میں اسے کوئی ایسی بات ضرور دکھائی دی تھی جس کی
وضاحت وہ کر نہ پایا۔ جب بھی اس نے ذہن پر زور دیا وہاں سے ایک ہی جواب ملا: "بے
کوئی خاص بات اس شخص میں" اور بس۔

"خدا جانے یہ مجھے اندھیرے میں رکھ کر کہاں لے جائیں گے؟" اس نے سوچا۔

کیپٹن اسے جیپ ہی میں انتظار کرنے کا کہہ کر وائرلیس روم میں جا گھسے۔ انتظار کی
اوقات سے بچنے کے لیے اس نے کئی بار چاہا کہ سگریٹ سلگا لے، لیکن ہر دفعہ اس کا ہاتھ
جیب کے نزدیک پہنچ کر واپس آ جاتا حالانکہ وہ سول کپڑوں میں تھا اور یوں بھی اس کے
فرائض کی نوعیت ایسی تھی کہ اگر وہ اپنے افسر کے سامنے سگریٹ سلگا بھی لیتا تو کوئی ایسی
معیوب بات نہ ہوتی، لیکن نہ جانے کیوں وہ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہ کر سکا۔ اس وقت بھی
جب وہ بمشکل اپنا ہاتھ جیب کے اندر لے گیا تھا، اچانک اس کی نظر سامنے دروازے پر پڑی
جہاں سے کیپٹن صاحب ایک اور کیپٹن کے ساتھ گپ شپ کرتے برآمد ہوئے تھے۔ بجلی کی
سی پھرتی سے اس کا ہاتھ واپس اپنی جگہ پر آ گیا اور وہ چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔

"کتنی دیر سے اس علاقے میں ہو؟" کیپٹن نے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ہی اس
کو روانگی کا سگنل دے دیا۔

"سر! پچھلے دو سال سے اسی علاقے کے گرداگرد گھوم پھر رہا ہوں۔" اس نے اپنی آواز
کو حتی الوسع پرسکون بنائے رکھا۔

"ہوں!" ایک لمبی "ہوں" کیپٹن کے منہ سے خارج ہوئی۔ "ہم لورکوٹ کی طرف جا
رہے ہیں۔ مجھے شیرو سے ملنا ہے۔" انہوں نے دو ٹوک باتیں ایک ساتھ ہی کر ڈالیں۔

"شیرو سے؟" صوبے دار کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔۔۔ وہ لورکوٹ اور شیرو کے نام
پر یوں بدکا تھا جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار لیا ہو۔

"کیوں کیا بات ہے؟" اس کی اس حرکت کو کیپٹن صاحب نے نوٹ کیا تھا۔

"وہ تو سر....." وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہو رہا۔

"کیا ہے وہ؟" کیپٹن نے پہلی مرتبہ اس کی طرف گردن گھما کر دیکھا تھا۔

"وہ ہمارے کام کا آدمی نہیں ہے جناب۔" بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

"وٹ نانسنس! تو آپ نے ملاقات سے پہلے فیصلہ بھی کر لیا۔" کیپٹن کے لہجے میں چھپے طنز
کو صوبے دار حکم داد محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"جناب والا! میں نے دو تین مرتبہ کوشش کی کہ اسے کسی بھی طرح راہ راست پر
لاؤں، لیکن وہ نرمی یا سختی کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتا
ہے جناب۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہم اسے آج تک رنگے ہاتھوں پکڑ نہیں سکے۔ بڑی
مشکل سے پچھلے مہینے ہم نے خصوصی ناکے لگا کر اس کا مال پکڑ لیا جو وہ جنوں سے ہانک کر لا
رہا تھا۔۔۔ دو چار سونی سنگڑی گائیں، لیکن وہ۔۔۔ ہر بار کی طرح نکل گیا۔"

صوبے دار بولتا بولتا خود ہی چپ ہو گیا۔ اس نے دیکھا۔۔۔ کیپٹن اس کی باتوں پر کان
ہی نہیں دھر رہے۔ وہ تو جیپ کی ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں غرق
ہیں۔

"آج کل راستوں کی کیا پوزیشن ہے؟" انہوں نے اچانک بالکل الگ سی بات پوچھ لی۔

"ڈھلتے چاند کی راتیں ہیں جناب۔ اس کے باوجود کسی ایجنٹ نے پچھلے دس پندرہ دنوں
سے اس طرف سے "لانچ" کرنے کی ہمت نہیں کی۔"

"کیوں؟" کیپٹن نے بظاہر حیرت سے پوچھا۔

"کیا عرض کروں سر! یہ تو بہت اچھا علاقہ تھا۔ ہمارے لوگ اس طرف سے تالیاں بجاتے
ہوئے سرحد عبور کر جاتے تھے، لیکن برسات کی وجہ سے دوسری طرف چونکہ نالے اور
ندیاں طغیانی پر ہیں، اس لیے تمام موشی چور کمبخت اس طرف آن مرے ہیں۔ شیرو ہی کو
لیجیے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ کبھی بھول کر بھی اس طرف کا رخ

کہ کیپٹن نے جیسے ہی بتایا کہ وہ جیپ امریک بک کی ہوٹ سے اغوا کی گئی ہے
اس نے کہا تھا
"میں نے کہا تھا نا
حکومت کے اعلیٰ افسروں کی بیوی کے پاس تم نہ جانا"
یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا تھا
کیپٹن صاحب نے اس کا مطلب کچھ اور ہی سمجھا تھا
جب وہ صوبے دار نے کہا کہ اس کی تو اوپر تک پہنچ ہے تو وہ سمجھے
کہ وہ کسی بڑے افسر کی بیوی کی بات کر رہا ہے
اور اس لیے انہوں نے اس کی بات کاٹ دی تھی

☆○☆

کیپٹن صاحب نے بڑی بڑی باتیں کی تھیں
اس سے اس علاقے کے بچے بچے سے حقیر معلومات حاصل کر لی تھیں
"محفوظ راستے" "رینجرز اور انڈین بارڈر سیکورٹی فورس کے ٹھکانے" "چیک پوسٹوں" "سرحد کے آر پار چوریاں کرنے والوں کے راستے اور سرحد کے دونوں طرف حرکت کے لیے محفوظ تھے"
لیکن اصلی جنس کی خوش قسمتی کی وجہ سے ابھی تک ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے تھے
اصل میں صوبے دار تم دو کی کارگزاری یہی تھی کہ اس نے ایسے کتنے راستے ابھی تک چھپائے ہوئے تھے
وہ حقیقت وہ چاہتا تھا کہ جن راستوں سے جرائم پیشہ افراد کا آنا جانا شروع ہو جائے ان سے کسی ایجنٹ کو سرحد پار کروانا کتنا خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے

صوبے دار صاحب" سوچ کر کہا۔ جب گاڑی کر کے جب وہ لوگ نیچے اترے تو کیپٹن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ "جتنی ضرورت آج اس ملک کو شیر دل جیسے بہادروں کی ہے اتنی آج سے پہلے شاید کبھی نہیں تھی۔" کیپٹن کے لہجے نے صوبے دار کو حیران کر دیا۔
یہ بڑی بات تھی جو اس کی سمجھ میں آ گئی۔

☆○☆

[illegible] سے نکل کر [illegible] کی طرف چل پڑے
[illegible] کی محسوس کیے بغیر [illegible] سے ہی تھی [illegible]
[illegible] کے [illegible] سے [illegible] کی طرف چل پڑے
[illegible] کے [illegible] سے [illegible] کی [illegible]
کیپٹن نے [illegible] میں [illegible] سے [illegible] نے [illegible] کی بات سنی۔ "صوبے دار [illegible] صاحب کو [illegible] کے [illegible] کے [illegible] کے

HBC

اوپر والے برتھ سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق تو ابھی تک شیرو کو یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ یوں اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے اس کی منزل آ گئی ہو۔ کوئی اترنے والے نہیں تھے اس کے اتنائی قریبی رشتے دار آ رہے تھے۔

"تم نے بہت اچھا کیا شیرو۔" ایک بوڑھا مسلسل لڑکے کے اندر داخل ہوتے ہوئے مطمئن لہجے میں بولا۔ "بجری کی بات سننے کی بجائے تم لوگ بھی چلتی گاڑی سے کود جاتے۔ اب ہمیں اسے ڈھونڈنا پڑے گا۔ تم لوگ بھی چلو۔"

شیرو نے اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں سے کہا۔ "اس نے پستول والے نوجوان سے کہا۔ "پستول والے نوجوان نے کہا تھا۔"

"خان کو ہمارے بڑوں کی بات میں مداخلت نہیں کیا کرتے۔" شیرو نے اسے بڑی شفقت سے کہا۔ وہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

○

کمرے میں صوبے دار تھم دلو پہلے داخل ہوا۔ کیپٹن باہر کھڑا رہا۔ اس کی متلاشی نظریں وہاں موجود کسی بھی ممکن مداخلت کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"آؤ جی صوبے دار صاحب۔ جی آیاں نوں۔" شیرو نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ صوبے دار نے پہلی فرصت اس سے ہاتھ ملایا۔ اگر کیپٹن بیچ راستے میں اسے ہینڈ شیک نہ کی ہوتی تو وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھانے کے بجائے پوری قوت سے شیرو کے منہ پر گھونسہ رسید کرتا۔ تھم دلو بے بسی سے صرف ہونٹ چبا کر رہ گیا۔

"گرفتار کرنے آئے ہو؟" شیرو نے اگلا سوال داغا۔

"نہیں شیرو۔ ہم تمہیں گرفتار کرنے نہیں آئے۔" اس کے سوال کا جواب صوبے دار کے بجائے کیپٹن نے دیا جو صوبے دار کے بعد اندر داخل ہوا تھا۔

کیپٹن پر نظر پڑتے ہی شیرو یوں بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا جیسے طاقت ور اسپرنگ نے اسے فضا میں اچھال دیا ہو۔ اس نے کچھ کہنا چاہا' لیکن اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر کسی میکانکی عمل کے تحت اس کے بازو پھیل گئے۔

"شرفو!" اس کے حلق سے نکلنے والی آواز کسی کرناک چیخ سے مشابہ تھی۔

شیرو "کیپٹن اشرف خان بانہیں پھیلا کر اس سے لپٹ گیا۔

دونوں نے اپنے اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے ایک دوسرے سے زیادہ ضبط کا مظاہرہ کیا تھا' پھر بھی دونوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

شیرو نے کیپٹن اشرف خان کو الگ کیا اور کچھ کہنا چاہا' لیکن اس کے منہ سے بے ربط سے جملے نکلے۔ بمشکل "اشرف خان" نکلا اور دوبارہ اس نے کیپٹن کو اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ صوبے دار حیرت سے باری باری دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس ناٹک سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

صوبے دار نے محسوس کیا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا سننا چاہتے ہیں' لیکن کہہ نہیں پاتے۔ شیرو کے وہ ساتھی جو چند منٹ پہلے یہاں سے بھاگ گئے تھے اب واپس آ گئے تھے اور سبھی "مہمانوں" کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے دودھ کے گلاس رکھے ہوئے تھے' لیکن صوبے دار تھم دلو واضح طور پر محسوس کر سکتا تھا کہ دونوں اس دسترخوان پر موجود ہی نہیں ہیں ——— وہ کسی اور ہی عالم کے مکین بنے ہوئے تھے۔

یوں بھی وہ کسی طور شیرو کے دل میں نہ جھانک سکتا تھا بس کی نظریں اشرف خان کے چہرے پر گڑی تھیں اور جس کا ذہن پونچھ کے کوچہ و بازار میں بھٹک رہا تھا۔

———اس پونچھ میں جہاں نہ کوئی کیپٹن اشرف رہتا تھا اور نہ ہی شیرو ذکیت۔ وہاں تو دو جگری دوست قیام پذیر تھے۔

ایک جو نادر خان کا بیٹا تھا ——— شرفو کہلاتا اور دوسرا شیرو ——— دونوں یک جان و دو قالب تھے۔

پھر ——— ایک روز اس کا ساتھی اس سے بچھڑ گیا اور آج پھر اچانک وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

وہ کیسے یہاں آیا؟ وہ کیوں یہاں پہنچا؟

یہی کچھ سوچتا وہ ماضی کے ان اوراق میں گم ہو گیا جہاں جہاں اس کا اور شرفو کا ہم ساتھ ساتھ آتا تھا ———!

اور آخر اس کی انگلیاں ٹٹولتے ٹٹولتے اس صفحہ تک آ پہنچیں جس کا عنوان ۱۹۴۷ء سے شروع ہوتا تھا۔

یہاں آ کر وہ رک گیا اور بکھرے ہوئے نقوش یکجا کرنے لگا۔

ماضی کے جھروکوں سے

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی ایک شام

پاکستان کے قیام کو آج ۱۳ دن ہوئے تھے۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو انگریز نے دو مملکتوں کے قیام کا جو اعلان کیا تھا' اسے عملی جامہ پہنا دیا گیا تھا۔ دولت مشترکہ کی دو آزاد اور خودمختار مملکتیں دنیا کے نقشے پر ابھری تھیں' لیکن ابھی تک دونوں میں سے کوئی مملکت بھی اپنی ملنداری رائج نہیں کر سکی تھی ـــــ الجھن و خلق کا یہ عالم کہ جنگل کے قانون کا سا سماں تھا۔

۴۰ کروڑ آبادی اور ۱۷۷۷۴۳۸ مربع میل رقبے پر پھیلے ہندوستان کی ۵۶۸ ریاستیں' دونوں میں سے کسی ایک مملکت کے ساتھ الحاق کے مراحل سے گزر رہی تھیں۔ کچھ نے فیصلہ کر لیا تھا اور کچھ ابھی سوچ رہی تھیں۔ بعض ریاستوں کا جغرافیائی محل وقوع ایسا تھا کہ ان کے فیصلے محض رسمی حیثیت رکھتے تھے۔ انہی میں سے ریاست جموں و کشمیر بھی تھی جس کی چالیس لاکھ آبادی میں سے پچھتر فیصد مسلمان تھے' لیکن جس کی قسمت کا فیصلہ بدقسمتی سے ایک ہندو ڈوگرہ مہاراجے کو کرنا تھا جو ابھی تک کومگو کے عالم میں تھا۔

اس ریاست کو صرف اسی لیے اہمیت حاصل نہیں تھی کہ یہاں سے جو دریا پھوٹتے تھے' وہ پاکستان سے گزرتے تھے بلکہ اس کی زیادہ اہمیت اس لیے تھی کہ ریاست جموں و کشمیر پاکستان اور بھارت دونوں سے ملحق تھی جب کہ شمال میں اس کے اور روس کے درمیان افغانستان کا علاقہ تھا اور اس کی سرحد چین سے بھی مشترک تھی۔

برصغیر کے مسلمانوں کے کبھی وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس ریاست کا الحاق کوئی نزاعی مسئلہ بن جائے گا کیوں کہ یہاں کی پچھتر فیصد آبادی مسلمان تھی اور بھارت کے ساتھ اس کا کوئی زمینی اور دریائی راستہ بھی نہیں تھا۔۔۔ اس طرح اقتصادی طور پر اس کا بھارت سے کوئی رابطہ ہی نہیں رہ جاتا تھا۔

اس حقیقت کا احساس ان انگریز بازی گروں کو بھی تھا۔۔۔ اس لیے ریڈکلف ایوارڈ

HBC

☆○☆

☆○☆

HBC

HBC

[illegible] میں پہاڑوں کے ساتھ [illegible]
[illegible] کی طرف سے کسی [illegible]
[illegible] کی طرف سے [illegible] کی [illegible] کی اطلاع
[illegible]
[illegible] سے [illegible]
[illegible] سے جن پہاڑوں کو [illegible] تھا وہ [illegible] کے [illegible]
[illegible] میں [illegible] [illegible] نہ آیا تو اس نے
[illegible] وہ [illegible] کی طرف دیکھا
[illegible] ساتھیوں سے [illegible] کہا
[illegible] ایک ساتھی نے [illegible] کوئی
[illegible] کر سکتے ہیں۔ کوئی
[illegible] کی [illegible] میں نہیں
[illegible] ہیں۔ [illegible] اگر کوئی لشکر ان کے تعاقب میں ہے تو انہیں راستے ہی میں
[illegible] پر شکر [illegible] اگر کوئی
[illegible] ہیں۔"

[illegible] کی آواز بھی نہ آئی [illegible] اندھیرے کی چادر میں غائب ہو گیا

☆○☆

[illegible] مسلسل سفر کر رہے تھے۔

[illegible] اور شیرو خاں سے [illegible] اس کا احساس دونوں کو تھا۔ اس
[illegible] روانگی کے وقت شیر محمد کی ماں کا بوجھل ہوا تھا۔ اس کا احساس دونوں کو تھا۔ اس
[illegible] ہے ہماری نے زبان سے [illegible] نہ کیا لیکن جس طرح دل پر پتھر رکھ کر اس نے اپنے بیٹے کو
[illegible] وہ [illegible] تھی۔ اسی طرح ایک روز اس کا شوہر بھی رات کے
[illegible] [illegible] [illegible] [

"میں کہتا ہوں، تم سب اشرف خان سے پہلے جاکے شیر محمد کو تلاش کرو۔"

"جی ہاں، کیا ضمانت ہے کہ اشرف خان ہمیں زندہ چھوڑ دے گا؟ اب وہ لوگ کہاں ہوں گے؟"

"جو آیا ہے تو ابھی تک اس کا کوئی عمل نہیں ہوا۔" شرفو کے منہ سے نکلا۔ "وہ دیکھو!"

اسی اس نے اپنی بات مکمل کی ہی تھی کہ اچانک شرفو کے منہ سے نکلا۔ "وہ دیکھو!"

اس نے اپنے سامنے والی پہاڑی کی ڈھلان سے پہلے پہل سامنے نکلتے ہوئے دیکھ لیے تھے۔ اس سے پہلے کہ شیرو اس سے کچھ دیکھ سکے جس طرف شرفو نے انگلی سے اشارہ کیا تھا۔ انہیں اپنے دائیں بائیں سے اچانک ونڈز اپ ونڈز اپ کی آوازیں سنائی دیں۔ ان کے دائیں اور بائیں اور آگے پیچھے درجن پندرہ کا گھیرا مکمل ہو چکا تھا۔ پانچ چھ مجاہدوں نے ہر کسی کے منہ پر کپڑا باندھے ہوئے تھے۔ انہیں گھیر رکھا تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی رائفل یا پستول نہیں تھا۔ وہ سب ہی کمانیوں سے مسلح تھے۔

"کون ہو تم؟" ان میں سے ایک کی گرجدار آواز سنائی دی۔

"میں حوالدار بلور خان کا بیٹا ہوں اور یہ میرا ساتھی شیر محمد۔ ہم لوگ پونچھ سے شیرہ جا رہے ہیں۔ کیپٹن حسین خان کی کمان میں پہنچا ہے۔" شرفو نے نووارد کو پہچان لیا تھا۔

حوالدار بلور خان کا نام سنتے ہی ان کے عقب سے ایک مجاہد آگے آیا۔ اس نے چاند کی روشنی میں جھک کر اشرف خان کا چہرہ دیکھا۔

"یہ تو حوالدار صاحب کا بیٹا ہے۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ سب دھیمے پڑ گئے۔

☆○☆

علی الصبح کیپٹن حسین خان، شیر محمد اور تین دیگر مجاہدوں کے ساتھ پونچھ کے مدارپور والے پل کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے جھولنے والا یہ پل توڑ کر اس طرف سے ڈوگرہ فوج کی ممکنہ پیش قدمی روکنے کے لیے پیش بندی کرنی تھی۔

ابھی یہ لوگ بیڑہ سے باہر نکلے ہی تھے کہ قریبی دھلت سے کچھ ہندو اور دو تین مسلمان دوڑتے ہوئے ان کی طرف آئے۔ انہوں نے آتے ہی شور بپا کر دیا۔

"پل پر ڈوگرہ فوج کا پورا بریگیڈ اترا ہے۔ اس نے وہاں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا۔" کیپٹن حسین خان ان کی چال میں آ گیا۔ اس نے مدارپور کی طرف جانے کی بجائے وٹ ٹاہلی سب جانا اور اپنے ساتھیوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔

یہ لوگ حاکم بھاگ دوڑ تھا۔ پہلے تو وہاں سے ہتھیار لوٹ کر بالے میں ڈوگرہ فوج کی آمد سے متعلق کیپٹن حسین خان کو اطلاع دی کہ یہ علاقہ خالی ہو چکا ہے۔ وہاں سے ہندوؤں نے اپنے اس لیے پسپائی کی تھی کہ ڈوگرہ فوج کے وہاں پہنچنے تک مجاہدین کوئی کارروائی نہ کریں۔

☆○☆

اب ان کے لیے صرف دو راستے ہی ایک ایسی جگہ رہ گئی تھی جہاں وہ ڈوگرہ دستوں پر گھات لگا سکتے تھے۔ باقاعدہ فوج کو دشت یا سطح مرتفع کی پوزیشن میں لڑائی کرنا ہی موزوں تھا۔ وہ لوگ پیدل مارچ کرتی ہوئی فوج پر تو گھات لگا سکتے تھے لیکن فوجی ترتیب سے آگے بڑھتی ہوئی ڈوگرہ فوج پر لاٹھیوں اور کلہاڑیوں کے ساتھ حملہ کرنا قطعاً ناممکن تھا۔

پہلا معرکہ

۳۰ اگست ۱۹۴۷ء کے تاریخی لمحات:

ڈوگرہ فوج کی ایک کمپنی ہیرہ سے راولاکوٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

——— اور اسی طرح کی ایک دوسری کمپنی کے باغ سے راولاکوٹ کی طرف بڑھنے کی بھی اطلاعات ملیں۔ ان دونوں کمپنیوں کا ملاپ راولاکوٹ پر ہونا تھا جہاں کشمیری مجاہدین جذبۂ جہاد سے سرشار ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور لاٹھیاں پکڑے آزادی کشمیر کے نعرے بلند کر رہے تھے۔

ان کے گرداگرد پھیلی پہاڑیاں پچھلی ڈیڑھ صدی سے ان کے سربفلک ارادوں اور کوہ شکن ولولوں کی گواہی دیتی آ رہی تھیں' لیکن——— آج ان پر جو سرشاری کی کیفیت طاری تھی' چشم فلک نے اس سے پہلے اس کا نظارہ کب کیا تھا۔

دن کے تقریباً" چار بجے کا عمل تھا جب ان لوگوں کو ڈوگرہ فوج کی پلٹن اس طرف آتی دکھائی دی' لیکن توقعات کے بالکل برعکس وہ لوگ مارچ کرتے ہوئے نہیں بلکہ جنگی حالت میں فارمیشن بنا کر آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ سیکشنز سڑک کے دائیں بائیں پہاڑیوں پر پھیل کر پوزیشنیں سنبھال چکی تھیں اور ان کی قائم کردہ "پکٹوں" کے زیر سایہ باقی جوان ایڈوانس کر رہے تھے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ اوپر کی "پکٹوں" کا ایڈوانس ہو رہا تھا اور نیچے سے باقی ماندہ پیدل نفری ان کے زیر سایہ گزر رہی تھی۔ یہ صورت حال خاصی پریشان کن تھی۔ اس کمپنی پر حملہ کرنے کے لیے پہلے "پکٹوں" کو تباہ کرنا ضروری تھا۔ جب کہ مجاہدین کے پاس نہ تو کوئی مشین گن اور نہ اسٹین گن' وہ بے چارے تو لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے گھات لگائے بیٹھے تھے۔

حسین خان دونوں آنکھوں پر ہتھیلیوں کا کٹورا بنائے بڑی بے بسی سے ایڈوانس کرتی فوج کا نظارہ کر رہا تھا۔ اسے صرف ایک فکر پریشان کیے ہوئے تھی "اگر آج کامیاب گھات

HBC

حسین خان اور شیر محمد ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے۔ بچپن کی دوستی
وہ ایک ہی گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔

دونوں کے والدین میں ایک اچھا ہمسایہ تعلق کے علاوہ خاندانی
رشتے داری بھی تھی۔ دونوں سکھوں کے خلاف جنگ میں
ساتھ ساتھ لڑے تھے۔ وہ لوگ ساتھ والی پہاڑی پر آباد
ڈوگروں کی فوج سے نبرد آزما رہے تھے۔ ایک دن
دونوں سے ایک ہی ماں نے جنم لیا تھا۔ ایک روز
کے فاصلے پر رہتے تھے۔ ایک دن
اگر وہ یہاں سے وہاں بھی جانا چاہتا تو ڈھلان
نظروں سے بچ رہنا کسی کھوجے سے کم نہیں تھا۔

حسین خان کو اگر فکر تھی تو اس بات کی شیر محمد کی زندگی کو
اس کی نشانہ بازی پر اسے مکمل اعتماد تھا۔ لیکن اپنی آدھی فوجی زندگی
میدانوں کی بیعت چڑھا دینے والا حسین خان سوچ رہا تھا کہ اس نے شیر محمد کو اپنے ساتھ
آنے کی اجازت دے کر اچھا نہیں کیا۔ مقابلے پر ہمارے کا کوئی منتشر گروہ نہیں تھا۔ مہاراجہ
کشمیر کی تربیت یافتہ فوج تھی۔

حسین خان ایک عجیب سی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اس نے یہ فیصلہ بادل نخواستہ ہی
کیا تھا۔ اگر وہ اسے اجازت نہ دیتا تو کچھ بعید نہیں تھا کہ شیر محمد بھی اس طرف روانہ ہو
جاتا۔ حسین خان اس کے مرحوم والد کا دوست تھا۔ اس نے شیر کے والد کا تکمیل پر تو اس
کے بیٹے میں دیکھ لیا تھا۔ اسی طرح ایک روز وہ دونوں ڈوگرہ فوج سے نبٹنے اکٹھا تھے۔
اس کا دوست سب سے آگے ہونے کی وجہ سے فوراً ہی مرتبہ شہادت سے سرفراز ہو گیا تھا
جب کہ حسین خان کسی نہ کسی طرح بچ کر آ گیا تھا۔

آج اس کے مرحوم دوست کا بیٹا اسی طرح جان ہتھیلی پر رکھے اس کے سامنے موت
کے سفر پر روانہ ہوا تھا، لیکن حسین خان نے دل ہی دل میں قسم کھائی کہ وہ آج اپنے مرحوم
دوست کے بیٹے کو خود سے آگے نہ نکلنے دے گا۔ ایک مخصوص جگہ پہنچ کر اس نے شیر محمد
کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

"میں دائیں طرف سے چکر کاٹ کر سامنے والی پکٹ پر پیچھے سے حملہ کروں گا۔ تم
دوسری پکٹ والوں کو نشانے پر رکھنا۔" اس کا جواب سنے بغیر حسین خان نے "اللہ بیلی" کہا
اور تیزی سے دائیں طرف رینگ گیا۔

[illegible] اس کی ٹوپی اس کے سر سے گزر کر ہوا میں اڑ گئی۔ وہ اس کی طرف
[illegible] اس نے اپنے کندھوں پر [illegible] سے نکلتے دیکھا۔
[illegible] اس نے شدید غصے سے نتھنے بھینچ کر الٹی چھ
[illegible] مرکزی کمانڈر کی دائیں اور بائیں جانب بھی یہی تھی۔ وہ انتہائی آدمی کے ساتھ کافی
[illegible] اس ہولناک منظر کو [illegible] پر رکھ کر آیا تھا۔ لیکن اپنے نئے ساتھیوں
[illegible] انہیں علم تھا کہ آج پہلی [illegible] کی بار سونا پڑا۔
[illegible] اس ہولناک منظر کو [illegible] سے پہلے انہیں کئی بار سونا پڑا۔
[illegible] اور تو وہ پہاڑی سلامت بھی آ گئی جب کمانڈر کے پستول نے شعلہ اگلا اور اچھلتی
کرنل اوگرہ فوج کا ایک جوان اٹھ کر بڑے بھائی کے بعد دیگرے پانچ مزید اوگرے
[illegible] ان کے ساتھ ہی مجاہدین آزادی کے فلک شگاف نعروں سے غنا دل
اٹھے۔

اوگرہ فوج کو اس کمک کی اطلاع تو تھی، اسی لیے وہ جنگی فارمیشن میں آگے بڑھ رہے
تھے۔ لیکن ابھی تک انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ حملہ آور کس مقام پر حملہ کرنے والے
ہیں۔ مجاہدین نے پیدل فوج پر بڑے بڑے پتھر لڑھکانے شروع کر دیئے جو انہوں نے پہلے
ہی سے تیار کر رکھے تھے۔ ان کے ولولہ انگیز نعروں اور پتھروں کی بوچھاڑ نے ایک مرتبہ تو
اوگرہ فوج کے قدم اکھاڑ دیئے۔

ہراول دستے کے پیدل جوان جو آگے آگے چل رہے تھے، پہلے ہی حملے میں ڈھیر ہو
گئے۔ لیکن دن کی روشنی ہونے کی وجہ سے "پکٹوں" نے مجاہدین کی پوزیشن نوٹ کر لی
تھی ـــــ انہوں نے اپنی مشین گنوں کا رخ اس طرف موڑ دیا۔

مجاہدین کے ہاتھ فوراً رک گئے اور وہ اس ناگہانی آفت کے لیے پہلے سے تیار کردہ
محفوظ آڑوں میں جا چھپے ـــــ انہوں نے پچھلے دو دنوں میں بڑے بڑے پتھروں کو اس
ترتیب سے اپنے گرداگرد پھیلا رکھا تھا کہ انہیں ایک طرح سے بنکروں کی حیثیت حاصل ہو
گئی تھی۔ وہ لوگ ان بنکروں میں سر دیئے دشمن کی فائرنگ سے کافی حد تک محفوظ تو ہو
گئے ـــــ مگر بے بسی سے دشمن کی اندھا دھند فائرنگ کے دھماکے سن رہے تھے۔

☆○☆

HBO

HBC

اس نے شیرو کو وہیں رہنے کو کہا اور خود بندوق کی نال پکڑ کر ریوالور کی طرف لپکا۔ شیرو نے اسے روکنا چاہا لیکن ۔۔۔۔ اسی لمحے ۔۔۔ اس کے ہاتھوں سے تاریکی اور
کے گھر کے پاس گولی ۔۔۔ وہ گھبرا کر ۔۔۔ اور وہ ۔۔۔ کے لیے ۔۔۔ ہوش اس وقت تک جب پیارا
ہمیشہ ۔۔۔ کے لیے شیرو کے سامنے ۔۔۔ کی دیوار سے ٹکرانیں
ایک لمحے کے لیے شیرو کے سامنے ۔۔۔ کی تاریکی چھا گئی۔ پھر اس کی نظر اپنے دوست اشرف پر پڑی۔ وہ
بہادر گاؤں سے تھی۔ اس نے کچھ سوچا پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر
لے کے لیے اس نے بڑے مضبوط لہجے میں اپنے جگری یار کو مخاطب کیا۔ "تم واپس جاؤ
"شیرو!" اس کی طرف چلے ہوئے ۔۔۔ ملاقات نادل ہوتے ہی ٹوٹ آئے
میں واپس دوڑتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے چاہا کہ آگے بڑھ جائے' لیکن شیرو نے اس کا
ہاتھ تھام لیا۔

"نہیں شیرو! نہیں۔ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے قریباً شیرو کو اپنی
طرف گھسیٹ
شیرو نے جھٹکا دے کر اسے خود سے الگ کیا۔ "طاقت ور ہونا مجھ سے' اسی لیے اپنا
تم مجھ پر خوش رہے ہو۔" میزک کے طالب علم نے چاہا کہ جذباتی فضا پیدا کر کے شیرو کو
اس ارادے سے باز رکھے۔
شیرو نے ایک لمحے کو رک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے عقب میں گولی چلنے کی آواز
نے دونوں کو چونکا دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے دوست کے ماتھے کا بوسہ لیا "اللہ بیلی"
کہہ کر اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔
اشرف خان اس کے پیچھے "شیرو شیرو" ہی چلاتا رہ گیا اور اس کا جگری یار' اس کا بڑا
بھائی اسے ایک لمبے عرصے کے لیے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا اور وہ بے بسی سے ہاتھ ملتا رہ گیا۔
۔۔۔ اسے ایک ساتھ کئی رائفلیں فائر ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر یکے بعد دیگرے
ان نے چار پانچ فائر پستول کے بھی سنے۔ بادل نخواستہ وہ اپنے دوست سے الگ ہو کر پلٹنے
کو
بڑا عارضی فائر ۔۔۔ یہیں رہا تو اس کا دوست کبھی اکیلا واپس نہیں جائے گا۔ اس نے

لکڑیوں کی آڑ میں بیٹھ کر فریقوں کو اس سمت اپنی واپسی کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ یہ فاصلہ ان لوگوں کے
پاس رائفلیں تھیں اور شکار میں وہ جانباز ساتھی سے کم نہیں تھے۔
وہ سمجھ گیا کہ مقابلہ فضول ہے۔ جان بچا کر وہ لوگ اسے گھیر کر گرفتار کر لیں گے یا مار ڈالیں
گے۔ وہ اس پستول سے ان لوگوں کا کچھ بگاڑ سکتا تھا۔ نہ ہی رائفلیں کہ وہ بہادر مقابلہ اور تو
میں تھے۔ لیکن ایک کام وہ ضرور کر سکتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو متحد و متحرک
الجھائے رکھے۔ اس طرح اس کے دوست کو ۔۔۔ فاصلہ طے ہو جائے گا۔ وہ بچ نکلنے کا چانس
اسے علم تھا کہ یہاں سے صراف مار بانی میل اور صراف بند چالیس میل میں پھیلے ہوئے
ہیں ۔۔۔ اور اگر کسی طرح اس کا دوست وہاں تک پہنچ جاتا تو وہ محفوظ ہو جاتے۔
اسی خیال کے پیش نظر اس نے انداز سے سامنے کی سمت چار فائر داغے اور گھٹنے کے بل بیٹھ گیا
دیئے تھے۔ اس کا فائدہ شرفو کو فوراً پہنچا۔ باگروں کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ
تھی کہ یہ لوگ مسلح ہوں گے۔ ان کی اطلاعات کے مطابق تو پورے پونچھ شہر میں ایک بھی
مجاہد کے پاس رائفل یا پستول نہیں تھا' جب سامنے سے گولیاں آئیں تو وہ رکنے پر مجبور ہو
گئے۔
انہیں احساس تھا کہ پہاڑیوں کا فائدہ دونوں فریقوں کو یکساں حاصل ہے۔ شیرو کے آر
میں ہونے کی وجہ سے جب تک وہ اسے گھیر کر گرفتار کرتے' وہ ان کے دو تین ساتھیوں کو
چاٹ جاتا۔ میجر رام سنگھ نے بڑی سختی سے انہیں ہدایت کی تھی "وہ تخریب کاروں کو زندہ
گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کریں۔"
میجر رام سنگھ کو مہاراجہ نے خاص طور سے اس علاقے میں تازہ دم فوج اور بے شمار
اسلحے کے ساتھ سدھنوں کی سرکوبی کو بھیجا تھا۔
۔۔۔ مقامی غداروں کا ایک ٹولہ گھر کے بھیدیوں کی شکل میں پہلے ہی یہاں موجود تھا جو
سرکاری حکام کو خبریں پہنچا رہا تھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے ان کا کام خاصا آسان ہو گیا تھا۔
ورنہ حریت پسندوں کا مقامی نظام جاسوسی اتنا بھرپور اور مکمل تھا کہ ان میں سے کسی کو گرفتار
کرنا مہاراجہ کے تنخواہ دار سپاہیوں کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔

☆○☆

شیر محمد کے پاس بمشکل پچیس تیس راؤنڈ باقی بچے تھے جو اس نے پوزیشن بدل بدل کر
اس طرح فائر کیے کہ دشمن تعداد کے دھوکے کا شکار ہو جائے۔ وہ کبھی باقاعدہ فوجی تو رہا
نہیں تھا' لیکن حوالدار کی محض چند ماہ کی جان توڑ محنت نے اس میں ایک کہنہ مشق کی سی

شیرو

شیرو کو ہوش آیا تو وہ قیدیوں کی مخصوص بیرک میں تھا۔ [illegible] اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

شیرو کو اپنے ماضی میں لڑائیاں لڑنے کا اتنا تجربہ تھا کہ وہ سمجھ گیا کہ اس کے ساتھی اس کی مدد کو آ رہے ہیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور وہ ٹاٹ کے ایک ٹکڑے پر پڑا تھا۔ اس کی پشت کی طرف روشندان سے دھوپ کا ایک چوکور ٹکڑا فرش پر پڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ کوٹھڑی میں کوئی روشنی نہیں تھی۔ ایک موٹی سلاخوں والا دروازہ بند کیا گیا تھا۔ روشنی کی کرنیں کوٹھڑی میں آ رہی تھیں جو اس بات کا اعلان تھا کہ صبح ہو گئی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کل رات سے اب تک بے ہوش رہا ہے۔

اس نے چاہا کہ اٹھ کر بیٹھ جائے، لیکن جیسے ہی اس نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانا چاہا، ایک کراہ اس کے ہونٹوں سے پھسل گئی اور وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ پسلیوں میں گھٹنے والی ٹھوکروں نے اس کا جسم دکھتا ہوا پھوڑا بنا دیا تھا۔

آخر کسی نہ کسی طرح وہ دیوار کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس سے ٹیک لگا لی۔ ابھی تک کوئی سنتری وہاں نہیں آیا تھا۔ اس کے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ بمشکل اس نے تھوک نگلا اور اسی سوچ میں تھا کہ کسی کو آواز دے کر پانی طلب کرے یا خاموش رہے کہ اسے قدموں کی چاپ سنائی دی ——— اس کی آنکھیں سلاخوں پر جم گئیں۔

آنے والا کوئی مسلمان سپاہی تھا۔ اس نے شیرو کو ہوش میں آتے دیکھا تو سلاخوں والے دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑی عجیب سی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ شیرو اندازہ نہ کر سکا کہ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے ہمدردی ہے یا نفرت۔ اسے شیرو پر رحم آ رہا ہے یا غصہ۔ بس وہ چپ چاپ ٹکٹکی باندھے اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

اس کا دل چاہا کہ اس سے پانی مانگ لے، لیکن اس کی غیرت نے دشمن کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے احتراز برتا۔ کوارد نے جب دیکھا کہ وہ کچھ بولتا ہی نہیں تو اس

[illegible] شیرو کو اپنی آواز اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔ [illegible]

[illegible] کیسے لے جاتے تھے؟" وہ اس غضب سے [illegible]

[illegible] معلوم ہوتا ہے صلاح کی۔ آپ ادھر ایک طرف ہٹ جائیں میں دیکھتا ہوں

اسے [illegible] ایک اور سپاہی نے اپنے لہجہ [illegible] اس نے [illegible]

اس نے داہنی ایک طرف رکھی اور دونوں ہاتھوں سے [illegible] اس نے [illegible]

[illegible] لیکن [illegible] لے کر تو اس [illegible] شیرو نے [illegible] ہاتھوں کی [illegible]

لگا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ شیرو نے کروٹ لی۔ ہاتھوں کی [illegible]

اس کی آنکھیں اس نے سپاہی کے چہرے پر جمائیں اور اس نے [illegible]

شیرو کی پسلیوں میں [illegible] لیکن وہ ابھی تین چار [illegible]

شیرو نے [illegible] ہوئے اپنی [illegible] اس کی طرف [illegible]

ہوئے کوارد کے پیٹ میں اتنی زور سے لگی کہ وہ اپنی جگہ [illegible]

اس کی اس حالت پر اس کے ساتھیوں نے ایک زوردار قہقہہ [illegible]

دماغ گھوم گیا۔ اس نے دانت بھینچ کر اپنی [illegible] اور [illegible]

کے پیٹ میں مارنا چاہی کہ اچانک ایک گونجدار آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

اس کا کمانڈنگ افسر ایک طرف سے اچانک نمودار ہوا تھا۔ وہ ان سب کو گھور گھور کر

کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "اسے چوکی لے چلو۔" اس نے اپنے جوانوں کو

ہونٹ چباتے ہوئے حکم دیا اور جس طرف سے آیا تھا اسی طرف لوٹ گیا۔

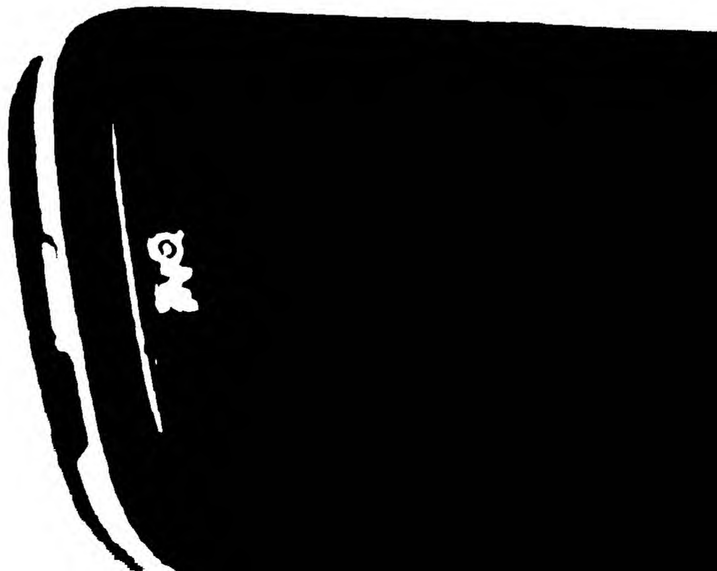

HBC

اب وہ رومال ہاتھ میں پکڑے واپس جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس بات پر مسرت تھا کہ وہ صنوبر کی رہائی کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کامیابی حاصل کر کے واپس جا رہا ہے۔ اس کے ساتھی سپاہی بھی اس کے ساتھ تھے۔ پھر انسپکٹر میر نے انہیں کچھ کہا کہ وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ انسپکٹر میر اکیلا تھا۔ وہ اس کے ساتھ سوں کیڑوں میں سے ہوتا ایک کوٹھری نما کمرے کی طرف بڑھا جس کے دروازے پر ایک بڑی سی قفل لگا ہوا تھا۔ وہ کسی بڑی کوٹھی کی بیرونی عمارت تھی۔

میجر رام سنگھ نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ کہنے کا اشارہ کر رہا ہو۔ شیرو اس کا کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میجر رام سنگھ کی آنکھوں میں کاز دیں۔ ایک ہی سلاخ تھی اسے یوں گھما کر دیکھیے۔ صنوبر وقت زندگی میں رام سنگھ کے پہلی مرتبہ آیا تھا۔ اگر دونوں کے درمیان سلاخیں حائل نہ ہوتیں تو وہ شیرو کی آنکھیں نکال لیتا۔

اس کے چہرے سے چھلکتے غیظ و غضب کو انسپکٹر میر نے محسوس کر لیا تھا۔ وہ شدید مضطرب ہونے پر کچھ زیادہ ہی باز تھا۔ وہ آگ بجھا اور منہ میں آئی ہوئی تمام گالیاں اسے دے کر شیرو کو حکم دیا کہ وہ میجر سے نظریں جھکا کر بات کرے۔

"میں تمہاری طرح نہ تو غلام کشمیر کا کوئی بے غیرت نقطہ ہوں نہ ہی صدر لجہ کا نمکخوار دار کتا۔" شیرو نے غصے سے کھولتے ہوئے اسے جواب دیا۔

انسپکٹر میر نے اسے جواب میں بے شمار مغلظات سے نوازا اور اپنے سنتریوں کو اسے باندھ کر لانے کا حکم دے کر غصے میں کھولتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جو کشمیری حریت پسندوں کے لیے خاص طور سے تیار کیا گیا تھا۔

میجر رام سنگھ اس کے ساتھ قدم ملا کر چلا آ رہا تھا۔ دونوں اس کمرے میں پہنچنے تک شیرو کو گالیاں بکتے آئے تھے۔ وہ اس کی بوٹیاں نوچ لینے پر تلے ہوئے تھے۔

کمرے میں پہنچنے تک ایک شیطانی منصوبہ میجر رام سنگھ کے ذہن میں آ چکا تھا اور ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ناچنے لگی تھی۔ انسپکٹر میر اس کے موڈ کی اچانک تبدیلی پر حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆○☆

شیرو کے ہاتھ ہتھکڑی سے باندھ کر اسے گھسیٹتے ہوئے وہ لوگ میجر رام سنگھ کے سامنے لائے تھے کیوں کہ اس نے اپنے قدموں پر چل کر آنے سے انکار کر دیا تھا۔ کمرے میں ... اس پر وحشیوں کی طرح ... انسپکٹر میر بیقراری کا کچھ زیادہ ...

وہ ... سے گزرتا ہوا ... پیچھے ہٹتے ہٹتے شیرو اس نے ... محسوس کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ واپس مڑا اور سنتری سے کہا۔

"مجھے پانی کی ضرورت ہے۔" اس نے اپنے منہ دروازے کی سلاخوں سے لگا دیا۔

دوسرے لمحے شیرو نے اس کے بولنے پر چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر لینے کے بعد گردن جھکا لی۔ اس کے اس عمل پر سنتری کو دکھ سا ہوا۔ اگلے لمحے شیرو نے اسے جواب دینے کے قابل ہی نہیں رکھا تھا۔ کسی بے رحم سے جذبے کے تحت اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا وہی سوال دہرایا۔ اس مرتبہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں بے اختیار التجا در آئی۔

"اگر پانی نہ ملے تو ——"

——اسے فوراً شدید پیاس کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے غرارہ لوٹا بھر کر دور سنتری کوئی بات کہے بغیر وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ اس کی واپسی بہت جلد ہی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ میں پیتل کا لوٹا پکڑا ہوا تھا جو پانی سے بھرا تھا۔ اس نے شیرو کو زنجیر کھولنے کا اشارہ کیا اور لوٹا دروازے کی سلاخوں سے لگا دیا۔ شیرو اپنے جسم سے بندھا ہوا تھا۔ جسم سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے جھک کر اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹتا ہوا دروازے کے نزدیک ہو گیا۔ سنتری نیچے بیٹھ کر دھار کی شکل میں پانی گرا رہا تھا۔ شیرو نے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر بمشکل دو گھونٹ پانی حلق میں اتارا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا گلا بند ہو چکا تھا اور اب دو گھونٹ پانی اندر جانے سے کچھ نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک بات کہ اس کا حلق دکھنے لگا تھا۔ تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس نے تھوڑا سا منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اسے کچھ سکون ملا۔

"بھی تمہاری عمر کیا ہے۔ کم از کم اپنی اکیلی ماں کا ہی خیال کیا ہوتا۔" سنتری نے پیالہ اٹھاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

شیرو نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس نے شیرو کو کوئی گالی دی ہو۔ اس کی آنکھوں کا رنگ اور چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو سنتری نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ اسے افسوس سا ہوا کہ اس نے شیر محمد سدھن سے ایسی بات کیوں کہہ دی۔

"تمہارا جنم کسی میری ماں جیسی کشمیر کی ماں کے بطن سے ہوا ہوتا تب تم ایسی بات کبھی نہ کہتے۔" شیرو کے جواب نے سنتری کو اپنی جگہ منجمد کر کے رکھ دیا۔

مظاہرہ کر رہا تھا اگر رام سنگھ شیرو کو دو گالیاں دیتا تو انسپکٹر میر اسے دس گالیاں دیتا۔ اگر رام سنگھ اسے ایک ٹھوکر مارتا تو وہ اسے چار ٹھوکریں رسید کرتا۔

رات سے وہ بھوکا پیاسا یہ اذیت برداشت کر رہا تھا۔ جلد ہی وہ ادھ موا ہو کر گر پڑا اس پر بے ہوشی طاری تھی۔

"لے جاؤ اسے۔ کہیں کمبخت مر ہی نہ جائے۔ اس سے ہمیں بہت کچھ اگلوانا ہے۔" اسے کھانا کھلاؤ۔ میں شام کے بعد آؤں گا۔" اس نے اپنی سنتریوں کو حکم دیا جو اسے سنبھال لائے تھے اور وہ لوگ شیرو کو ڈنڈا ڈولی کرتے واپس لے گئے۔

بڑا ذہین معلوم ہوتا ہے کمبخت۔" انسپکٹر میر نے اپنی پگڑی سر پر جماتے ہوئے میجر رام سنگھ سے کہا۔

جواب میں رام سنگھ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "میر صاحب! یہ طوطے کی طرح ٹیں ٹیں کرے گا۔ میرے ذہن میں ایک علاج آیا ہے اس کا۔ میرے آدمی کام کر رہے ہیں جیسے ہی مجھے مطلوبہ اطلاع مل گئی' پھر دیکھنا میرے ہاتھ۔ ایسے مجاہدین تو میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔" اس نے خاصے طنز سے کہا۔

شیرو کو ہوش آیا تو وہی سنتری اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کا رواں رواں فریادی تھا' لیکن اس نے اب اس اذیت کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ اب اسے صرف ایک ہی فکر پریشان کر رہی تھی کہ اس کی ماں اور اس کا دوست شرفو کس حال میں ہیں؟

اسے ہوش میں آتے دیکھ کر وہی سنتری ایک طرف چل دیا۔ اس کی واپسی دو آدمیوں کے ساتھ ہوئی جو اس کے لیے کھانا اور قہوہ لیے چلے آ رہے تھے۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ لے جاؤ۔ غداروں! بے شرمو!" اس نے آنے والوں کو دیکھتے ہی جوش غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا۔

"یہاں رکھ دو اور چلے جاؤ۔" اسی سنتری نے آنے والوں سے کہا۔

وہ لوگ سامان خور و نوش وہیں رکھ کر چلے گئے۔ اب وہاں سنتری اور اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ سنتری نے اسے اپنی طرف مخاطب کیا اور شیرو نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

"میرا نام جلال ہے بیٹا۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں شیرو کو مخاطب کیا۔ "اگر میری زبان پر اعتماد کر سکتے ہو تو جان لو کہ میں تمہارا ساتھی ہوں۔"

شیرو نے اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس نے کوئی بڑی عجیب سی بات کہہ

دی۔

"ٹھیک ہے تمہاری زبان پر اعتبار کرنے میں تمہاری کچھ چیزیں ہاتھوں میں آ کر اپنے کسی ٹھکانے کا انکشاف کر دوں اور تمہیں مہاراج کی خدمت کرنے کا ایک سنہری موقع مل جائے۔" شیرو نے بڑے طنزیہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"تم اس وقت جو بھی چاہے کہہ لو بیٹا مگر ایک بات یاد رکھو۔ وقت بہت کم ہے۔ اگر ہم دونوں ایک دوسرے سے اس کی وفاداری کا ثبوت ہی مانگتے رہے تو ممکن ہے رام سنگھ اپنے گھناؤنے منصوبے پر عمل کر گزرے۔ فی الوقت صرف کھانا کھا لو جو تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ باقی باتیں شام کو ہوں گی۔ میری ڈیوٹی اب ختم ہونے والی ہے۔ کسی نہ کسی طرح آج کا کشٹ بھی کاٹ لو' کل قدرت یقیناً کوئی بہتر سبب پیدا کر دے گی۔" شیرو نے کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ سجاول نے اس کی توجہ اس سمت آتے قدموں کی آواز کی طرف مبذول کر کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسے گالیاں دے دے کر کھانا کھانے کا حکم دینے لگا۔

☆○☆

میجر رام سنگھ بڑی بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اسے کسی کی آمد کا انتظار تھا۔ بالآخر وہ آ ہی گیا۔ ایک کشمیری پنڈت اس کے سامنے ہاتھ جوڑے اسے نمسکار کر رہا تھا۔

"ہاں لالہ جی؟" میجر رام نے بے چینی سے پوچھا۔

"مہاراج جی! اس کا تو کوئی نام و نشان نظر نہیں آتا۔" پنڈت ہکلایا۔

"کیا مطلب؟" رام سنگھ کو اچانک جھٹکا لگا۔

"میں نے ایک ایک گھر پر اپنے مخبر لگا رکھے ہیں مائی باپ لیکن وہ بڑھیا تو یوں غائب ہوئی جیسے اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔"

"پنڈت مہاویر پرشاد!" میجر رام سنگھ نے اسے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ "نہ تو میں دودھ پیتا بچہ ہوں نہ تم۔ دماغ کو حاضر رکھ کر بات کرو پنڈت جی۔ پونچھ کوئی اکھوں کی آبادی کا شہر نہیں کہ یہاں سے کسی کے غائب ہونے کا پتہ نہ چلے۔ مجھے شیرو کی ماں آج شام تک ہر صورت میں چاہیے ورنہ....." اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"میں اپنی مقدور بھر کوشش کر رہا ہوں مائی باپ۔ آپ دھیرج رکھئے۔ جائے گی کہاں؟" پنڈت نے بڑی مکاری سے دانت نکالے' لیکن اس کا چہرہ یک دم سنجیدہ ہو گیا جب رام

سنگھ نے اچانک اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے تمہاری باتیں نہیں' شیرو کی ماں چاہیے۔ اسے کہیں سے بھی پیدا کرو' کہیں سے بھی۔ دفع ہو جاؤ۔"

"جاتا ہوں مہاراج' جاتا ہوں۔ ورگائی' ہے ورگائی۔"

اور پنڈت مہاویر پرشاد باہر نکل آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مقتل کے اندھے میجر کو کیسے سمجھائے کہ شیرو کی گرفتاری کے فوراً بعد ہی اس کی ماں گھر سے غائب ہو گئی تھی۔ شاید اس نے اپنے انجام کا اندازہ لگا لیا ہو گا یا اسے حسین خان کے آدمیوں نے یہاں سے کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دیا ہو۔

پنڈت مہاویر پرشاد کے باہر جاتے ہی میجر رام سنگھ نے میز پر رکھی گھنٹی پر ہاتھ مارا اور ایک سنتری اندر داخل ہوا۔

"لے آؤ اسے۔" اس نے سنتری کے ایڑیاں بجاتے ہی حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنے شیر محمد اس کے سامنے موجود تھا۔ میجر رام سنگھ اس کی ماں کو ترپ کا پتہ بنانا چاہتا تھا' لیکن اس کی پراسرار گمشدگی نے اس کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ اب وہ اپنی تمام ناکامیوں کا بدلہ اسی سے لینا چاہتا تھا۔

اس کے اشارے پر ایک سپاہی نے ہتھکڑی کا دوسرا سرا وہاں دیوار ہی میں گڑی ایک مضبوط سلاخ میں پھنسا کر تالا لگا دیا۔

"حسین خان کہاں ہے؟" اس نے بید ہاتھ میں پکڑے اسے سرد آنکھوں سے گھورا۔

"تمہارے سامنے کھڑا ہے۔" شیر محمد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تم لوگ اس طرح نہیں ماننے والے۔" رام سنگھ نے اپنے دانت پیسے۔

"یہاں کا ہر آزادی پسند حسین خان ہے۔ تم کس حسین خان کی بات کر رہے ہو؟" شیرو نے اس کا تمسخر اڑایا۔ اس کو اپنی بات کا جواب بازو پر پڑنے والے زوردار بید کی شکل میں ملا جو سنسناتا ہوا اس کے گوشت میں اتر گیا تھا۔

"کہاں ہے حسین خان——؟" رام سنگھ جوش غیظ و غضب میں چلاتے ہوئے اس پر بید برسانے لگا۔

[illegible] غضب شیرو کو اپنی ہڈیوں میں گھستی محسوس ہو رہی تھی' لیکن اس نے اذیت [illegible] جائے فریاد کناں ہونے کے رام سنگھ کو گالیاں دینے لگا۔ اس کی ہر [illegible] اضافہ کر رہی تھی۔ وہ اس کو مارتے مارتے اب بے بس

[illegible] کی طرح ہانپنے لگا تھا۔ اس کے بازو شل ہو گئے تھے۔ شیرو [illegible] چیخے چلا رہے تھے۔ اس کے قریباً سارے جسم سے خون بہہ [illegible] رام سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔

رام سنگھ بید پھینک کر ایک آرام کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ [illegible] وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

"بس بزدل!" شیرو کی آواز میں رتی بھر کمزوری نہیں تھی۔

جواب میں رام سنگھ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے گھنٹی پر ہاتھ مارا اور اندر آنے والے سنتری کو کچھ اشارہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے دو لاٹھی بردار سنتری وہاں موجود تھے۔

"مارو اسے!" رام سنگھ نے ہانپتے ہانپتے اس کی طرف اشارہ کیا۔

جواب میں شیر محمد کا زوردار قہقہہ اسے پاگل ہی تو کر گیا۔ اس نے چاہا کہ وہ بھی اٹھ کر لاٹھی بردار اسے روئی کی طرح دھنک رہے تھے—— آدھ گھنٹے تک اذیت برداشت کرنے کے بعد وہ بالآخر بے ہوش ہو گیا۔

اس کے بے ہوش جسم کو پاؤں کی ٹھوکریں مار کر میجر رام سنگھ نے حکم دیا: "اسے اس کی کوٹھڑی میں پھینک آؤ۔" اس نے بڑے بڑے مجرموں کے کس بل نکال دیئے تھے۔ کشمیر بھر کے انٹروگیشن سینٹرز میں وہ قصائی کے نام سے پہچانا جاتا تھا' لیکن اس ۲۰ سال کے نوجوان کشمیری نے اسے ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔

شام کے بعد پنڈت مہاویر پرشاد پھر اس کے سامنے حاضر ہوا۔ پنڈت پچھلے دس سال سے سرکاری مخبر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا اور قبل اس کے کہ میجر رام سنگھ اس سے کچھ دریافت کرے' نہایت مکاری سے ایک آنکھ دباتے ہوئے اس نے رام سنگھ کو مخاطب کیا: "مہاراج بڑھیا تو نہیں ملی' ایک اور شے ہاتھ آئی ہے۔ مائی باپ شیرو تو کیا اس کے باپ کی قبر سے اس کی ہڈیاں بھی بولنے لگیں گی۔"

"کیا؟ کون ہے وہ؟" رام سنگھ نے بڑی بے چینی سے پہلو بدلا۔

"زہراں!" پنڈت نے بڑی بے شرمی سے آنکھ اور ہاتھ کا اشارہ کیا۔

"لیکن اس کا تو....." رام سنگھ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ وہ پنڈت مہاویر پرشاد کی رگ رگ سے واقف تھا۔

☆○☆

تقسیم ہند سے چند ہفتے پہلے جب قائداعظمؒ دلی میں قیام فرما تھے' ایک وفد نے ان سے ملاقات کی۔ اس وفد میں موجود بیشتر لوگ مسلم لیگ سے متعلق تھے' لیکن ان میں ایک مسلمان فوجی افسر بھی شامل تھا جو "آرمڈ فورسز پارٹیشن سب کمیٹی" کا ممبر ہونے کی وجہ سے کچھ خدشات کی تہہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے قائداعظمؒ کو بتایا کہ مہاراجہ کشمیر پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے سے گریز برت رہا ہے۔ اس نے اس خدشے کا اظہار بھی کیا کہ آزادی ہند کی تحریک کا ہیرو شیخ محمد عبداللہ جو تصور پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش رہا ہے' دراصل مہاراجہ کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔

قائداعظمؒ نے اس مستقبل کے جرنیل (طارق) کو تشفی دی اور فرمایا کہ دو افراد کا فیصلہ کبھی ساری قوم کا فیصلہ نہیں کہلاتا۔ نظریہ پاکستان کشمیری مسلمانوں کے دل میں بھی گھر کر چکا ہے۔ شیخ عبداللہ کی مخالفت کے باوجود کشمیری غیور مسلمان پاکستان سے الحاق کے حق میں ووٹ ڈالیں گے۔

لیکن ستمبر ۱۹۴۷ء ہی میں مری پہنچنے والے کشمیری مہاجرین کی تباہ حالی چلا چلا کر اس جرنیل کے خدشات کی تصدیق کر رہی تھی۔ ان لوگوں کی زبانی علم ہوا کہ مہاراجہ کی ستم رانیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہیں۔ اس کی فوج اور مسلح غیر مسلموں نے کشمیری مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ وہ لوگ بے دریغ قتل عام اور لوٹ مار میں جتے ہوئے ہیں تاکہ مسلمان گھبرا کر ریاست سے بھاگ جائیں اور انہیں اپنے گھناؤنے مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہو رہی ہے۔

یہ بڑی سنگین اور روح فرسا خبر تھی۔ حکومت اس سے آنکھیں بند نہیں کر سکتی تھی۔ نہ صرف کشمیری مسلمانوں بلکہ نوزائیدہ مملکت پاکستان کے تحفظ کا تقاضا بھی یہی تھا کہ کشمیر کو بھارت کی جھولی میں نہ گرنے دیا جائے۔ ہر ذی شعور یہ محسوس کر سکتا تھا کہ اگر بھارتی افواج نے کشمیر کی سرحدوں پر ڈیرے ڈال دیئے تو راولپنڈی سے لاہور تک ۱۸۰ میل لمبی سرحد ان کے براہ راست حملوں کی زد میں آ کر بالکل غیر محفوظ ہو جائے گی۔ اس رابطہ لائن کے دفاع کے لیے فوج کا ایک بڑا حصہ مختص ہو جاتا اور لاہور فرنٹ کمزور پڑ جاتا۔ جس کے معنی یہ تھے کہ بھارت کے لیے ہماری رابطہ لائن توڑ کر لاہور' سیالکوٹ' جہلم اور گجرات کو پاکستانی افواج سے خالی کرا کے راولپنڈی سے کاٹ دینا چنداں مشکل نہ رہتا۔

مری سے وہ سرحد صرف ۴۰ میل دور تھے' لیکن کشمیر میں بھارتی فوج کے آ جانے سے وہ سرحد پاکستان کی پیٹ میں چبھ جاتے۔ امن اور جنگ دونوں صورتوں میں یہ حالات ہمارے سر

کے لٹکتی تلوار بن کر لٹک رہتے تھے۔

وادی کی زراعت کا دارومدار بھی ان دریاؤں پر تھا جو کشمیر سے نکلتے تھے۔ مزید برآں سرحد کے صرف ایک میل اندر اور منگلا ہیڈورکس کشمیر میں واقع تھے۔ دوسری طرف خود کشمیر کی اقتصادیات بھی پاکستان سے وابستہ تھی۔ کوہالہ' مظفرآباد کی تجارتی شاہراہ کشمیر کی واحد شاہراہ تھی جو سارا سال کھلی رہتی تھی اور یہ مظفرآباد سے کوہالہ کے راستے پاکستان میں داخل ہوتی تھی۔ دیودار اور چیل کی لکڑی جو ریاست کی آمدن کا سب سے بڑا ذریعہ تھی' دریائے جہلم کے راستے پاکستان میں داخل ہوتی تھی۔

یہ ثبوت تھے اس بات کے کہ کشمیر کا پاکستان سے الحاق صرف "خواہش" نہیں بلکہ ایک لازمی ضرورت اور پاکستان کی سالمیت کا بھرپور تقاضا بھی ہے۔ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت پاکستان سے الحاق کی حامی تھی۔ ان پاکستان دوست کشمیریوں کو جب جبراً بے گھر اور بے وطن کیا جانے لگا اور کشمیر سے بھارت کے "جبری الحاق" کی راہیں استوار ہونے لگیں تو درد مند پاکستانیوں کے دل دہل گئے۔

☆○☆

کشمیر میں جنگ آزادی اور مہاراجہ سے نجات کا جو شعلہ بھڑکا تھا' اس کی تپش کو قائم رکھنا ازحد ضروری تھا۔ وقت کا تقاضا تھا کہ پاکستانی افواج آگے بڑھیں اور اپنا جائز اور پیشگی حق حاصل کر کے رہیں' لیکن قباحت یہ تھی کہ پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف انگریز تھا اور کافی اعلیٰ افسران بھی انگریز ہی تھے' جن سے کسی مدد کی توقع دیوانے کا خواب تھی۔

اس سلسلے میں پاکستانی افواج کے جو محب وطن افسران جان ہتھیلی پر رکھ کر ملک کی حفاظت اور کشمیر کی آزادی کے لیے قتل کیے گئے تھے' ان کی کمانڈر اسی "فورسز پارٹیشن کمیٹی" کے ممبر کے حصے میں آئی' جس نے تقسیم ملک سے پہلے ہی قائداعظمؒ کو اس خدشے سے آگاہ کر دیا تھا اور یہ تھے سابق میجر جنرل اکبر خان جو بعد میں طارق بن زیادؒ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کشمیر کی جنگ آزادی میں جنرل طارق کے نام سے مشہور ہوئے۔

مسلم لیگ کے سرکردہ رکن اور قائداعظمؒ کے معتمد ساتھی میاں افتخار الدین مرحوم کو قائداعظمؒ نے کشمیری رہنماؤں سے مل کر جنگ آزادی سے پیدا شدہ صورت حال اور اس کو جانے والی ممکنہ امداد کے لیے جائزہ لینے سری نگر روانہ فرمایا تھا۔ میاں افتخار الدین نے وہاں جنرل طارق سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی عملی قدم اٹھائیں۔ جن پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح تھی بلکہ کہہ بھی دی گئی۔

HBC

کے وقت وہ اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ جو بھی کارروائی ہو گی' غیر سرکاری سطح پر ہو گی۔ پاکستانی فوج یا اس کے افسران کے اس میں عملاً حصہ لینے کی کوئی گنجائش نہیں۔

☆○☆

یہی تھے وہ غیر واضح' ناقابل اور مبہم حقائق جن کی روشنی میں طارق بن زیادؒ کے سپاہی جنرل طارق (میجر جنرل اکبر خان) مسلم کانفرنس کشمیر کے لیڈر سردار ابراہیم سے ملنے جا رہے تھے جو کشمیری حریت پسندوں کے لیے امداد حاصل کرنے پاکستان آئے ہوئے تھے۔

جنرل طارق کو حریت پسندوں نے بتایا کہ فی الوقت پانچ سو رائفلیں مل جائیں تو وہ اپنے ساتھیوں کی مدد سے پہلے سے جاری شدہ تحریک آزادی کشمیر کو خاصی تقویت پہنچا سکتے ہیں۔ انہی کی زبانی جنرل طارق کے علم میں یہ بات بھی آئی کہ حریت پسند جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپے بے چینی سے کسی مدد کے منتظر ہیں۔ وہ تمام سابقہ انڈین آرمی کے تربیت یافتہ فوجی ہیں اور ان کے حرکت میں آتے ہی جنگ آزادی کا نقشہ پلٹ جائے گا۔

جنرل طارق کے خیال کے مطابق انہوں نے بہت کم رائفلیں مانگی تھیں۔ کشمیر میں بغاوت کو سنبھالا دینے کے لیے اس سے کہیں زیادہ تعداد میں اسلحہ درکار تھا' لیکن سوال اس بات کا نہیں تھا کہ اسلحے کی کتنی مقدار درکار ہے۔ سوال یہ تھا کہ وہ لوگ کتنا اسلحہ حاصل کر سکتے ہیں۔

جنرل صاحب ان دنوں جنرل ہیڈ کوارٹر میں جنگی اسلحہ اور سازو سامان کے ڈائریکٹر تھے اور اس ناطے سے یہ بات ان کے علم میں تھی کہ پاکستانی فوج کے پاس کتنا اسلحہ ہے؟ ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں پاکستانی فوج کے حصے کا ایمونیشن ابھی تک انڈیا میں پڑا تھا۔ اگر یہ سارا اسلحہ پاکستان میں بھی ہوتا تو وہ اسے کشمیر میں استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اس مقصد کے لیے کمانڈر انچیف کو اعتماد میں لینا ضروری تھا اور انگریز کمانڈر انچیف کے کانوں تک اگر ایسی کوئی اڑتی ہوئی خبر بھی پہنچ جاتی تو کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی بگڑ کر رہ جاتا کیونکہ وہ نہ صرف یہ کہ پاکستان آرمی کو کچھ نہ کرنے دیتا بلکہ اپنے خصوصی روابط کے پیش نظر بھارت کے کمانڈر انچیف کو بھی جو انگریز تھا' مطلع کر کے پہلے سے پیش بندی کی ہدایت کر دیتا۔

تو پھر کیا کیا جائے----؟

اسلحہ کہاں سے اور کیسے حاصل ہو-----؟

اس سلسلے میں قدرت نے دو راستے خود بخود پیدا کر دیئے۔ جنرل ہیڈ کوارٹر میں پولیس کے لیے چار ہزار رائفلوں کی منظوری ہو چکی تھی' لیکن ابھی تک پولیس نے اس کی ڈیمانڈ نہیں

کی تھی۔ جنرل طارق کا پلان یہ تھا کہ وہ یہ چار ہزار پولیس کو جاری کروا کے پھر پولیس سے حاصل کر لیں۔

دوسری طرف آرڈ ینینس ڈپو کے کرنل اکرم غلزاوہ آگے بڑھے۔ ان کی نظر میں ایمونیشن کا ایک ایسا سٹاک موجود تھا جسے ضائع کرنے اور سمندر میں پھینک دینے کے احکامات جاری ہو چکے تھے۔ کرنل غلزاوہ نے وعدہ کیا کہ وہ فائلوں میں یہ اسلحہ سمندر میں پھینک دیں گے۔ کارروائی مکمل ہوتے ہی یہ اسلحہ بھی مجاہدین کو دے دیا جائے گا۔"

پری کے ایک پٹھان کو یہ تاریخی شرف حاصل ہے کہ وہاں بیٹھ کر وہ منصوبہ تیار کیا گیا جو آزاد کشمیر کی فتح پر منتج ہوا۔ اس روز شام کے بعد جنرل طارق اور دوسرے حریت پسند اپنے محدود ذرائع اور وسائل کی کمیابی کے باوجود ایک منصوبہ ترتیب دیئے بیٹھے تھے۔

☆○☆

مہاراجہ کی فوج نو ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی جن میں دو ہزار مسلمان تھے۔ اس منصوبے کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی کہ یہ دو ہزار مسلمان سپاہی کشمیر میں بغاوت پھیلتے ہی مہاراجہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنے ہتھیاروں سمیت مجاہدین سے آملیں گے۔ کم از کم ان سے یہ امید ضرور تھی کہ وہ اس "بغاوت کی سرکوبی" کے دوران خود کو بے اثر بنائے رکھیں گے اور ضرورت پڑنے پر اپنے بھائیوں سے آن ملیں گے۔

بہرحال ان کے نکل آنے سے مہاراجہ کی فوج کی نفری سات ہزار رہ جاتی اور کشمیر جیسے پہاڑی علاقے کی حفاظت کے لیے یہ نفری نہ ہونے کے برابر تھی۔ سب سے بڑا خطرہ بھارتی مداخلت کا تھا کیوں کہ مہاراجہ ریاست کو خطرے میں دیکھتے ہی بھارت سے مدد طلب کر سکتا تھا۔

یہ اجلاس اس صورت حال پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہا تھا کہ ممکنہ بھارتی مداخلت کو کیسے روکا جائے۔ اس سلسلے میں بحث و تمحیص کے بعد بالآخر طے پایا کہ ان تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی جائے جہاں سے غیر ملکی فوجوں کو داخل ہونا تھا۔

ایک راستہ تو کٹھوعہ سے جموں تک کا تھا جہاں گوریلا دستہ اچھی بھلی فوج کے لیے بھی دشواریاں پیدا کر سکتا تھا۔ یہ صورت حال بھی صرف ڈیڑھ دو ماہ تک رہتی' اس کے بعد بارشوں سے یہ راستہ کیچڑ اور پانی کی وجہ سے تقریباً" بند ہو جاتا ہے۔ پھر دسمبر کے مہینے میں درہ بانہال پر شدید برف باری سے یہ راستہ بالکل بند ہو جاتا تھا۔

اس راستے کو مستقل روکے رکھنے کے امکانات تمام تھے۔ لیکن ایک دو ہفتے بھی اگر راستہ روکا رہتا تو تجارتی اور ضرب لگنے سے اقتصادیات تل جاتا۔

دوسرا اور اہم طریقہ فضائی حملے تھے۔ کشمیر میں ان دنوں صرف ایک سری نگر ہوائی اڈہ تھا جہاں فوج اتاری جا سکتی تھی۔ لیکن یہ اڈہ شہر سے دور تھا اور پچاس ہوا باز فوج کی فوری حفاظت کے انتظامات بہت ہی کم رہ جاتے تھے۔ جنرل طارق کا خیال تھا کہ اگر دو مسلح آدمی بھی ہوائی اڈے کے گرد اگرد پھیل جائیں تو دو سو دشمن فوج کے تین سو جہازوں کو اترتے وقت زبردست نقصان پہنچائیں گے۔ دشمن فوج کو اترتے وقت ہی اتنا نقصان پہنچا دیں گے کہ اس کے لیے شہر میں داخل ہونا ناممکن ہو جائے گا۔

اس اجلاس نے مکمل طور پر حاصل ہونے والی چار ہزاروں رائفلوں کو اس طرح تقسیم کیا کہ ایک ہزار تو جموں کشمیر روڈ بند کرنے کے لیے دو سو سری نگر ہوائی اڈے کے لیے۔ باقی آٹھ سو ہزارہ سو رائفلیں پاکستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ والے علاقوں میں بانٹ دی جائیں گی۔ اسی سلسلہ میں ایک اور پلان بھی زیر بحث آیا جس کی رو سے ساتھ افغان نژاد فوجی کے لوگوں کو جو پاکستان میں موجود تھے، ایک فوجی افسر کی کمان میں پنجاب کے سرحدی علاقوں سے کشمیر میں داخل کیا جائے اور دوسرا گروپ میجر خورشید انور کی کمان میں کشمیر کی طرف سے داخل ہو جائے۔

☆○☆

شیر دل نے اچانک چونک کر بات کی تھی۔ خفت تھی یا مسلسل بیداری کہ اسے مدہوشی یا شاید نیند نے آلیا۔ وہ دیوار کی طرف منہ کیے لیٹا ہوا تھا جب اس کے سینے اور دیوار کے درمیان کنکر میں پھنسا کاغذ کا ٹکڑا آن گرا۔ چونکا کر اس نے آنکھ کھولی اور دھندلکے میں اس نے وہ کاغذ کا پرزہ اسی طرح اٹھا کر مٹھی میں بند کر لیا۔

پہلے اس نے اپنی دھڑکنوں کو نارمل کیا پھر کوٹھری کے دروازے میں لگی سلاخوں سے اپنا چہرہ لگا کر باہر دائیں بائیں حد نظر تک نگاہ دوڑائی۔ وہاں کسی سنتری کا نام و نشان نہ تھا۔ تب کاغذ کا ٹکڑا کھولا۔ اس پر لکھی تحریر کی ایک کیفیت نے آن لیا کہ اسے اپنے زخموں سے لگے دن کا اجالا ہونے تک نہ رہا۔ اس نے بڑی بے تابی سے کاغذ کا وہ پرزہ کھول کر

[illegible]

[illegible] صفحہ [illegible] پوری رات فرار کے لیے تیار رہنا۔ روشن دان کی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ انہی ملت فروشوں کا دم قدم تھا کہ آج لاکھوں غیور اور بہادر کشمیریوں کو چند ہزار دوگروں نے انسانوں سے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ کشمیر کے جس کونے سے بھی کوئی چنگاری سلگتی' یہ غدار ملت فروش وہیں حق نمک ادا کرنے پر تل جاتے اور وہ کام جو شاید مہاراجہ کے تنخواہ دار درندے برسوں میں انجام نہ دے پاتے' ان ننگ قوم ضمیر فروشوں کی مدد سے چند دنوں میں انجام پا جاتا۔

محض چند ٹکوں کے لالچ میں اگر کسی گھر کے بھیدی نے زہراں اور اس کی نسبت کی لنکا ڈھا دی تو کیا ہو گا؟ زہریلے ناگوں کی طرح یہ پریشان کن سوچیں اس کے ذہن میں پھن پھیلانے لگیں۔

زہراں

معمول کے مطابق آج بھی زہراں اپنے باپ کا کھانا لے کر آئی تھی۔ وہ دوپہر کا کھانا لے آتی اور شام ڈھلتے ہی واپس چلی جاتی۔ اس دوران وہ پھل توڑنے یا درختوں کے گرد اگی گھاس پھوس کی صفائی میں اپنے والد کا ہاتھ بٹاتی تھی۔

آج جب وہ واپسی کے لیے روانہ ہوئی تو نہ جانے کیوں ایک بے نام سے خوف نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ چلتے چلتے ایک دفعہ تو اس کے جی میں آئی کہ وہ واپس اپنے باپ کے باغ میں چلی جائے' لیکن کچھ سوچ کر اس نے اس فیصلے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے اپنی بزدلی پر اب غصہ آنے لگا تھا۔ پچھلے دس سال سے اس کا یہ معمول تھا۔ پہلے وہ اپنی ماں کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ ایک روز جب اس کی ماں رات کو نماز پڑھنے کے بعد اس پر پھونکیں مار کر سوئی تو دوبارہ کبھی نہ اٹھی۔

آٹھ دس دن تک تو اس نے ماں کا سوگ منایا' پھر ننھی زہراں نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس کا باپ روزانہ دوپہر کو گھر آ کر کھانا کھائے اور پھر تین چار میل کا پہاڑی راستہ طے کر کے واپس جائے۔ اس نے اپنے باپ سے ایک روز کہہ ہی دیا۔ "لالہ تم دوپہر کو نہ آیا کرو۔ کل سے میں تمہارے لیے کھانا لے آیا کروں گی۔"

باپ نے بڑی عجیب سی نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ "لمبا فاصلہ ہے اور —— پھر گھر پر بھی تو کسی کو ہونا چاہیے۔"

"بے بے جو ہے لالہ۔" ننھی زہراں نے باپ کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا جس کی آنکھیں کسی بھی لمحے چھلک جانے کو تیار بہ تیار تھیں۔

پہلے بھی ایسا ہی ہوتا تھا ان کے یہاں۔ ان کی بے بے ہی گھر رہا کرتی تھی۔ دونوں ماں بیٹی روٹی لے کر جایا کرتی تھیں اور دو تین گھنٹے باغ میں گزار کر واپس آ جاتی تھیں۔

لالہ نے اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں اس کے آنسو دیکھ کر ننھی زہراں رونا ہی نہ شروع کر دے' وہاں سے اٹھ جانے ہی میں مصلحت جانی اور جلدی جلدی دو چار نوالے

زہراں کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔

اگلے روز جب وہ دوپہر کو گھر کی طرف آ رہا تھا تو اپنے باغ سے بمشکل ڈیڑھ فرلانگ دور واقع اس پہاڑی موڑ پر جہاں گذرے درختوں سے ٹیک لگا کر "ماہیا" گایا کرتے تھے، اسے دور سے ننھی زہراں آتی دکھائی دی جس نے اپنے سر پر ماں کی طرح کپڑے کا "ایوں" بنا کر رکھا ہوا تھا اور اس پر بڑے سلیقے سے کھانے کے برتن سجائے ہوئے تھے۔

——ایک پرسوز سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے چپک گئی۔ دور سے آتی زہراں بالکل ماں کا عکس نظر آتی تھی۔ بچوں کی شکلیں عموماً اپنے ماں باپ ہی سے ملتی ہیں، لیکن جس حد تک زہراں اپنی ماں سے مماثلت رکھتی تھی، اس پر کبھی کبھی خود لالہ بھی حیرت زدہ رہ جاتا۔

اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اپنی لاڈلی کے سر سے برتن اتار کر زمین پر رکھے اور اسے اپنے کلیجے سے چمٹا لیا۔ بے اختیار اس کے دونوں گالوں پر آنسوؤں کے قطرے بہہ نکلے، لیکن اس نے دوسرے ہی لمحے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔ "ابھی تو چھوٹی ہے بیٹی۔" اس نے رندھے ہوئے گلے سے زہراں کو مخاطب کیا۔ "اکیلی تھک جایا کرے گی۔"

"نہیں لالہ۔" ننھی زہراں نے بڑی خود اعتمادی سے جواب دیا۔ "میں تھکنے والی نہیں ہوں۔"

لالہ اسے باغ میں لے آیا اور شام تک اسے ساتھ ہی رکھا۔ شام کو وہ گھر لوٹے تو پریشان حال بے بے نے خدا کا شکر ادا کیا۔

یوں تو شام کو دونوں باپ بیٹے اکٹھے ہی گھر واپس جایا کرتے تھے، لیکن جب درختوں پر پھل پکنے کے دن آتے تو لالہ ہفتے میں ایک آدھ دن ہی گھر آیا کرتا تھا۔ ان دنوں اس کا زیادہ وقت دن کو پرندے اڑانے اور رات کو جنگلی جانوروں سے پھلوں کی حفاظت ہی میں گزر جاتا۔ زہراں ان دنوں اکیلی شام کو گھر لوٹا کرتی تھی۔

☆○☆

وہ بھی پھلوں کی تیاری کے دن تھے۔ اس کا باپ تو وہیں رہ گیا اور وہ خراماں خراماں گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

——سورج کا سرخ آتشیں گولہ اس کی داہنی سمت آنے والے پہاڑی سلسلے کی اوٹ میں چھپتا ہی چلا جا رہا تھا۔ پہاڑیوں کی چوٹیاں لہو رنگ ہونے لگی تھیں۔ اسے ڈوبتے سورج کا منظر بہت پسند تھا اور اکثر وہ کافی دیر تک کسی جگہ رک کر اس منظر سے دل

بہلایا کرتی تھی۔ پہاڑی والے موڑ کے نزدیک پہنچ کر اس نے بائیں جانب قدرے نشیب میں بنے بڑے سفید اور سیاہ رنگ کے چھریرے خانہ بدوش کے بائیں جانب قدرے نشیب میں بنے بڑے سفید اور سیاہ رنگ کے چھریرے خانہ بدوش کے پنجوں کے بل بیٹھے پاؤں چھوں پر سے پھسلتے پل پر مضبوطی سے پاؤں جما کر وہ گرجتے ہوئے پانی کے بہاؤ پر نظریں جمائے پنڈلیاں تک پانی کی خبری میں پانی کی پھوار سے بھیگ جاتیں، لیکن وہ بے پرواہ بنی رہتی۔ الوداع ہوتے سورج کی شعاعوں میں ایسی غرق ہو جاتی کہ اپنے تن بدن کا اسے ہوش نہ رہتا۔

ایک روز یوں ہی بیٹھے بیٹھے جب اس نے دریا سے نگاہ ہٹا کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں تو اچانک کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ زہراں بڑبڑا کر اٹھی اور جب اپنے عقب میں شیرو کو دیکھا تو گھبراہٹ سے اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ اس سے پہلے اس نے شیرو کا نام ہی سنا تھا یا بچپن کی وہ دھندلی سی یادیں تھیں جن کے سامنے اس نے گھبرو شیرو کا ایک سراپا اپنے ذہن میں سجا رکھا تھا۔ "شیرو اس کے تصورات سے بھی بڑھ کر خوبرو ہو گا۔" جھرنے کی ساری کنگناہٹ اس کے بدن میں در آئی تھی۔

وہ لوگ تو پہاڑی کے پرلی طرف والے محلے میں بستے تھے جب کہ اس کا چچا زاد بھائی—— شیرو، بازار والے محلے میں رہتا تھا—— ان دونوں کو متباہی رسوم کے مطابق پیدائش کے فوراً بعد ہی ایک دوسرے سے منسوب کر دیا گیا تھا اور جیسے جیسے زہراں کا شعور بیدار ہوتا گیا، ایک حجاب سا اس میں پیدا ہونے لگا—— جو کہنہ ہی میں اس نے شیرو سے پردہ کرنا شروع کر دیا تھا اور آج جب وہ اچانک اس کے سامنے آیا تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اپنے حواس بحال کرے؟ تاہم اس نے بمشکل کھڑے ہو کر سلام کیا۔

"چچا سے ملنے جا رہا تھا، راستے میں تم نظر آ گئیں۔ سوچا تمہیں بھی دیکھتا چلوں کیسی گتی ہو اب؟" شیرو نے جرأت کا مظاہرہ کیا۔

زہراں نے جواب میں صرف ایک مرتبہ نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا پھر کچھ کہے بغیر نظریں جھکا لیں، لیکن کومل جذبوں کی زبان نے شیرو کے کانوں میں سرگوشی کی..... "ہاں تو کیسی لگتی ہوں؟"

"میرے تصورات سے بھی بڑھ کر خوبصورت ہو تم زہراں۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"جی——!" زہراں کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔

اس دفعہ تو شیرو بھی گھبرا گیا۔ کسی نادیدہ طاقت نے بے اختیار اس کے جذبات کی ترجمانی اس کی زبان سے کروا دی تھی۔ اس کا یہ فعل قطعاً غیر ارادی تھا۔ پھر جیسے وہ مطمئن سا ہو

گیا۔۔۔۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ بات کہہ کر اس نے اپنے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہو۔ "ہاں زہراں۔" اس نے سنبھالا لیا۔ "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم۔۔۔۔۔۔" وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔

پہاڑی کی اوٹ سے گڈریا اور بھیڑیں اکٹھی نمودار ہوئی تھیں۔ شیرو کو امید تھی کہ زہراں بھی کچھ کہے گی' لیکن وہ خاموشی سے دوپٹے کے پلو کو انگلی کے گرد مروڑتی رہی۔ البتہ دو تین مرتبہ اس نے زمین پر گڑی اپنی نظریں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ جیسے شیرو کے کہے الفاظ کی صداقت کو کریدنے کی کوشش کر رہی ہو اور وہاں سے جواب میں "حق حق" کی صدائیں سن کر پھر نظریں جھکا لیں۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔" شیرو نے ڈھلان اترتی بھیڑوں اور رکھوالے پر نظریں جمائے کہا۔ زہراں کے سینے میں اس کی روانگی کے اعلان سے ایک ہوک سی اٹھی۔ بھیڑوں کے تعاقب میں آتا گڈریا نمایاں ہونے لگا تھا۔ جب شیرو نے روانگی کے لیے پہلا قدم اٹھایا۔ زہراں کا ہاتھ بے اختیار روکنے کے سے انداز میں اس کی سمت اٹھا اور اٹھا ہی رہ گیا۔

"پھر آؤں گا۔" اس کے آگے کی سمت بڑھے ہاتھ کی لرزش نے شیرو کے اعصاب پر کپکپی طاری کر دی تھی۔ اس نے پلٹ کر بمشکل یہی ایک فقرہ کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس راستے کی طرف گھوم گیا جس پر چل کر زہراں یہاں آئی تھی۔

جانے والا تو چلا گیا لیکن زہراں کو ایک خوبصورت درد ہمیشہ کے لیے بخش گیا۔ یہ عجیب سرور بخش درد تھا جس کی لذت اس کی جان لیے جاتی تھی۔ جب تک بھیڑیں اپنی پیاس بجھانے کے لیے اس جھرنے پر زہراں کے گرد دست قدرت کے بکھرے پتھروں پر نہ پھیل گئیں۔ وہ ٹکٹکی لگائے اس راستے کو گھورتی رہی جو چند فرلانگ کے بعد گھوم کر اس کے لالہ کے باغ تک جا پہنچتا تھا۔ پھر اس نے اپنی بے قابو دھڑکنوں کو سمیٹا اور ایک سرشاری کے عالم میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور جھرنے سے گھر تک کا فاصلہ اس نے شیرو کے تصورات کی نذر کر دیا۔

☆○☆

اس کے بعد تو زہراں کا معمول ہو گیا کہ وہ اکثر یہاں سے گزرتے ہوئے "کسی" نہ "کسی" کے منتظر رہتی۔ دو دن اس اندوہناک انتظار میں بیت گئے' لیکن شیرو نہ آیا۔ پھر تیسرے روز وہ اس دن کی طرح اچانک ایک پہاڑی موڑ سے نمودار ہو کر اس کی راہوں میں

اس دن شیرو کو دیکھتے ہی نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں اطمینان پھیل گیا تھا اور ۔۔۔ اس کے گالوں سے چپکتے آبدار موتیوں کو' کیکر کے پیڑ کے نیچے بیٹھا ہوا شیرو سارا ماجرا۔

"کیا بات ہے زہراں؟" اس نے پہلی ملاقات کی طرح آج بھی بے اختیار اس کے ہاتھ تھام لیا تھا۔ یہ انکشاف ہونے پر کہ وہ اس کی آواز پہچان کر زہراں ہی تھی' وہ اس سے لگ گئی۔ "آئے کیوں نہیں۔۔۔۔ اس دن کے بعد سے؟" وہ سسک پڑی۔

"ارے پگلی کہیں کی' بات ہی ایسی ہو گئی تھی۔ ورنہ تو تمہیں بتانے آیا ہوں۔" اس نے زہراں کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا۔

"کیا بات تھی۔۔۔۔؟" زہراں یک لخت جیسے نیند سے بیدار ہو گئی۔ اس احساس نے کہ وہ بے اختیار شیرو کے سینے سے لگ گئی تھی' اس کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھا دی۔۔۔۔ حجاب اور احساس ناکردہ گناہ نے اس کے گالوں کی لوئیں تک سرخ کر دی تھیں۔

"آؤ زہراں' وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" شیرو نے بڑے سنجیدہ لہجہ میں اسے مخاطب کیا۔

شیرو کے لہجے کی سنجیدگی اور اس کی اس طرح پراسرار آمد نے زہراں کو چونکا دیا۔ وہ مجسم سی اس کے تعاقب میں بڑھ گئی۔ جہاں وہ اس گزرگاہ پر آنے جانے والوں کی نظروں سے بالکل چھپ کر بیٹھ سکتے تھے۔ شیرو اسے یہاں تک لے تو آیا تھا' لیکن یہ بات اسے بھی پریشان کرنے لگی تھی کہ آخر زہراں کو وہ سب کچھ کہہ بھی پائے گا جو کچھ کہنے کے لیے اسے یہاں لایا ہے۔ کیا اس کا معصوم دل یہ صدمہ۔۔۔ بھی سہہ سکے گا؟

وہ تو ایک مرتبہ مل کر دوبارہ نہ ملنے پر بلکنے لگی تھی۔ شیرو کو کچھ نہ سوجھتا تھا کہ آخر زہراں کو وہ کیسے مطمئن کر پائے گا۔ اس کا اس دنیا میں لالہ' بے بے اور شیرو کے سوا اور ہے ہی کون؟ دو تین ماہ بعد جب وہ لوگ پھلوں کی ایک فصل سے فارغ ہو جاتے تو لالہ دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیتا۔ اب جو اچانک وہ اسے ایک لمبی جدائی کے سامنے سے دوچار کرنے آیا ہے تو کیونکر وہ اس حادثہ جانکاہ سے سنبھل سکے گی؟ پھر ایک مضبوط ارادے نے' ایک قوی خیال نے جیسے اس کے خیالات کی ڈولتی ناؤ کو کنارہ دکھا دیا۔

اس نے سوچا وہ کوہساروں کی بیٹی سے مخاطب ہے۔ وہ۔۔۔۔ اس نسل کا نمائندہ ہے جس کو حالات نے مادر کشمیر کو غیروں کے استبداد سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کرنے کی سعادت نصیب کی ہے۔۔۔۔ وہ کشمیر کو ڈوگرہ فوج سے آزاد کروانے جا رہا ہے۔۔۔۔ وہ

ہی کی سمت پہنچی لیکن یہ کیا؟

ہی کے دروازہ کھٹکھٹانے پر بھی جب کوئی باہر نہ نکلا تو وہ خود ہی دروازہ کھول کر اندر جا

... بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ لالہ نے دیوانہ وار گھر کے تینوں کمروں میں

زہراں کی اچانک گمشدگی بوڑھی عورت کے حواس پر بجلی بن کر گری۔ لالہ نے محلے کی دو تین عورتوں کو مدد کے لیے بلا لیا تھا۔ سب نے مل کر اس کے گھروں کی تلاش کی تب کہیں جا کر اسے ہوش آیا' لیکن وہ دیوانوں کی طرح ایک ایک سے اپنی زہراں کا پتہ پوچھنے لگی۔

خدا کی قسم اسے اس جرم کی اتنی بھیانک سزا بھگتنا ہو گی کہ پونم کی پہاڑیاں بھی اس
[illegible] پتہ پائیں گی۔ رات کا انتظار کرو دوستو! آج کی رات فیصلہ کن ہو گی۔
[illegible] مہلت نہ دیں گے۔" حسین خان کو اپنی آواز اجنبی لگ رہی تھی۔

"کیا خبر لائے؟" اس نے چھٹتے ہی بڑی بے چینی سے پوچھا۔

"حیرت ہے۔" نصیب نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

"پہیلیاں نہ بجھواؤ نصیب۔" حسین خان نے سخت اضطراب کا مظاہرہ کیا۔

[redacted]

بھیجا اور دولتان سے مجلدین کی صف بندیوں اور فوجی دستوں پر مشتمل ایک خبر نامہ

سے پہ بے ہوش زہراں کو لاد رہا تھا۔

——— زہراں کی شکل پر نظر پڑتے ہی ایک سنسناہٹ سی اس کے بدن میں دوڑ گئی: "یہ لوگ اس حد تک بھی گر سکتے ہیں؟" اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا لیکن——— مہاویر جیسے شیطان کو وہاں دیکھ کر اسے تعجب بھی نہ ہوا۔ سجاول نے وہاں رک کر خود پر کسی کو شک لانے کا موقع نہ دیا اور وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔

اپنی رائفل جمع کرواتے وقت اس نے کوئی ایسی غیر معمولی حرکت نہ کی جس کی بنا . صد میں بھی کوئی اس پر شک کر سکتا۔ اب اسے گھر لوٹ جانا تھا۔ اس کی ڈیوٹی کل شام

نے اس کو کریدنے کے سے انداز میں پوچھا۔

"مجھے ذرا باغ تک جانا ہے' بڑا ضروری کام تھا حوالدار جی۔ میں تو آج چھٹی کرنے والا تھا لیکن میر صاحب نے ایمرجنسی کی وجہ سے درخواست قبول نہیں کی——— میں نے سوچا چلو شام کو چلا جاؤں گا۔ خواہ مخواہ کیوں معمولی سی بات کے لیے افسروں کی منتیں کرتا پھروں۔" سجاول خان نے اسے مطمئن کر دیا۔

بیرک کی طرف جاتے ہوئے جہاں اس کے سویلین کپڑے رکھے ہوئے تھے' سجاول خان

ہے اس نے کوئی حرکت کی تو نہ جانے کیا قیامت گزر جائے۔

---اس کا حلق دہشت سے خشک ہو رہا تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

نہ آہستہ اس کا ذہن بیدار ہونے لگا اور اسے تربہ واقعات دہشتناک مناظر کی طرح یا

میجر رام سنگھ کا حکم سنتے ہی اس کے دونوں ماتحت "جے بھوانی" کا نعرہ لگاتے ہوئے کمرے سے باہر کود پڑے۔ چند منٹ بعد ہی فوجیوں کی مختلف ٹولیاں مختلف سمتوں میں زہراں اور اس کے اغوا کنندہ کی تلاش میں روانہ ہو گئیں۔

زہراں اور شیرو کی ماں دونوں اس کے ہاتھ آتے آتے نکل گئی تھیں۔ رام سنگھ سوچ رہا تھا کہ شیرو کی ماں تک تو ان کی رسائی ہی نہیں ہو سکی' لیکن زہراں کی یہاں موجودگی کا علم حریت پسندوں کو کیسے ہوا؟

رام سنگھ جانتا تھا کہ لالہ مہادیو کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں۔ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا اور ایسا گھرا آدمی کبھی اتنا غیر محتاط نہیں ہو سکتا کہ وہ زہراں کے اغوا کا علم کسی کو ہونے دے ـــــ اغوا ہونے سے تھانے پہنچنے تک اس نے تو کسی کو کانوں کان اطلاع نہیں ہونے دی تھی۔ ان کے خصوصی عملے کے سپاہی جو اس مہم پر اس کے ساتھ گئے تھے' ان میں سے بھی کسی کی وفاداری پر وہ شبہ نہیں کر سکتا تھا۔

ـــــ پھر اس نے فرض کیا کہ اگر حریت پسندوں کو اس بات کی خبر بھی ہو گئی تھی تو وہ بھی اتنی تیزی سے حرکت میں نہیں آ سکتے تھے۔ انہیں اس جگہ پہنچنے کے لیے رات کا انتظار کرنا چاہیے تھا اور جس راستے سے زہراں کو نکالا گیا تھا' اس طرف تو کوئی ذہن جا ہی نہیں سکتا تھا۔

اس کا ذہن مکمل بیدار تھا اور وہ تمام امکانات پر دماغ سوزی کر رہا تھا تاکہ جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچ کر کوئی راہ نکال سکے۔ میجر رام سنگھ بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ حرکت ضرور وہاں موجود لوگوں میں سے کسی کی ہے۔

ـــــ شاید کسی مسلمان فوجی یا پولیس والے نے زہراں کو اغوا کر لیا ہے یا وہ حریت پسندوں کا کوئی ساتھی ہے جس کی اطلاع پر وہ لوگ فوراً حرکت میں آ گئے اور اطلاع دینے والے ہی نے انہیں اغوا اور فرار کے لیے اس راستے اور طریق کار کی نشاندہی کی ہو گی۔

رام سنگھ کی ترقی کا شاید سب سے بڑا راز ہی یہی تھا کہ اس نے جوش میں بھی کبھی ہوش کا دامن نہیں چھوڑا تھا اور اب چونکہ وہ بڑی تیز رفتار سے اپنے ذہن میں ترتیب پا جانے والے مفروضوں پر عمل پیرا تھا۔ اس نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس واقعے کی [illegible] وہاں موجود مسلمان سپاہیوں کو نہ ہونے پائے۔

[illegible] کی ہدایات کے مطابق صرف سجاول ہی چھٹی کر کے گیا تھا۔

[illegible] نے کسی کو بتائے بغیر وہاں موجود پولیس کے مسلمان اور غیر مسلم تمام

ساتھیوں سے اپنے طور پر اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ ان میں سے کسی نے بھی [illegible] کوئی غیر معمولی حرکت نوٹ نہیں کی۔

پھر اسے خیال آیا کہ اگر وہ حریت پسند اس کے ساتھیوں سے تو واقف تھے [illegible] آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ وہ لوگ پوچھ گچھ سے بچنے کے لیے [illegible] اتنی جلدی کوئی واپس نہیں آ سکتا اور ـــــ اگر ان کے کچھ ساتھی وہاں [illegible] جمعدار سجاول کے کہنے پر فوراً حرکت میں آ گئے تھے تو بھی ابھی وہ [illegible] پہنچا کر واپس نہیں آیا ہو گا۔

ـــــ اس سوچ کے دماغ میں آتے ہی اس نے جمعدار سجاول کو واپس [illegible] کمرے کی طرف روانہ کر دیا تھا۔

☆○☆

"یار! میجر رام سنگھ کے کمرے سے ایک انتہائی خطرناک زیر تفتیش ملزم فرار ہو گیا ہے۔" حوالدار جانکی داس نے قہوے کا لمبا گھونٹ بھرتے ہوئے اپنی دانست میں اسے "اہم اطلاع" دی۔

"تمہاری عقل کیا گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ وہاں سے کون مائی کا لال فرار ہو سکتا ہے' چاروں طرف تو رام سنگھ کے فوجی پہرہ دے رہے ہیں۔ پولیس والوں کو تو اس طرف جانے کی بھی اجازت نہیں۔" سجاول نے بظاہر اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

"یہی تو بات ہے۔" جانکی داس نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کے سے لہجے میں کہا۔ "رام سنگھ کا بھی یہی خیال ہے کہ وہ خود فرار نہیں ہو سکتا۔ ضرور اسے کسی نے فرار ہونے میں مدد دی ہے۔"

"میں اس سلسلے میں اب کیا عرض کروں۔ ہم تو معمولی سے بندے ہیں' اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ صبح میر صاحب آ جائیں گے تو یہ معاملہ حل ہو جائے گا۔ وہ تو مفرور کو کبھی معاف کریں گے ہی نہیں۔ تم تو جانتے ہو انہوں نے آج تک کتنے اشتہاری مجرم گرفتار کروائے ہیں۔"

"بھگوان کے لیے۔" جانکی داس نے اس کے زانو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھنا۔ اگر اسے ذرا سا بھی شک ہو گیا کہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے تو وہ مجھے فوراً گولی مار دے گا۔" پھر جانکی داس نے اس کے بالکل ساتھ جڑتے ہوئے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ "اس نے تو مجھے تمہاری چیکنگ کے لیے روانہ کیا ہے۔ وہ اپنی تسلی

کرنا چاہتا تھا کہ تم گھر ہی پر موجود ہو یا نہیں۔"

حوالدار جانکی داس سیدھا سادا بوڑھا آدمی تھا۔ اس نے قصے کی دو بیالیوں سے پر
ساری کہانی سجاول کو سنا دی اور اس بات کا یقین بھی دلا دیا کہ وہ اس کی طرف سے
مطمئن رہے۔ جانے سے پہلے اس نے ایک مرتبہ پھر سجاول سے درخواست کی کہ وہ اس
بات کا ذکر اپنے کسی ساتھی سے بھی نہ کرے۔

جانکی داس کی روانگی کے تھوڑی دیر بعد سجاول جس طرح اپنے گھر میں داخل ہوا تھا
اسی طرح دیوار پھلانگ کر باہر آ گیا۔ پہلے اس نے گھوم پھر کر اطمینان کر لیا کہ کوئی اسے دیکھ
تو نہیں رہا اور پھر ایک لمبا چکر کاٹ کر لالہ کے مکان کے عین سامنے جا پہنچا۔

——پریشان حال لالہ اتنی رات گئے سجاول کو اپنے دروازے پر دیکھ کر چونک پڑا۔
اس کی صاحب سلام تو سجاول سے تھی' لیکن اس سے کچھ زیادہ تعلقات نہ تھے۔ ویسے اسے
اس بات کا علم ضرور تھا کہ سجاول پولیس میں ملازمت کرتا ہے۔ سجاول نے اسے مختصر لفظوں
میں سارے واقعات سے آگاہ کرنے کے بعد فوراً" بے بے کو ساتھ لے کر یہاں سے ہٹ
جانے کو کہا۔ اسے علم تھا کہ جلد یا بدیر لالہ' میجر رام سنگھ کے انتقام کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔
کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر اس نے فی الحال زہراں اور چاچی کا پتہ بتانے سے
معذرت کی' لیکن اس بات کا وعدہ بھی کر لیا کہ وہ مناسب موقعے پر اسے زہراں سے ملا دے
گا۔ وقت کی کمی کا احساس لالہ کو دلا کر وہ رخصت ہو گیا۔

صبح بستی والے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لالہ اور بے بے بھی گھر سے غائب
ہیں——!

سجاول خان

مہاویر پریشان تھا۔ جانے سے آدھا دن باہر نکلا تھا۔ اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ وہ
آنے جانے والوں کی نظروں سے بچا رہے۔

——شیرو کی ماں کے بدلے اس کی بھتیجی کو بھیجنے کا فیصلہ کرنے کے بعد وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ دراصل اس نے زہراں کو چاچی کی نگرانی سے
تھے کے عتاب سے محفوظ کر لیا تھا ورنہ تو پچھلے دو تین سال سے جب سے وہ رام سنگھ سے
ساتھ کام کر رہا تھا' اس نے بخوبی اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ ہاہی کی صورت میں رام
تھے کی حالت زخمی سانپ کی سی ہو جاتی ہے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر اپنی بیٹی کملا کے سوگوار چہرے پر پڑی جو اسے دیکھتے
ہی "پتا جی" کا نعرہ لگا کر اس سے چمٹ گئی تھی۔

"خیریت بیٹی؟" مہاویر پریشان نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی انجان بنتے ہوئے
کہا۔

"پتا جی" کملا سسک پڑی۔ "زہراں غائب ہے۔ کہاں چلی گئی وہ؟"

"ارے واہ اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ کہیں چلی گئی ہو گی۔ آ جائے
گی۔" مہاویر نے کمال مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

کملا بضد رہی کہ وہ خود اسے تلاش کرے۔ اسے مطمئن کرنے کے لیے مہاویر اپنی
پیشکش کے ساتھ لالہ کے ہاں گیا اور اس سے بہت زیادہ ہمدردی کا اظہار کرنے کے بعد اسے
یقین دلایا کہ زہراں کی تلاش میں وہ زمین آسمان ایک کر دے گا۔ کملا اپنے بیکار باپ کی
یقین دہانی پر قدرے مطمئن سی ہو گئی' لیکن مہاویر کے لاکھ اصرار کرنے پر بھی اس نے رات
کا کھانا نہ کھایا۔

"جب تک زہراں نہیں آ جاتی میں "جل بھوجن" نہیں کروں گی۔" اپنی ماں کے
اصرار پر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور اپنے سونے کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

HBC

☆○☆

رات کے تیسرے پہر وہ تینوں اس محلے کے باہر کھنڈر نما مکان کے ملبے میں سلیمہ پرشاد آنے والی قیامت سے بے خبر شراب کے نشے میں مدہوش گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ انہیں اس بند کے دوران کے پیچھے کھنڈر ابھی پوشیدہ چند منٹ ہی گزرے تھے جب ایک مکان کی دیوار سے ٹپکا ایک سایہ ان کی سمت بڑھتا دکھائی دیا —— شرفو کی گرفت پستول پر مضبوط ہو گئی۔

"حسین خان!" آنے والے کی سرگوشی نے انہیں مطمئن کر دیا۔

حسین خان آگے بڑھ آیا۔ اسیب نے اس کے کان سے منہ لگا کر اسے کچھ سمجھایا۔ اس کی باتوں پر کبھی تو حسین خان سر ہلانے لگتا اور کبھی سر کھجا سوال بن جاتا۔

چند منٹ بعد وہ تینوں اسیب کی سربراہی میں سلیمہ کے مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تینوں ایک دوسرے کے بعد مکان کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے۔ حسین خان سب سے آگے تھا' دونوں اس کے پیچھے۔

اب وہ کمروں کی دو رویہ قطار کے سامنے کھڑے تھے۔ شرفو کو اس گھر کے ایک ایک کمرے سے آشنائی تھی۔ اس کا بچپن اس حویلی میں کھیلتے کودتے گزرا تھا۔ حسین خان نے کھڑکی بردار کو دروازے پر کھڑا کیا۔ شرفو اس کے اشارے پر زنان خانے کی طرف بڑھ گیا جب کہ وہ خود چند سیکنڈ کے بعد سلیمہ پرشاد کے سر پر راکفل تانے کھڑا تھا۔

"کہ..... کہ..... کون ہو تم؟" خوف اور دہشت سے سلیمہ پرشاد کو اپنے جسم سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

☆○☆

حسین خان نے ایک مرتبہ پھر ڈبے کے پیچھے بڑی سی ٹوٹ اور اس میں اوندھی گری ہوئی کرسیوں کو سلیقے سے رکھ لی تھی کہ اس کی ہیئت تبدیل نہ ہو سکے۔

اشرف خان نے اپنے پہلو میں کمزور نوجوان کو مخاطب کیا: "اصولاً مجھے تمہیں اس مہم میں نہیں لے جانا چاہیے تھا کیونکہ تم ابھی زیادہ تجربہ کار نہیں ہوئے' لیکن اس وقت کے پیش نظر کہ تم کیس اپنے دوست کی موت کا انتقام نہ لے سکنے کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار نہ ہو جاؤ' میں نے فیصلہ بدل لیا ہے۔ ہاں —— ! تم صرف ایک بات یاد رکھنا کہ ہمارا مقابلہ دنیا کے دو خبیث ترین انسانوں بیجو رام سنگھ اور سلیمہ پرشاد سے ہے۔ ذرا سی غلطی بھی ہم سب کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔"

"آپ بے فکر رہیں' میں ایسی کوئی غلطی نہیں کروں گا۔" اشرف خان نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ پستول اس نے بھی اپنے جسم سے باندھ رکھا تھا' لیکن اس طرح کہ ضرورت پڑنے پر وہ اسے فوراً استعمال میں لا سکتا تھا۔ ان کا تیسرا ساتھی اس لوٹ سے غیر مسلح تھا کہ اس کے پاس نہیں تھا' وہ صرف کلہاڑی اٹھائے ہوئے تھا۔

اب وہ تینوں میرولی اور ان کے دوسرے ساتھی انہیں پہاڑی راستوں کے اختتام رخصت کرنے آئے تھے۔ روانگی سے پہلے میرولی نے حسین خان کو مخاطب کر کے کہا تھا: "حسین میاں بات اس طرف واپس نہ آئے ہم صرف تمہارے منع کرنے پر رکے رہے ہیں ورنہ ہمارے دل میں تو ہم ابھی کسی بھی وقت وہ لال نہیں جاتا کہ سدھنوں کی غیرت کو للکار کر یوں

میں ملے ہوئے ہاتھ سے ہاتھ ملانے حسین خان نے اپنی بائیں ہاتھ سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے کہا

HBC

ہاتھوں کے ہوش اڑ گئے۔ بیرام گڑھ کا قلعہ ان کے لیے ناقابل تسخیر تھا۔ وہ اسے بل پل کی خبریں بھیجتا رہا تھا۔ اس کے پاس قلعہ کی پوری تفصیل تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے اور قلعہ کے درمیان کوئی نہ کوئی رابطہ موجود ہے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بتائے بغیر اس کا پتا لگانے کا فیصلہ کیا۔

اس کے ساتھی بھی اس کی طرح بہادر تھے۔ وہ موت سے نہیں ڈرتے تھے۔ انہوں نے اطمینان سے اپنا کام مکمل کیا اور واپس چل پڑے تھے۔

اب ایک اور مہم کی باری تھی۔ اس مہم کے لیے بھی بہادروں کی ضرورت تھی۔ اس نے اس کام کے لیے بھی اپنے ساتھیوں کو چن لیا تھا۔ ان کے ہاتھ میں بھی "کالی" اور "گورو" بھی میدان میں آگیا تھا اور اس گروپ نے ارجن سنگھ کی قیادت میں کام شروع کر دیا تھا۔

اس کے خیال میں زہراں کو رام گڑھ کے منہ سے بھیجنا تھا۔

اس کی توجہ اب حسین خان کی طرف سے ہٹ کر اس "نئی مصیبت" کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق یہ اس کا سب سے بڑا مخالف اور ہوشیار تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ توانی کی حد تک ایماندار بھی تھا۔

رام گڑھ کے ذہن میں اب یہ سوال سلگ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کم از کم کوئی ایسا پتہ اس کے ہاتھ میں ہو جس کے عوض وہ ان لوگوں سے سودے بازی کر سکے۔ جہاں تک شیرو کا سوال تھا یہ کارڈ اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔ وہ تشدد کے ذریعے اس سے کچھ نہیں اگلوا سکتا تھا کیونکہ اس کے ساتھیوں کو یقین تھا کہ وہ مر جائے گا' لیکن اپنے کسی ساتھی کی خبر نہ دے گا۔

اچانک" اس نے سوچا "زہراں کا باپ شاید اس کے لیے ترپ کا پتہ ثابت ہو۔" اور دوسرے ہی لمحے اس کے دو مستعد نائب اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"فوراً" اس نے کہا "زہراں کو گرفتار کر کے لاؤ۔" اس نے اپنے انتہائی قابل اعتماد نائبین کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

دونوں تیز رفتاری اور پھرتی سے باہر کو لپکے مگر دس پندرہ منٹ بعد ہی ان کی واپسی ہو گئی اور یہ اطلاع اس کے لیے بم کا دھماکہ ثابت ہوئی کہ زہراں کا باپ بھی غائب ہے۔

"جہنم میں جائے تم سب" اس نے سر پر ٹوپی جماتے ہوئے بڑبڑا کر کہا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اس طرح پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح اٹھا اور منہ لٹکا کر باہر نکل گیا۔

بیرام گڑھ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اس کا سارا زور بازو اس پر تھا اور وہ اپنی بدقسمتی' ناکامی اور ناکامی کو قسمتی جام کی نذر کرتا رہا۔

[illegible] ہو گئے تھے تو اس نے [illegible] اپنی [illegible] اس نے [illegible] کر دیا تھا۔

بیرام گڑھ اور اس کے دوست شیرو کی بول چال سے اپنے مقاصد کی تکمیل میں مدد لیتے رہے تھے۔ انہوں نے اپنی دانست میں اسے انتہائی [illegible] کر کے اپنی امداد پر مائل کر لیا تھا۔

[illegible] مارے مارے پھرے تب اس کے بازو شل ہو گئے تو اس نے شیرو کو واپس حویلی میں پہنچنے کا حکم دیا اور خود اپنی آرام گاہ میں جا کر [illegible] ہو کر بیٹھ گیا۔

شیرو کو شام کے وقت ہوش آیا تو وہ منشری اس کے سرہانے کھڑا تھا۔

اس نے پانی سے بھرا مٹی کا پیالہ اس کی طرف بڑھایا۔ اس لمحے شیرو کو اس کی اس "نیکی" کا شدت سے احساس ہوا۔ اس نے جانے اتنا غصہ کیوں آگیا۔ اس نے جھٹکے سے پیالہ منشری کے ہاتھ سے گرا دیا۔

"دیکھو اگر تم اس طرح میری ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہو تو یہ فضول ہے۔ مجھے دوسروں سے بھی اتنی ہی نفرت ہے جتنی ان کے وفاداروں سے۔"

منشری نے اس کی بات کا جواب نہ دیا صرف مسکرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے ضد کر کے اور شیرو کی لعن طعن سننے کے باوجود زبردستی اور دوسرے لوگوں سے چوری چھپے اسے دودھ بھی پلا دیا۔ دودھ میں اس نے مشائی' بادام اور گھی خاص طور سے گرم کر کے ملا دیا تھا۔

شیرو کو قدرے افاقہ محسوس ہو رہا تھا' لیکن وہ ایک عجیب کشمکش کا شکار تھا۔ کبھی تو وہ اپنے اس پراسرار محسن کے لیے اپنے دل میں احترام کے جذبات موجزن پاتا اور کبھی جذباتیت کا شکار ہو کر اسے برا بھلا کہنے لگتا۔

آج اس کی ڈیوٹی رات آٹھ بجے ختم ہو رہی تھی۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے شیرو کو اس کی استقامت اور ثابت قدمی پر مبارک باد دی اور اس بات کا یقین دلایا کہ خدا ضرور اس کی مدد کرے گا۔

شیرو اس کی طرف احسان مندی سے دیکھتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

☆○☆

رات کا پہلا پہر تھا جب شیرو اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔۔۔۔ ایک کنکر روشن دان سے

HBC

اس پر تن کر اتنا بھر اس نے دونوں ہاتھوں کو سلاخیں اکٹھا کرتے دیکھا اس کے بعد
دونوں ہاتھوں نے روشندان میں اتنی جگہ بنا دی تھی جس میں سے شیرو بچے
آسانی سے گزر سکتے۔ اس کے ساتھ ہی ایک رسہ اندر آتا بس وہ ایک سرا دیوار سے بھر
لٹک رہا تھا اور دوسرا باہر۔

شیرو نے دھڑکتے دل سے رسے کو پکڑا تاکہ اس کے سہارے دیوار پر چڑھ
روشندان تک پہنچ سکے، لیکن ابھی اس نے پہلا ہی قدم بڑھایا تھا کہ اس کی چھٹی حس نے
تنبیہ کی۔۔۔۔ پہرے دار کی بارچ کی روشنی اسے دروازے کے باہر ٹہلائی مل کھائی سلاخوں
ڈال رہی تھی۔

شیرو ایک وقت دو باتوں کا شکار تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ باہر والوں کو اس
بات کی اطلاع کیسے دے کہ وہ رسی باہر کھینچ لیں اور دوسری طرف وہ پہرے دار کے دھیان
پہنچنے سے پہلے باہر کود جانا چاہتا تھا۔ بیچ کا راستہ اس نے یہ منتخب کیا تھا وہ۔

پہرے دار کی بارچ کی روشنی اس کے سامنے والی دیوار پر لرز رہی تھی، پھر یک بیک
روشنی غائب ہو گئی۔ شیرو نے اطمینان کا سانس لیا کیوں کہ اب پہرے دار کے قدموں کی
آواز بھی دور ہی دور بنتی جا رہی تھی۔۔۔۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔ اس
نے اپنے جسم پر لپٹے چیتھڑوں سے دونوں ہاتھ پونچھے اور رسی کی طرف لپکا۔

۔۔۔۔ اس کی جسمانی حالت قطعی اس قابل نہیں رہ گئی تھی کہ وہ رسی کے سہارے
دیوار میں بنے روشندان تک پہنچ سکتا، لیکن اس لمحے نہ جانے کہاں سے اتنی توانائی اس میں
عود کر آئی کہ اس نے دونوں ہاتھوں سے بڑی مضبوطی کے ساتھ رسی کو تھاما اور دیوار پر
پاؤں ٹیکتا روشندان کی طرف لپکا۔ اور ابھی وہ بمشکل دو تین فٹ ہی اوپر پہنچا تھا کہ اس کے
ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ اسے اپنی کمزوری پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ تاہم رسی کو
ہاتھوں سے پکڑے ہوئے اس نے دو تین لمبے لمبے سانس لیے اور دوبارہ ہمت کر کے اوپر کی
ہمت سر کنے لگا۔ روشندان کے نزدیک اچانک ایک ہاتھ دست سکندری کی طرح نمودار ہوا
اور کسی نے اندر جھکتے ہوئے دوسرا ہاتھ بھی مدد کے لیے اس کی طرف بڑھا دیا۔

شیرو نادم پھولنے لگا تھا اس لیے اس نے اس تائید غیبی کو اپنی خوش بختی جانا اور کسی
کی طرح اپنے دونوں ہاتھ اندر لپکتے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں دے دیئے جنہوں نے
اسے اوپر کھینچنا شروع کر دیا۔ دیوار سے رگڑ کھاتا وہ اب روشندان تک پہنچ گیا تھا جس کی کوہ
میں اس کی مدد کو آنے والے نے نکل کر اس کے باہر نکلنے کے لیے راستہ بنا دیا تھا۔

وہ سرے ہی لیے وہ روشندان سے ہو کر باہر آ گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک
وں اندر چھپے ہوئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ ہی نیچے کود گیا۔ وہ ایک
کی

شیرو کو توقع تھی کہ وہ اس سے بڑی بڑی باتیں کرے گا، لیکن وہ
وں کے۔ لیکن یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ وہاں صرف ایک گھوڑا
اس کے پاؤں زمین سے لگتے ہی اس کا ہاتھ کاٹھ کے ایک طرف لٹکے ہوئے
شیرو کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے انعام کی تعمیل کرنے والے
ظاہر تھی کہ اسی شخص نے اسے قید سے رہائی دلائی ہے، لیکن اس نے
رہا تھا۔ شیرو ایک طرح سے اس کے ساتھ گھسٹ ہی رہا تھا۔ راستے میں جب اس نے ایک
مرتبہ اس کا ہاتھ جھٹکنا چاہا تو نوواردو نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔
اب وہ لوگ تھانے سے قریباً آدھ میل دور پہنچ چکے تھے۔

"اب تم اصل خاموشی سے میرے ساتھ چلتے آؤ۔" نووارد نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

شیرو چونکا۔ اسے یوں لگا جیسے اس سے پہلے بھی اس نے کہیں یہ آواز سنی ہے، لیکن
کہاں؟ اسے یاد نہ آ سکا۔

"کیا تم حسین خان کے ساتھی ہو؟" اس نے چلتے چلتے ہانپتے ہوئے نووارد سے پوچھا
کیونکہ تیز چلنے سے اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔

"جلد ہی تمہیں تمام سوالات کا جواب مل جائے گا۔" نقاب پوش نے اس کی طرف
دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔

اب وہ لوگ اس پہاڑی سلسلے میں داخل ہو رہے تھے جو تھانے سے تقریباً دو ڈھائی
میل دور واقع تھا اور جس کے چاروں اطراف گھنا اور گنجان جنگل پھیلا ہوا تھا۔ جنگل میں کچھ
دور جانے کے بعد شیرو بے دم سا ہو گیا اور ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے
قدم من من کے ہو رہے تھے۔ "مجھ سے اور نہیں چلا جاتا۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"اٹھو۔ شاباش! ہمت کرو۔ تھوڑی دور اور چلنا ہے۔" نقاب پوش نے اس کی ہمت
بندھائی۔

شیرو نے درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہونا چاہا لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اسے
اپنی بزدلی پر غصہ تو بہت آیا، لیکن وہ بمشکل چند قدم چلنے کے بعد لڑکھڑا کر گر پڑا۔

HBC

زوار و سلیب پر فن نے اسے زمین پر لٹا لیا کہ اس نازک بدن مخصوص انداز سے وار
کہ بیک وقت محسوس ہو کہ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ اپنے قدموں پر اٹھ کر کھڑا ہو گا اور گلہ تم
نے اس کی بغل میں ہاتھ دے کر اسے سہارے سے آگے اچھالا اور پھر گھٹنے کے اس
انتہائی آخر ایک بازی لینے میں ایک انتہائی محفوظ اور قدرتی غار کے کنارے پر اور

☆○☆

چاند کی روشنی میں اردگرد کا سارا ماحول دھندلی دے رہا تھا۔

—— شیرو نے غار کے کونے پر کسی عورت کو مجسمہ ریز دیکھا اور جب عورت نے
مجسمے سے سر اٹھایا تو پتہ چلا کہ وہ اس کی ماں تھی۔ شیرو کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھ
ہاتھ سن گئے اور وہ اٹھ کر دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی۔
ماں کی پر شفقت آغوش سے باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے وہی سنتری
کھڑا ہے جو اسے چوری چھپے کھانا دیا کرتا تھا۔

"تت —— تم ——" وہ حیرت اور تشکر کے ملے جلے تاثرات سے ہکلایا۔

"ہاں میں۔ سہاول نام ہے میرا۔ تمہارا چچا مجھے جانتا ہے۔" سنتری نے ہنسنے پر سکون
لہجے میں اپنا تعارف کروایا۔

"لیکن وہ پیغام ——"

"وہ میں نے ہی حسین خان کی طرف سے تمہارے لیے لکھا تھا۔ مجھے علم تھا کہ رات اگر میں تمہاری مدد بھی کرنا چاہتا تو تم اسے دشمن کی کوئی چال سمجھ کر کبھی آمادہ نہ
ہوتے۔" سہاول نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تم نے بہت بڑا احسان کیا ہے مجھ پر —— بہت بڑا احسان۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا
تھا میں نے ....." وہ بے اختیار سہاول سے لپٹ گیا۔

"نہیں شیرو۔ تم ٹھیک تھے۔ تمہیں میرے متعلق یہی رائے قائم کرنی چاہیے تھی۔"
اس نے آہستگی سے شیرو کو خود سے الگ کر دیا۔

ان کی گفتگو سن کر زہراں اور لالہ بھی باہر نکل آئے۔ دونوں کی آنکھیں تشکر کے
آنسوؤں سے بے اختیار چھلک پڑیں۔ طلوع سحر تک وہ لوگ باتیں کرتے رہے۔ شیرو کو
اپنے زخموں کا جیسے احساس ہی نہیں رہا تھا۔ ان لوگوں کی زبانی شیرو کو علم ہوا کہ بے بے فضہ
اپنی ایک قریبی رشتہ دار کے گھر چلی گئی تھی۔ وہ لوگ پاکستان جانے کی تیاریاں کر
رہے تھے۔ اب معلوم نہیں بے بے ان کے ساتھ ہے یا پاکستان چلی گئی۔

"ایک بات سمجھ نہ آئی۔" سہاول نے کہا۔ "پہلے وہ سنتری ——"

"ہاں اصل میں پہلے کی کوشش نہ کرو
میں کی ماں کے بیٹے ہم عمر بھی ہیں اور نہ وہ
میں کہہ کی بات سمجھ گیا ہوں۔" شیرو نے
ہاں۔"

"ایک تو تمہاری دوستی ملامت ہی اس محل میں تم پر
میں سے کسی کی گرفتاری ہم سب کو مروا دے گی۔" سہاول نے کہا
"میرا ایک کام ضرور کرنا سہاول۔" شیرو نے التجا کی۔

"کیا؟"

"کسی طرح مجھے شرفو سے ملا دو۔"

"اس بات کا کبھی تصور بھی نہ کرنا۔ تمہاری ملاقاتیں صرف راز دار ہی نہیں ہیں۔ تم ہے
تمہارے ساتھیوں تک تمہاری سلامتی اور غایت ہو پیغام پہنچ جائے گا۔" سہاول نے
کہہ دیا۔ آنکھوں میں جھانکا۔

اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

شیرو کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے گردن جھکا کر سہاول کی بات پر صاد کر دیا۔

"میں معافی چاہتا ہوں دوست لیکن ابھی مجھے بہت کام کرنا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ
میں مشن مکمل ہونے سے پہلے مارا جاؤں یا رام سنگھ کی نظر میں آ جاؤں۔"

"تم واقعی عظیم انسان ہو۔" شیرو نے اس کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر
جوش جذبات سے دباتے ہوئے کہا۔ "اندر ضرورت کی ہر شے موجود ہے۔ میں تم سے مزید
بھی نہیں رہوں گا۔ فی امان اللہ۔" کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

"فی امان اللہ" شیرو کی ماں کے دل سے سہاول کے لیے صدا بلند ہوئی۔

☆○☆

تھکاوٹ اور غصے سے وہ پھٹا جا رہا تھا۔ حریت پسندوں کی طرف سے مسلسل اور بھرپور
نفسیاتی حملوں نے اسے ذہنی مریض بنا ڈالا تھا۔

—— میجر رام سنگھ ہر ایک کو کاٹنے کو دوڑ رہا تھا اور اپنے اس غصے اور بے بسی کا بدلہ
لینے کے لیے لے دے کے اسے اگر کوئی نظر آتا تھا تو وہ شیرو تھا —— صرف شیرو۔"

"شیرو کو پیش کرو۔" اس نے علی الصبح اپنے کمرے میں پہنچتے ہی دروازے کے پاس
موجود سنتری کو حکم دیا۔ غصے سے وہ اپنے ہونٹ چبا رہا تھا اور دائیں ہاتھ میں چھڑی

[illegible] کو [illegible] ہوا [illegible] ہوا [illegible] ہوا

[illegible] کسی باہر سے بھی نے [illegible] اضیان سے اس [illegible] دان [illegible]

رام سنگھ کی طرف سے [illegible] [illegible]

صدمہ کی شدید کی وہشت [illegible] [illegible]

وہشت ناکی سے اسے اب [illegible] [illegible]

خارج ہونے والی ہوائی [illegible] [illegible]

[illegible] رقعہ لاش کے ساتھ رکھا تھا۔ "[illegible]

رام سنگھ نے کسی سحر زدہ معمول کی طرح رقعہ ہاتھ میں [illegible]

جانے کا احساس ہونے لگا تھا۔ "لاش ایک [illegible]

نے مرد سی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"بیٹ! کہاں ہے؟" رام سنگھ کو یہ تین الفاظ ادا کرنے کے لیے اپنی قوت ارادی کو

بروئے کار لانا پڑا۔

"چھاؤنی کے نزدیک پہاڑی سلسلے میں ایک ویرانی جگہ پر لاش [illegible] تھی۔ [illegible]

اس کے سرہانے ایک پتھر کے نیچے رکھا ملا تھا۔ اس وقت تک [illegible]

اسے رات کے آخری پہر گولی ماری گئی ہے۔ میں نے فوراً [illegible]

پھیلا دی ہیں، لیکن ان کی طرف سے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی۔"

"ہوں" میجر رام سنگھ نے لمبی سانس لی۔

وہ مزید کچھ کہے بغیر پلٹا اور بوجھل قدموں سے اپنی جیپ تک آگیا۔ جیپ کے بونٹ سے ٹیک لگا کر اس نے رقعہ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

"رام سنگھ!

تمہارا دور اب ختم ہو چکا ہے۔ آج جس انجام سے یہ بھیڑیا دوچار ہوا ہے، تم بھی بہت جلد اسی انجام کو پہنچنے والے ہو۔ تمہارے جرائم کی فہرست بھی اس کی طرح بہت لمبی ہے اور ہماری ہائی کمان نے تمہارے لیے سزائے موت کا حکم جاری کر دیا ہے۔ کل تک اگر تم نے آزادی کشمیر کے جرم میں گرفتار شدہ تمام مظلوموں کو رہا نہ کیا تو اپنے بھیانک انجام کو پہنچو گے۔ مجاہدین کی رہائی کی صورت میں ہم تمہیں پونچھ سے بحفاظت نکل جانے کا موقع فراہم کر دیں گے دوسری صورت میں یاد رکھنا، پونچھ تمہارے لیے موت کا

کو جس نے اب [illegible] کی [illegible] تھی، [illegible] بھر مسلمان [illegible]

اتحاد کر [illegible] اگر یہ لوگ [illegible] تو [illegible] کر ان کا [illegible]

سرداریاں سب کچھ ان سے [illegible] لیں گے۔"

"لیکن نہیں ——!" کوئی [illegible] طاقت اسے [illegible] دینے لگی۔ [illegible]

درخت کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ بڑی اور تنک کشمیری مسلمانوں کے دل و دماغ میں [illegible]

ہیں۔ بس یہ تو وقتی ابال ہے جیسے ہی ایک مرتبہ پھر وہ لوگ اپنی مکارانہ فریب کاریوں [illegible]

لے کر ان کی طرف بڑھے، یہ سادہ لوح سے مسلمان دوبارہ اس میں پھنس جائیں گے [illegible]

نہ کوئی مجاہد باقی رہے گا نہ آزادی کی تڑپ۔ ایک نہ ایک روز یہ کھیل پاکر ختم ہو [illegible]

جائے گا۔"

جیپ پونچھ چھاؤنی کے باہر آکر ٹھہر گئی —— اسے پہچان کر ڈیوٹی پر موجود [illegible]

نے سیلوٹ اوپر اٹھا کر جیپ کو راستہ دے دیا۔ مجاہدین کے تمکنت حملے اور ریاست میں [illegible]

مسلسل چھاپہ مار کارروائیوں نے مہاراجہ کے تمکنواروں کو خاصا چوکنا کر دیا تھا اور [illegible]

پونچھ میں تو فوج نے زبردست حفاظتی اقدامات کیے ہوئے تھے۔ چھاؤنی کے نزدیک کسی [illegible]

پھٹکنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ پچھلے آٹھ دس روز میں وہ پندرہ بیس مشتبہ شہریوں کو [illegible]

گولیوں کا نشانہ بھی بنا چکے تھے اور چھاؤنی کے او۔سی کا حکم تھا کہ کسی فوق البشر کو بھی [illegible]

شناخت حاصل کیے بغیر اندر داخل نہ ہونے دیا جائے، لیکن میجر رام سنگھ اس حکم سے مستثنیٰ [illegible]

تھا۔ کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اسے روک کر اس کی شناخت دریافت کرتا۔

چھاؤنی کے داخلی دروازے کے ایک کونے میں بنے کمروں کے سامنے اس نے ڈرائیور کو جیپ روکنے کا اشارہ کیا جہاں فوجیوں کے ہجوم میں اسے بوڑھے او۔سی ڈوگرے کا چہرہ نمایاں نظر آیا۔

جیپ سے اتر کر وہ تیز رفتاری سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا او۔سی تک جا پہنچا۔ وہاں موجود فوجیوں کا ہجوم اسے دیکھتے ہی چھٹ گیا تھا۔ او۔سی کے سامنے ایک سٹریچر پر لاش دھری تھی جس پر سرخ کمبل ڈال کر اسے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ میجر رام سنگھ نے غیر اختیاری طور پر آگے بڑھ کر اس کا چہرہ ننگا کیا تو ایک سنسناہٹ سی اس کے رگ و پے میں سما گئی اور برقی رو جیسی تیزی سے اس کے دل و دماغ میں دوڑنے لگی۔

اس کے سامنے لالہ مہاویر پرشاد کی لاش دھری تھی۔ دل کے مقام پر صرف ایک سوراخ تھا جس سے بہنے والا خون اب کناروں پر جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔ یوں لگتا تھا

بلیغار

[illegible]

[illegible] میں انہاری ایجنسیوں کے تعاون سے دل میں صدارتی تحریک [illegible]
[illegible] کی پارلیمنٹ میں موجود ہے غور سے اس بیان کو سن رہے تھے۔

"معزز سامعین! مستقبل میں کشمیر کا مستقبل پنڈت نہرو کے لسوادار کی تجاویز سے ملاری گواز [illegible] دی ہے۔ "مشرقی پنجاب کے شہروں خصوصاً جالندھر اور لدھیانہ میں ۱۹۴۷ء کے فسادات [illegible] ہیں۔ سارے بھارت کے خصوصاً ریاست جموں و کشمیر کے مسلمانوں میں زبردست بے چینی پائی جاتی ہے۔ کشمیر میں مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں سے بہت زیادہ ہے اور اب وہ سوچنے لگے ہیں کہ اگر ریاست کا الحاق بھارت سے ہو گیا تو ان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔"

پونچھ میں ہونے والے خون ریز ہنگاموں اور مسلمانوں کی مسلح کارروائیوں کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے شیخ عبداللہ نے کہا:

"ریاستی حکومت کی انتظامی غلط اور غیر دانش مندانہ پالیسیوں کی وجہ سے پونچھ میں مسلمانوں نے حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھا کر مسلح جدوجہد شروع کر دی ہے۔ ان لوگوں نے ماضی میں مہاراجہ اور اس کے نوابیوں خصوصاً مقامی حکمرانوں کے ہاتھوں بڑے مظالم کا سامنا کیا۔ بیداری کی جو ایک لہر سارے ہندوستان میں دوڑ گئی ہے' اس کے اثرات یہاں بھی پہنچے ہیں۔ پونچھ کے لوگ ہمیشہ سے آزادی پسند اور بہادر کہلاتے آئے ہیں۔ انہوں نے مایوسی سے مایوس ہو کر اب ہتھیار اٹھا لیے ہیں۔ پونچھ میں فوج کی آمد اور کارروائیوں نے ان لوگوں کے اشتعال میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

پونچھ کے زیادہ تر لوگ ایڈین آرمی کے سابق فوجی ہیں اور ان کی رشتے داریاں راولپنڈی اور جہلم میں ہیں۔ یہ لوگ اپنے بیوی بچوں کو سرحد پار چھوڑ کر وہاں سے اسلحہ

HBC

[illegible] ہوائے فوج کے افسر نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اسٹیورڈ کی طرف دیکھا۔

"اپنے دونوں سے کہو وہ فوراً" رن وے کو کیمرے میں لے کر ہوشیار ہو جائیں۔ یہ کوئی پاکستانی چال ہے۔" اس نے بجائے ریاستی افسر کے سوال کا جواب دینے کے اسٹیورڈ سے کہا۔

کسی پہاڑی پوسٹ سے پیغام آ رہا تھا۔ "ہم نے ابھی ایک جہاز کو پرواز کرتے ہوئے سری نگر کی طرف بڑھتے دیکھا ہے۔ اوور۔"

"کوئی شناخت ——— اوور۔"

"کوئی نہیں۔ اس نے لائٹیں بھی آف کر رکھی ہیں۔ اوور۔" جواب ملا۔

"او۔کے ——— اوور اینڈ آؤٹ۔"

آپریٹر نے کانوں پر چڑھا ہیڈ فون اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ ریڈیو سے بلند ہوتی آواز چونکہ سب کو بخوبی سنائی دے رہی تھی' اس لیے آپریٹر نے کسی کو خود بتانا بھی نہیں جانا ——— انہوں نے خود ہی سب کچھ جان لیا تھا۔

"کون ہے یہ؟" ریاستی فوج کے افسر نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اسٹیورڈ کی نظروں سے بھارتی افسر کی طرف دیکھا۔

"اپنے دونوں سے کہو وہ فوراً" رن وے کو کیمرے میں لے کر ہوشیار ہو جائیں۔ یہ کوئی پاکستانی چال ہے۔" اس نے بجائے ریاستی افسر کے سوال کا جواب دینے کے اسٹیورڈ سے کہا۔

کسی پہاڑی پوسٹ سے پیغام آ رہا تھا۔ "ہم نے ابھی ایک جہاز کو پرواز کرتے ہوئے سری نگر کی طرف بڑھتے دیکھا ہے۔ اوور۔"

"کوئی شناخت ——— اوور۔"

"کوئی نہیں۔ اس نے لائٹیں بھی آف کر رکھی ہیں۔ اوور۔" جواب ملا۔

"او۔کے ——— اوور اینڈ آؤٹ۔"

آپریٹر نے کانوں پر چڑھا ہیڈ فون اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ ریڈیو سے بلند ہوتی آواز چونکہ سب کو بخوبی سنائی دے رہی تھی' اس لیے آپریٹر نے کسی کو خود بتانا بھی نہیں جانا ——— انہوں نے خود ہی سب کچھ جان لیا تھا۔

"کون ہے یہ؟" ریاستی فوج کے افسر نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اسٹیورڈ کی نظروں سے بھارتی افسر کی طرف دیکھا۔

"اپنے دونوں سے کہو وہ فوراً" رن وے کو کیمرے میں لے کر ہوشیار ہو جائیں۔ یہ کوئی پاکستانی چال ہے۔" اس نے بجائے ریاستی افسر کے سوال کا جواب دینے کے اسٹیورڈ سے کہا۔

کسی پہاڑی پوسٹ سے پیغام آ رہا تھا۔ "ہم نے ابھی ایک جہاز کو پرواز کرتے ہوئے سری نگر کی طرف بڑھتے دیکھا ہے۔ اوور۔"

"کوئی شناخت ——— اوور۔"

"کوئی نہیں۔ اس نے لائٹیں بھی آف کر رکھی ہیں۔ اوور۔" جواب ملا۔

"او۔کے ——— اوور اینڈ آؤٹ۔"

آپریٹر نے کانوں پر چڑھا ہیڈ فون اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ ریڈیو سے بلند ہوتی آواز چونکہ سب کو بخوبی سنائی دے رہی تھی' اس لیے آپریٹر نے کسی کو خود بتانا بھی نہیں جانا ——— انہوں نے خود ہی سب کچھ جان لیا تھا۔

"کون ہے یہ؟" ریاستی فوج کے افسر نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اسٹیورڈ کی نظروں سے بھارتی افسر کی طرف دیکھا۔

"اپنے دونوں سے کہو وہ فوراً" رن وے کو کیمرے میں لے کر ہوشیار ہو جائیں۔ یہ کوئی پاکستانی چال ہے۔" اس نے بجائے ریاستی افسر کے سوال کا جواب دینے کے اسٹیورڈ سے کہا۔

اور ہی اس بات کی تلاش کے لیے نکلی تھی کہ عملاً صلاح الدین کی مدد کر رہا ہے
حریم ملک سے پہلے ہی بریگیڈیئر سرگل مسلم، کرنل شے کے خاص معتمد اور
کا اور جدلی فوج کے افسران کی اس لابی میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مقامی باشندوں
اکثر جدلی کا خواب پورا کرنا چاہتی تھی۔

صلاح الدین کے حملوں سے اتنا خوفزدہ تھا کہ وہ اسٹک سے اس معرکے
بلیک ہی شہ کر پایا تھا۔ جس کے بعد سرگل صلاح الدین کے
اور مدد مانگنے پر وہ جدلی نے پاکستان کے مطابق صلاح الدین نے جدلی سے باقاعدہ
کے خلاف فوجی مدد کی درخواست کی تھی۔

ستلوج اپنے بچنے میں لیے وہ بریگیڈیئر سرگل علی الصبح پالم پور کی طرف روانہ ہوا تھا
تھا جہاں اس کی واپسی کا انتظار شدت سے کیا جا رہا تھا۔

☆○☆

جہاول اور شیرو پہاڑی کی ایک قدرتی اوٹ میں کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔

"آپ کھل کر سامنے کیوں نہیں آتے؟" شیرو نے پریشان ہو کر جہاول سے پوچھا
یہ اطلاع اس کے لیے بڑی چکرا دینے والی تھی کہ جہاول کا تعلق کسی بھی گروہ سے
نہیں اور صرف اپنی انفرادی کوششوں سے شیرو' اس کی ماں' زہراں اور اس کے باپ کو بھی
رام سنگھ کے خلافانہ شکنجے سے نکال لایا ہے۔

"ابھی وقت نہیں آیا برخوردار۔" جہاول نے حسب معمول اسے ٹالنا چاہا۔

"کیوں؟"

"تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔ دیکھو شیرو میں تمہیں واپس جانے سے نہیں روکوں
گا۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔۔۔۔ ایک مسلمان اور کشمیری ہونے کے ناطے
میرا فرض تھا کہ میں اپنے کشمیر کے لیے لڑنے والے ایک مجاہد کو جس کے باپ نے اس
مقدس سرزمین کی آزادی کے لیے جان کا نذرانہ دیا تھا' دشمن کی قید سے رہا کروالوں اور
کشمیر کی عزت۔۔۔۔ اس کی عفیفہ اور ماں کو دشمن کے ناپاک ارادوں سے بچالوں
رکھوں ۔۔ اور اگر تم اسے نیکی یا احسان سمجھتے ہو تو میری ایک درخواست ہے کہ ابھی کی
اور میرے متعلق کچھ نہ کہنا۔"

"میں آپ کی بات میں پوشیدہ مصلحت کو تو کچھ نہیں پایا' لیکن آپ کے جذبات
سمجھتے ہوئے آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس راز کو راز ہی رکھوں گا۔ اس وقت تک

جب تک آپ خود اس سے پردہ اٹھانے کی اجازت نہ دے دیں۔"
مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے میری بات سمجھ لی۔ شیرو! تمہاری ماں اور
ہیں۔ اس دنیا میں بدلہ دے سکوں۔ کاش۔۔۔۔!" جذبات نے اسے مزید کچھ کہنے کی مہلت
نہیں دی۔

جہاول نے دیکھا' نوجوان شیرو کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔

"ادھر آؤ۔" اس نے شیرو کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دوسرے کے پیچھے پہاڑی سلسلے سے منسلک کیے جنگل کے اندر داخل ہو
میل تک چلتے چلے گئے۔ ایک جگہ پہنچ کر جہاں گھنے درختوں سے سورج کی شعاعیں بمشکل
گزر کر زمین تک پہنچ سکتی تھیں' جہاول نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اپنے کندھے پر رکھی
کدال سے اس نے ایک درخت کے تنے کے ساتھ تھوڑی سی کھدائی کی اور ایک تھیلا باہر
نکال لیا۔ تھیلا خاصا وزنی تھا۔ شیرو کو اس کی مدد کے لیے آنا پڑا۔ حیرت سے وہ ان سارے
مناظر کو ذہن میں محفوظ کر رہا تھا۔

جب جہاول نے تھیلے کا مضبوطی سے بندھا ہوا منہ کھولا تو شیرو کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی
نہ رہا۔ تھیلے میں موجود دو اسٹین گنیں اور کچھ راکٹ نکال کر جہاول نے شیرو کو تھما دیں اور
تھیلے کا منہ اسی طرح مضبوطی سے باندھ کر اسے زمین میں دفن کر کے مٹی برابر کر دی۔ بہت
احتیاط اس نے خاصی گھاس پھونس اور درختوں کے پتے اس پر ڈال دیئے تھے۔ اول تو یہاں
بھی کسی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' لیکن اگر کوئی آ بھی جاتا تو اسے شک کرنے
کی گنجائش میسر نہ تھی۔

"شیرو!" جہاول نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے مخاطب کیا۔ "ہم لوگ ایک ایسی

HBC

روانگی سے پہلے بزدل اسے چند لمحے کی تنہائی زہراں کے ساتھ میسر آ گئی تھی
زہراں وہاں سے اٹھ کر قریبی احاطہ میں ایک چٹان کے عقب سے ملحقہ سامنے والے حصہ
نگرانی کرنے لگی تھی۔
شیرو سے قدموں چلتا ہوا اس کے پیچھے اس طرح آن کھڑا ہوا کہ
آہٹ کی طرف سے بے خبر رہی۔ بے خبری ہی کے لمحے اس نے جھک کر
اپنے پیچھے کھڑا پایا۔ جانے وہ کب سے اس کے ساتھ بڑے انہماک سے
چٹانوں پر سے پھسلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔
"آپ ۔۔۔" وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔
"ہاں میں ہوں زہراں۔ اچھا ہوا تم اس طرف آ گئیں۔ مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔"
جواب میں زہراں سوائے اپنی چادر کے پلو سے انگلی سلجھانے کے اور کچھ نہ کر سکی
"زہراں میرے پاس کہنے کے لیے بڑی باتیں ہیں۔ جب میں تفتیش کاٹ رہا تھا
وطن مجھے دلوں کی اذیت برداشت کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے کوٹھری میں بھیج
دیا کرتا تھا تو میرے پاس خود کو مطمئن کرنے کے لیے یہ بڑی دلیل موجود تھی کہ
سب کچھ مجھے ملک و وطن کی آزادی کے لیے برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔
لیکن مجھے چند لمحوں کے لیے اگر پرسکون پناہ میسر آئی تھی تو صرف تمہاری یاد
تمہارا جیتا پیکر میرے لاشعور میں رچا ہوا تھا۔ تب میں تمہاری قربت کی حسین مہک کو
محسوس کرتا تھا۔
۔۔۔ آج میں سوچتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ مجھے تھانے میں تمہارے ساتھ پکڑے جانے
قیامت کی خبر ہو جاتی تو میں شاید کبھی نہ سنبھل پاتا۔ زہراں! میں آج جس راستے پر گامزن
رہا ہوں' یہ کوئی نیا راستہ نہیں۔ میرے باپ نے انگلی پکڑ کر مجھے بچپن ہی میں ان راہوں پر
چلنا سکھا دیا تھا۔ آج جب ان کی قربانیاں رنگ لا رہی ہیں اور ساری وادی کے سپوت ملک و
وطن کی آزادی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو ان کی روح کتنی خوش ہو گی۔ خدانخواستہ اگر
میں موت کی اس شاہراہ پر قدم نہ رکھتا تو شاید کبھی روز قیامت اپنے باپ سے آنکھیں نہ ملا
سکتا۔ زہراں! میرے پاس وقت کم ہے۔ حالات نے ہمیں ایسے رشتے میں باندھ دیا ہے جس
سے مفر نہیں اور اگر کبھی اس راہ آزادی میں میری شہادت کی خبر آ جائے تو ان جیالی
بیٹیوں کی طرح جو زندگی بھر کنواری بیٹھی رہتی ہیں' اپنی زندگی ضائع نہ کر دینا ورنہ میری

روح کو بہت دکھ ہو گا۔
وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن وہ کہہ نہ سکا۔ زہراں کی آنکھوں میں
امڈ آنے والے آنسوؤں نے اسے بولنے نہیں دیا۔ وہ خاموش رہا۔
زہراں چپ چاپ آنسوؤں سے اسے نہاتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر
اپنی چادر سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس نے
اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ زہراں نے اس کی انگلی چوم لی۔ وہ جانتی تھی
کہ شیرو کی ماں سے بچھڑنے کے بعد اس نے کبھی کسی عورت کی انگلی نہیں تھامی تھی۔ وہ
اس کی ماں سے بڑھ کر تھی۔ شیرو نے اس کی انگلی چوم لی۔ وہ جانتی تھی
ہی نہیں۔ اس کی باتیں آگے کی سمت پھیل رہی تھیں۔ شیرو نے کہا تھا وہ
آہستہ سے کراہی لیکن شیرو تو کبھی کا جا چکا تھا۔
ایک پہاڑی موڑ سے اس نے اپنی طرف آتا دیکھا تو
"کیا بات ہے بیٹی! تم رو کیوں رہی ہو؟" الہ بخش نے کہا تھا۔
زہراں خاموش رہی۔
۔۔۔ الہ نے اس کے دونوں کندھے پکڑ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ کسی
سانحہ دردناک کے کئے ہوئے تنے کی طرح اس کے سینے سے آ لگی۔ زہراں باپ کے سینے
سے لگی سسک رہی تھی۔ تب الہ کی نظریں پہاڑی احاطہ سے اترتے ہوئے شیرو پر پڑیں
تو اسے خود بخود ساری بات سمجھ میں آ گئی۔
اس نے بیٹی کی پیٹھ تھپک کر اسے خود سے الگ کیا۔ "چپ ہو جا بیٹی نہ رو تو۔۔۔!"
الہ بیٹی کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا اور زہراں سامنے والی پگڈنڈی پر
جاتے اس مسافر پر نظریں جمائے کھڑی تھی جو اسے جدائی کے نئے جذبوں سے آشنائی بخش کر
پسپا کر اس کی حد نگاہ سے دور ہی دور ہٹتا چلا جا رہا تھا۔ پھر اس کے ہونٹ کپکپائے اور
آنکھوں میں تیرتی نمی بوند بوند گالوں پر پھسلنے لگی۔
"خدایا! میرے شیرو کو اپنی امان میں رکھنا۔۔۔!"

موت کی شاہراہ

وہ اسلئے چاند کی راتیں تھیں۔

رات کے دوسرے پہر جب چاند کشمیر کی برفانہ پہاڑیوں کے عقب میں ڈوبنے لے رہا تھا، شیرو اپنا منہ سر کپڑے میں چھپائے ہوئے شہر میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے ایسا راستہ اپنایا تھا جس پر کسی فوجی یا کسی پولیس پارٹی سے اس کی مڈبھیڑ ہونے کا احتمال نہ ہونے کے برابر تھے —— اس کے زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوئے تھے۔ لیکن تین چار روز سے زیادہ لاپرواہیوں کی طرح لیتے رہنا اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا۔ جاول نے خدا جانے کہاں سے جڑی بوٹیاں لا کر اس کے زخموں پر لگائیں جنہوں نے جادو کا اثر دکھایا تھا۔ وہ دن رات میں دو مرتبہ ان لوگوں کی خبر لینے آتا اور ان سب کی خدمت میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ جانے کہاں سے وہ ان کے لیے اتنا گھی اور دودھ لے آیا تھا۔

یہ سارا شہر اور اس کی گلیاں بچپن سے شیرو کے دیکھے بھالے تھے، لیکن آج نہ جانے کیوں وہ خود کو یہاں سے گزرتے ہوئے اجنبی سا محسوس کر رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنے ہی گھر پر ڈاکہ ڈالنے جا رہا ہو۔ چلتے چلتے اچانک وہ ٹھٹک کر رک گیا —— مخالف سمت سے اسے ٹارچ کی روشنی اپنی سمت لپکتی دکھائی دی۔

خطرے کا احساس ہوتے ہی شیرو کے جسم میں برقی رو دوڑنے لگی۔ وہ بغیر آواز پیدا کیے پھرتی سے ایک نیلے کی اوٹ میں ہو گیا جہاں وہ ان لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ آستین گن پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی اور اس نے گن سیدھی کر کے اس سمت اندھیرے میں نظریں گاڑھی ہوئی تھیں جس طرف سے اب بہت سے قدموں کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ اس کی حس سماعت پہلے سے کئی گنا بڑھ چکی تھی۔

اچانک وہ سہم کر رہ گیا۔ ایسے ہی قدموں کی آواز اس کے عقب سے بھی آنی شروع ہو گئی تھی۔ شاید یہاں پہنچ کر دونوں پارٹیوں نے آپس میں رابطہ قائم کرنا تھا اور سوئے اتفاق

ے۔۔ ان ۱۰۰ں ہزار پارٹیوں کے بین الاقوامی میں بھیج کر وہ کیا تھا لیکن
صورتحال کیسی ہا تو وہ خاموشی سے آنے والوں کا لقمہ بن جائے یا متعلقہ والوں سے
ہونے سے پہلے ہی سامنے کی سمت اچانک فائرنگ کر کے خلاء پیدا کرے اور بھاگ جائے
۔۔۔اس کے سامنے پھیلا پہاڑی سلسلہ بھی اپنا دامن پھیلائے اسے سمیٹنے کیلئے
بالکل تیار تھا اور اس سلسلے میں یہاں سے بمشکل ڈیڑھ دو میل دور گھنے جنگل میں اس کے
ساتھی چھپے ہوئے تھے۔

ایک ایک لمحہ اس پر قیامت ڈھا رہا تھا۔ جلد ہی شیرو ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس نے
بھی سے لقمہ اجل بننے کی بجائے بہادروں کی طرح موت سے ٹکرا جانے کا فیصلہ کر لیا تھا
۔۔۔ابھی تک سامنے سے آنے والے نظر نہیں آ رہے تھے۔ شیرو پیچھے کی طرف
سے اضافہ اور چمکتے ہوئے قریباً" بھاگ کر اسی ٹیلے کی نکڑ پر پہنچ گیا جس کے پہلو سے پگڈنڈی
پارٹی کو نمودار ہونا تھا۔ ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگا کر اس نے اپنی بے قابو دھڑکنوں کو
سنبھالا۔ ابھی اس نے اسٹین گن سیدھی ہی کی تھی کہ روشنی کی ایک لکیر اس سے بمشکل دو
تین گز دور ریتیلی نظر آئی۔ اس کے ساتھ کسی کے اونچا اونچا بولنے کی آواز بھی سنائی دی۔
آنے والے مجاہدین کو گالیاں دے رہے تھے جنہوں نے ان کی راتوں کی نیند حرام کر
رکھی تھیں اور انہیں اپنے بستروں سے اٹھ کر کشمیر کی جان لیوا خنکی ہوئی راتوں کے
حوالے کر دیا تھا۔۔۔ شیرو کی انگلی ٹریگر پر جم کر رہ گئی۔ تربیت یافتہ فوجیوں کی طرح اس
نے قریباً" جھکتے ہوئے ایڈوانس کرنے کی پوزیشن بنائی اور نظریں ادھر جما دیں۔ اس کے
عقب میں آنے والی آوازیں بھی اب نمایاں ہونے لگی تھیں' پھر سب جیسے گڈمڈ ہو کر رہ
گئیں۔ دو پولیس والے جنہوں نے رائفلیں اپنے کندھوں پر لٹکا رکھی تھیں' سامنے سے
نمودار ہوئے۔ دونوں کسی بات پر قہقہے لگا رہے تھے جب اچانک ان کے قہقہوں نے موت
کی چیخوں کا روپ اختیار کر لیا۔ شیرو کی اسٹین گن کی لال سرخ زبان باہر نکلی اور الیس
چاٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ آگے کی سمت بھاگا۔

محض پندرہ بیس قدم بھاگ کر اس نے ایک ٹیلے کی اوٹ میں چھلانگ لگائی اور کندھے
سے اسٹین گن لگا کر اس کا رخ مرنے والوں کے ان تین ساتھیوں کی طرف کر دیا' جنہیں
اچانک پیش آمدہ صورت حال نے حیرت زدہ کر دیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے گلے میں
لٹکی رائفلوں کو اٹھا کر فائر کرتے وہ بھی شیرو کی گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔

اچانک فائرنگ اور مرتے ہوئے ساتھیوں کی دلدوز چیخوں نے آنے والوں کو خبردار کیا۔ وہ

تاہم اگر فوجیوں کا کوئی باقاعدہ دستہ ہوتا تو فائرنگ کرنے والا ہوا تھا۔ وہ سمجھ لیتے وہ اچانک
حملے کے مطابق اگر پیچھے ہٹنے کی بجائے فوراً سے آگے بڑھتے تو ممکن ہے وہ اچانک
بچ نکلتے۔ شیرو نے پہلے تو چاہا تھا کہ وہ رک کر مزید پولیس والوں کی راہ میں مزاحمت کی کوشش کرے
لیکن فوراً ہی اسے خیال آیا۔ یہاں ایک لمحے کا توقف بھی اس کی جان لے سکتا تھا۔ ٹیلے کی
اوٹ سے نکل کر وہ پہاڑی سلسلے کی طرف بھاگ اٹھا۔

اچانک اس کے عقب میں کسی طاقتور ٹارچ کی روشنی ابھری اور اگلے ہی لمحے وہ اپنے کسی لاشعوری
عمل کے تحت وہ کریک لگت سائٹنگ والی گھنی جھاڑیوں میں چھلانگ لگا چکا تھا۔ ٹارچ کی
روشنی کے تعاقب میں چلنے والی درجنوں گولیوں میں سے کئی گولیاں اس کے جسم میں پیوست
ہو چکی تھیں۔

فائرنگ کی آواز سے اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اس کا مقابلہ پولیس کی ریزرو سے
بھری ہوئی بھیڑوں سے نہیں' فوجی دستے کے خون آشام بھیڑیوں سے ہے۔ شیرو اپنی
سے چپکا اپنی کہنیوں کے بل بڑی تیز رفتاری سے پہاڑی سلسلے کی طرف رینگ رہا تھا اور ہر
اس نے اپنے عمل میں تیزی پیدا کرنے کے لیے ٹانگیں لگانی شروع کر دیں۔

ٹانگیں لگاتا اب وہ پہاڑی سلسلے میں پہنچ کر قدرے محفوظ ہو چکا تھا۔ اس نے زمین
سے اٹھ کر ایک بڑے پتھر کی اوٹ سے اپنی سمت تبدیل کرتے فوجیوں کا جائزہ لیا اور
ایک جگہ رک کر اطمینان سے ان کی سمت فائرنگ کرتے ہوئے گن کی میگزین خالی کر دی۔
وہ فوجیوں کو جو کسی کارنامے کی توقع پر سیدھے اس کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے'
شیرو نے الٹ کر گرتے اور زمین چاٹتے دیکھا اور بھاگ اٹھا۔ اس نے دوسری میگزین بھاگتے
ہوئے ہی گن میں فٹ کی تھی۔

☆○☆

اب وہ پہاڑی سلسلے کے اندر ہی اندر بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

۔۔۔اپنے تعاقب میں آنے والی گولیاں اور گالیاں اسے بخوبی سنائی دے رہی تھیں'
لیکن جس علاقے میں وہ پہنچ چکا تھا وہاں تو دن کے اجالے میں بھی فوج کی پوری بٹالین اسے
ڈھونڈنے میں ناکام رہتی۔

میجر رام سنگھ کی ظالمانہ تفتیش نے اس کے جسم سے خاصی توانائی نچوڑ لی تھی اور یوں
بھی بھاگتے بھاگتے اب اس کا سانس قدرے پھولنے لگا' لیکن اس نے تھکاوٹ یا کمزوری کے
اس احساس کو خود پر غالب آنے کا موقع نہ دیا اور اس علاقے کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں

اسے اپنے ساتھیوں کی مدد ملنے کی توقع تھی۔

اسولاً" تو اب اس کے تعاقب میں آنے والے فوجیوں کو لوٹ جانا چاہیے تھا کیوں کہ ان پہاڑیوں میں ایک مرتبہ گم ہو جانے کے بعد ان کے یہاں سے واپسی کے امکانات معدوم ہو جاتے تھے' لیکن ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور وہ شیرو کے تعاقب میں گولیاں چلاتے ہوئے آ رہے تھے ـــــ فائرنگ کی آواز تو حسین خان اور اس کے ساتھیوں تک کبھی کی پہنچ رہی تھی' لیکن فائرنگ کرنے والے انہیں اب نظر آئے تھے۔ وہ لوگ اپنی پناہ گاہ سے دو تین فرلانگ کی دوری پر یہاں بیٹھے ہوئے تھے مگر تعاقب سے کیے جانے والے اچانک حملے کا منہ توڑ جواب دے سکیں۔ فائرنگ کی اس آواز نے انہیں چونکا دیا ـــــ!

پہلے انہیں اونچائی سے ایک سایہ اپنی سمت بھاگتا نظر آیا' پھر اس کے تعاقب میں فائرنگ کرنے والوں کے بیولے نمایاں ہونے لگے۔ اس بات کا اندازہ تو انہیں بخوبی ہو چکا تھا کہ ایک شخص بھاگ رہا ہے اور اس کے تعاقب میں فائرنگ کی جا رہی ہے' لیکن جہانداد خان اور حسین خان کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ یہ دشمن کی کوئی چال ہو اور وہ لوگ اس طرح "ڈرامہ" رچا کر اچانک ان کے سروں پر پہنچ جانا چاہتے ہوں۔

"اشرف خان" اس نے اپنے دائیں ہاتھ ایک پتھر کی اوٹ میں کھڑے شرفو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے مخاطب کیا۔ "تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ نیچے اترو اور اس بھاگنے والے کو گھیر کر پکڑنے کی کوشش کرو۔ اگر شک گزرے یا وہ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کرے تو اسے گولی مارنے میں بالکل دریغ نہ کرنا۔" اس نے شرفو کو ہدایات دیں۔

حسین خان کی بات مکمل ہوتے ہی شرفو کے ساتھ چار اور مجاہد پہاڑی کی ڈھلان سے نیچے اتر کر ان راستوں کی طرف بڑھنے لگے جہاں وہ شیرو کو باسانی گھیرے میں لے کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر سکتے تھے۔

"نصیب!" حسین خان نے اپنے ساتھ پیچھے دوسرے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "تم ولی کو جنگل کی طرف روانہ کر دو تاکہ وہ تمام لوگوں کو خبردار کرے' لیکن انہیں سختی سے ہدایت کر دے کہ میرے حکم کے بغیر ایک گولی بھی فائر نہ کی جائے۔ تم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میرے ساتھ ہی آؤ۔ ہمیں ان فوجیوں سے نمٹنا ہے۔"

نصیب اور اس کے پانچ رائفل بردار ساتھی کمانڈر حسین خان کے پیچھے پیچھے پہاڑی ڈھلوان میں غائب ہو گئے جب کہ ولی تیزی سے جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اور ـــــ محض پندرہ منٹ بعد شیرو نے اپنے ساتھیوں کو اپنی طرف پہاڑی ڈھلوان سے نیچے آتے دیکھا۔

ـــــ فائرنگ ایک دم بند ہو گئی تھی اور چند ہی لمحے بعد جانبین کی طرف سے سناٹا چھا گیا ـــــ مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے اس کے ساتھیوں نے تعاقب میں آنے والے سارے کے سارے فوجیوں کو مار ڈالا تھا۔ اب وہ قدرے بے فکر ہو کر بھاگنے کی سست ہونے لگا تھا کہ ـــــ اچانک ایک پہاڑی موڑ مڑتے ہوئے ایک رائفل کی للکار کی صدا اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"ہینڈز اپ!" کسی کی للکار گونجی۔

شیرو نے بڑے اطمینان سے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ اسے یقین تھا کہ یہ اسی کا کوئی ساتھی ہو گا۔

"اپنی گن نیچے پھینک دو اور میری طرف گھومو۔" دوسرا حکم ملا۔

"شرفو! کیوں میری گن کا نقصان کرواتے ہو۔ پہلے ہی بڑی مشکل سے ہاتھ لگی ہے۔" شیرو نے اپنے دوست کی آواز پہچان لی تھی۔

"شیرو ـــــ!" شرفو نے مسرت سے قہقہہ لگاتے ہوئے نعرہ لگایا اور رائفل ایک طرف رکھ کر بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ اس کے منہ سے شیرو کا نام سنتے ہی اس کے ساتھی بھی وہاں اکٹھے ہو گئے اور سب باری باری شیرو سے بغلگیر ہو رہے تھے۔

شرفو شدت جذبات سے دو تین مرتبہ "شیرو! میرے یار! میرے بھائی ـــــ!" کہہ کر اس سے لپٹ چکا تھا اور وہ سب شیرو کو اپنے جلو میں لیے اپنی ایک مخصوص پناہ گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے ـــــ جہاں کمانڈر حسین خان بے چینی سے ان کا منتظر تھا۔

☆○☆

بھارت کے ساتھ معاہدہ کرنے کے بعد اس بات کی پکی امید تھی کہ وہ فوراً اپنی افواج کشمیر روانہ کرے گا۔ مہاراجہ پچھلے دو تین ماہ سے ذہنی مریض بن کر رہ گیا تھا۔ آج بھی جب وہ مہر سنگھ کو رخصت کر کے واپس ہوا تو اچانک بوکھلا گیا' جب اس کے اے ڈی سی نے ٹیلیفون پر اطلاع دی کہ قبائلی پٹھان بارہ مولا کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور ڈوگرہ پلٹنیں ان کے لیے بھیڑوں کے ریوڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

"میرا خیال ہے ہمیں رات کے اندھیرے میں سری نگر سے نکل جانا چاہیے۔" اس نے مہارانی سے کہا۔

دونوں اپنی آرام دہ خواب گاہ میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے تھے
مہاراجہ اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ مہارانی کو آلہ کار بنا کر اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس کا محل سازشوں کا گڑھ بن چکا تھا اور اس سازشی ٹولے کا سرغنہ تھا ـــــ راج گرو!

راج گرو کی شخصیت خاصی پراسرار تھی۔ ایک روز وہ اچانک ہی ڈوگرہ محل میں پجاری رانی سے ٹکرا گیا جس کے بعد سے اسے رانی کے مندر کا خصوصی پروہت مقرر کر لیا گیا۔ اس بات کا علم کسی کو نہیں تھا کہ راج گرو کو کانگریس کے اس خاص طبقے کے لیڈروں کی مکمل پشت پناہی اور سازش کے ساتھ محل کی طرف روانہ کیا گیا تھا' جو ہمیشہ سے مسلمانوں کا دشمن رہا تھا۔

اس طبقے کے لیڈروں کو اس بات کا یقین تو ہو چکا تھا کہ کشمیر کے مسلمان کبھی بھارت کی غلامی میں رہنا پسند نہیں کریں گے۔ یوں بھی اصولاً" اور قانوناً" دونوں طرح سے کشمیر پاکستان کا حصہ تھا' لیکن جیتے جی وہ یہ بات ماننے کو تیار نہ تھے۔ راج گرو اپنی شیطانی ذہنیت سمیت ایک مذہبی رہنما کا لبادہ اوڑھ کر ڈوگرہ محل تک پہنچ گیا تاکہ مہاراجہ کے دل و دماغ، مہارانی کے ذریعے قابض ہو کر اس سے بند و لیڈر شپ کے حسب خواہش اخلاقت جاری کروا سکے۔

روایتی ہندو گروؤں کی طرح راج گرو بھی خفیہ شیطانی قوتوں کا منبع تھا اور اس کی یہی شیطانیت اسے مہاراجہ کے زنان خانے تک لے گئی تھی۔ اس نے مہارانی کے ذہن کو اپنے حصار میں جکڑ رکھا تھا ـــــ کانگریس ہائی کمان کے زیر ہدایت محض دو تین مہینوں میں اس نے رانی کے ذریعے کشمیر کی سیاست کو بالکل ہی نئے رخ پر ڈال دیا اور مہاراجہ سے اس کے خلاف مرضی اقدامات کروا دیئے۔

مہاراجہ ہری سنگھ کا وزیراعظم پنڈت رام چند کاک غیر متعصب ہندو تھا اور اس کی مسلمان افسران اور لیڈروں سے خاصی بے تکلفی تھی۔ اپنی سیاسی بصیرت کے بل بوتے پر اس نے مہاراجہ کو کشمیریوں کے سامنے بھی "غیر متعصب ڈوگرہ مہاراجہ" کے روپ میں پیش کیا ہوا تھا اور کئی سیاسی طوفان اپنے تدبر سے روک رکھے تھے۔

مسلمان افسران سے پنڈت کاک کی دوستی متعصب' ہندو لیڈروں کی نظروں میں' جو کشمیر و بھارت کا اٹوٹ انگ بنانا چاہتے تھے' بہت کھٹکتی تھی۔ انہوں نے پہلے بھی وزیراعظم پر ... مسلمان کی حمایت کرنے کا الزام عائد کیا' لیکن دال گلتی نظر نہ آئی تو رانی کے ذریعہ

مہاراجہ ہری سنگھ کے کان بھرنے جانے لگے۔

زنان خانہ کے پہلی دو تین ملاقاتوں ہی میں رانی کو اپنا "گرو" کر لیا تھا اور وہ ان کا زیادہ تر وقت گروجی کے چرنوں میں ہی گزارا کرتی تھی۔ ایک روز روایت کے برعکس وہ خود ہی چل کر گروجی کے وزیراعظم کشمیر رام چند کاک سے مہاراجہ کے دست راست کرلاٹ تھے' ملاقات کے لیے جانا تھا کہ اسے مہاراجہ کے حکم پر "پاکستان کی دہریہ نمایت" کے الزام میں گرفتار کر کے مقدمہ قائم کر دیا گیا ہے۔

اب راستے کا پتھر ہٹ چکا تھا اور راج گرو کو کھل کھیلنے کے بھرپور مواقع حاصل تھے۔ اس نے اپنی چیلی کو خوب خوب استعمال کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے راجہ کے گرد سے اس کے پرانے اور تجربہ کار ملازمین کو ہٹا کر مسلم دشمن اہلکاروں کا نیا حلقہ قائم کروا دیا گیا۔ یہ لوگ اٹھتے بیٹھتے اسے یہی مشورہ دیتے تھے کہ اگر اس کی نجات کی کوئی صورت ہے تو صرف بھارت سے الحاق میں۔ اسی دباؤ کے تحت مہاراجہ نے بھارت سے الحاق کا اعلان کر دیا۔ گو وہ بعد میں بہت پچھتایا اور اپنے اس فعل کو "پاگل پن" سے تشبیہ دی لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مہاراجہ کو راج گرو نے یقین دلایا تھا کہ اس کی گدی قائم رہے گی اور کشمیر ایک علیحدہ اور آزاد ملک کی صورت میں اس کے زیر نگیں رہے گا۔ اب پروگرام کے دوسرے حصے پر عمل شروع ہوا ـــــ وہ تھا کشمیر میں بھارت کی مسلح افواج کا داخلہ' تاکہ وقت آنے پر وہ بزور اپنا فیصلہ منوا سکیں۔ ونگ کمانڈر مہر سنگھ کی آمد اسی منصوبے کا حصہ تھی اور وہ کامیاب و کامران لوٹا تھا۔

مہاراجہ کے ذہن پر پاکستانی حملہ آور اس بری طرح سے چھائے تھے کہ وہ ذہنی مریض بن کر رہ گیا۔ اس روز جب اسے اے ڈی سی کے ذریعے قبائلی پٹھانوں کے سرینگر پہنچنے کی اطلاع ملی تو وہ بالکل ہی دل چھوڑ گیا۔

"مہاراج جی!" رانی نے بڑے ناز و ادا سے اٹھلا کر اس کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا۔ "دو ایک روز ہی کی تو بات ہے' گرو جی کہہ رہے تھے کہ "شبھ گھڑی" آیا ہی چاہتی ہے۔ بھارتی فوج کو ان کے حساب کے مطابق پرسوں تک پہنچ جانا چاہیے۔"

"جہنم میں گیا تمہارا گرو۔" مہاراجہ نے اسے جھٹک کر خود سے الگ کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ مہارانی نے پہلے تو آگے بڑھ کر اسے روکنا چاہا' لیکن اس کی آنکھوں میں ناچتے شعلے دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔

وہ رات مہاراجہ نے دہشت اور پریشانی کے ملے جلے جذبات کے تحت شراب نوشی اور چل قدمی کی نذر کر دی۔ علی الصبح جب اسے علم ہوا کہ سری نگر سے صرف دس میل کے فاصلے پر واقع بارہ مولا بھی قبائلی پٹھانوں نے فتح کر لیا ہے اور اب وہ لوگ سری نگر کی طرف تیزی سے ایڈوانس کر رہے ہیں تو اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے فوراً" اے ڈی سی کو طلب کیا۔

"یس سر کار!" اس نے ہاتھ باندھ دیئے۔

"فوراً" سفر کی تیاری کرو۔ ہم جموں جانا چاہتے ہیں۔" خود مہاراجہ کو اپنی آواز اجنبی لگ رہی تھی۔

"لیکن مائی باپ....." اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"شٹ اپ! حکم کی فوری تعمیل ہو۔" مہاراجہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"جو حکم مہاراج!" اے ڈی سی سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔

مہاراجہ کے کمرۂ خاص سے وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ باہر نکلا تھا۔ اس کا رخ راج گرو کے خصوصی آشرم کی طرف تھا۔ مندر سے پجاریوں کے پاٹھ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ بھجن کتھا اپنے عروج پر تھی' لیکن اے ڈی سی جانتا تھا کہ راج گرو ابھی بستر استراحت پر موجود ہو گا۔

گرو جی کے کمرے کے باہر کوئی پہرے دار بھی خلاف توقع موجود نہیں تھا۔ مہاراج کا یہ فیصلہ ایک بم کی طرح اے ڈی سی کے ذہن میں پھٹا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس لیے وہ سیدھا یہیں چلا آیا تھا۔ نہ جانے بغیر اطلاع کے آمد کا گرو جی کتنا برا منائیں؟ اس نے سوچا اور ٹھٹکا' لیکن معاملے کی سنگین نوعیت نے اسے ہمت دلائی اور اے ڈی سی نے اچانک بڑھ کر دروازے پر ہاتھ مارا جو اندر سے کھلا ہونے کی وجہ سے کھلتا چلا گیا۔ سامنے راج گرو اپنے چوبی تخت پر نرم اور دبیز ریشم کے گدوں پر ڈھیر ہوا پڑا تھا اور مہاراجہ کی خصوصی باندی کوشلیا اس سے لپٹی "بکتی پراپت" کر رہی تھی۔

"ما۔۔۔۔ ما۔۔۔۔ مہاراج۔" اس کی زبان ہکلانے لگی۔

"شانت بالیکے۔" اس نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ اونچا کر کے سائبان کی طرح یوں بلند کیا جیسے آنے والے نے کچھ دیکھا ہی نہ تھا۔

"تم جاؤ بالیکے۔" اس نے سہمی ہوئی کوشلیا کی کمر پر تھپکی دی۔

کوشلیا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے الٹے قدموں چلتے ہوئے دونوں ہاتھ باندھ کر

مہاراج کو "یس سر کار" اور باہر نکل گئی۔

"بیٹھو!" راج گرو نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں نوخیز اے ڈی سی کے چہرے پر جما دیں۔

اے ڈی سی نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ باندھ کر اسے اس نئی "چوٹ" سے آگاہ کیا۔

راج گرو اس کی بات سن کر خاموش ہو رہا۔ اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ مراقبے کی کیفیت سے بیدار ہو کر اے ڈی سی سے مخاطب ہوا۔ "ٹھیک ہے اس کے حکم پر عمل کرو۔ ہری سنگھ کی ہر طرح سے رکھشا کرنا اپنے پندرہ آدمی ساتھ لے لو۔ خبردار ایک بھی دربار کا آدمی نہ ہو۔ مہاراج کی جان بہت قیمتی ہے۔ اسے ہر صورت ابھی زندہ رہنا چاہیے۔ ہاں اگر وہ پاکستان کی طرف فرار ہونے یا حملہ آوروں سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرے تو اسے فوراً" جان سے مار دینا۔"

"آدیش ہے۔ (ضرور ایسا ہی ہو گا) گرو جی۔" اے ڈی سی نے ہاتھ باندھے اور الٹے پاؤں چلتا کوشلیا کی طرف باہر نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں مسلح محافظوں کی رہنمائی میں مہاراجہ کا قافلہ جموں کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی کار میں دو مسلح باڈی گارڈ ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ لیے بیٹھے تھے۔ کار کے آگے ایک ٹرک ڈوگرہ فوجیوں کا بھرا ہوا چل رہا تھا جس میں لگے طاقتور وائرلیس سیٹ کے ذریعے راستے کی پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔

دو سو میل کا فاصلہ بخیر و عافیت اور راستے میں دم لیے بغیر مسلسل طے کر کے مہاراجہ جموں جا پہنچا۔ اس کے ذہن میں کیا ہے؟ وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ اس بات کا علم کبھی کسی کو نہ ہو سکا۔

مہاراجہ نے سختی سے اس بات کی ہدایت کر دی تھی کہ اس کی آمد کو بالکل خفیہ رکھا جائے۔ اے ڈی سی کو اس نے اپنی خواب گاہ میں طلب کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہاتھ باندھے مہاراجہ کے سامنے کھڑا تھا۔

"اگر کل صبح تک وی پی مینن بھارت سے فوجی مدد لے کر نہ پہنچے تو تم مجھے نیند میں گولی مار دینا۔" مہاراجہ نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔

اے ڈی سی نے کچھ کہنا چاہا' لیکن حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔ بڑا عجیب اور وحشت ناک فیصلہ کیا تھا اس کے مہاراج نے۔

"اب کیا بونگوں کی طرح منہ اٹھائے کھڑے ہو۔ جاؤ۔ شب بخیر!" مہاراجہ نے اسے دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔

HBC

☆○☆

گردش حالات نے جب کشمیر کے ڈوگرہ مہاراجے کو اتنا بے بس اور بے دل کر دیا تھا
وہ مجاہدین کی مسلسل اور منضبط کامیابیوں کے ہاتھوں عاجز اور ذہنی مریض بن کر اس مقام پر
پہنچ چکا تھا کہ اپنے اے ڈی سی کو خود کو گولی مارنے کا حکم دے رہا تھا۔ لیکن ان لمحات میں
وقت کا دھارا بدلا۔ کاتب تقدیر کا قلم ایک نئی نہج اپنا گیا۔ اس کے ساتھ ہی برصغیر کی تاریخ پر
ایک ایسا سیاہ باب رقم ہونے لگا جس نے بعد میں اس خطہ زمین پر بسنے والے کروڑوں
انسانوں کی بدبختی پر مہر ثبت کرنا تھی۔

قبائلیوں کے حملے کے تیسرے ہی روز بھارتی بالائی کمان ایک اہم فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔
کانگرسی لیڈر اس زعم میں مبتلا تھے کہ یہ نوزائیدہ مملکت جس پر یک دم لاکھوں یتیم، بیوائوں
اور لٹے پٹے انسانوں کا بوجھ آ پڑا ہے، جس کا خزانہ بالکل خالی ہے، جس کے حصے میں آئی
والی فوج سمندر کے پار یا برصغیر کے دور دراز کونوں میں پاکستان سے ہزاروں میل دور
کیمپوں میں بے دست و پا پڑی ہوئی ہے، محض چند ہفتوں میں معاشی موت مر جائے گی۔
خود پاکستان کا وجود سلامت رکھنا ہی اس مملکت کے لیے ایک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ کانگرسی
کانگرس لیڈرشپ کے ایوانوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ کمزور جسم،
لیکن فولاد ایسے مضبوط ارادوں کا مالک قائداعظمؒ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے
کہہ رہا ہے کہ کشمیر، دکن اور حیدر آباد ہمارے ہیں اور وہ پاکستان کی سمت اٹھنے والے ہاتھوں
کو کاٹ کر پھینک دے گا۔

پاکستانی افواج کا انگریز کمانڈر انچیف ان کا پروردہ تھا۔ اس کے جیتے جی اس بات کا سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ پاکستانی فوج کشمیر میں داخل ہو، لیکن جنرل طارق کی کمان میں اپنے
مظلوم کشمیری بھائیوں کی مدد کو آنے والے پٹھان اور کشمیری مجاہدین جس تیزی سے کشمیر کے
دارالحکومت کی طرف بڑھ رہے تھے، اس کا کبھی کسی کو گمان بھی نہیں گزرا تھا۔

قبائلی سرفروشوں کی یلغار کے تیسرے ہی روز بھارتی حکمرانوں نے اپنے چیف آف
اسٹاف کو حکم دیا کہ وہ کشمیر میں حملے کا پلان تیار کرے۔

جب مہاراجہ ہری سنگھ حالات سے تنگ آ کر خودکشی کے منصوبے بنا رہا تھا تو سلانوٹہ
میں رہنے والے بریگیڈیئر ٹھاکر کی قیادت میں ایک سو فوج بردار طیارے بھارتی فوجوں
کو سری نگر کی طرف اڑا لے جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ گورداسپور، جالندھر اور
انبالہ کی چھاؤنیوں میں موجود تمام بھارتی فوجوں کو جموں کی طرف بڑھنے اور اس پر

قبضہ کر لینے کے احکامات جاری ہو رہے تھے اور تاریخ کا دھارا بڑی تیزی سے اپنا رخ
بدل رہا تھا۔

☆○☆

میجر رام سنگھ نے بھی گولیاں نہیں کھیلی تھیں، لیکن پے در پے ناکامیوں نے اسے بھی ادھ موا کر دیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ پچھلے مہینے ہو تین
ایسی جگہیں چوری ہوئی تھیں وہ مجاہدین آزادی کے ہاتھ لگ چکی ہیں۔
لاشیں اس کے سامنے رکھی تھیں اور ان کی موت واقعی اسٹین گن کی فائرنگ سے ہی
ہوئی تھی۔ دونوں پٹرول پارٹیوں میں سے صرف ایک خوش قسمت اپنی بربادی کی کہانی سنانے
کے لیے زندہ اس تک پہنچ پایا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ اس نے اپنے افسر کے حکم کی خلاف
ورزی کرتے ہوئے پہاڑی سلسلے میں چھاپہ مار کا تعاقب کرنے کی بجائے چھپ جانے ہی میں
عافیت جانی تھی۔

"——— ایک حملہ آور اور پولیس کی پوری پٹرول پارٹی کا صفایا کر گیا اور ——— اس کے
تعاقب میں جانے والوں کو اس کے پہاڑوں میں چھپے ساتھیوں نے لقمۂ اجل بنا دیا۔" میجر رام
سنگھ کا ذہن صرف ایک ہی سمت راہنمائی کر رہا تھا۔ اس نے سوچا "ناممکن ہے کہ وہ لوگ
اکیلے ہوں۔ ضرور ان کی پشت پناہی پاکستانی فوج کر رہی ہے۔" قبائلیوں کی مسلسل پیش قدمی
کی خبروں نے الگ اس کا برا حال کر رکھا تھا۔ لالہ مہاویر پرشاد اس کے لیے بڑے کام کا
آدمی تھا۔ اس کا سارا نظام جاسوسی لالہ مہاویر پرشاد ہی کے سہارے چل رہا تھا اور اسی کی
کوششوں سے میجر رام سنگھ کو مقامی غدار میسر آئے تھے۔

لالہ مہاویر کے اغوا اور موت کے بعد سے مجاہدین آزادی کی ایسی دہشت ان مقامی
غداروں پر بیٹھی تھی کہ وہ اب تھانے میں آنے سے بھی خوفزدہ رہتے تھے۔ زیادہ تعداد ان
غداروں کی تھی جو قبائلیوں کے آزاد کردہ علاقے کا رخ کر رہے تھے یا پھر سری نگر اور جموں
کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میجر رام سنگھ کو ایک خوف اندر ہی اندر سے کھا رہا تھا۔ اس نے
سوچا یہ بھی تو ممکن ہے کہ اگر اس نے مجاہدین آزادی کی دی ہوئی وارننگ کو نظرانداز کر
دیا تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کر گزریں۔

وہ تو شیرو کے فرار اور لالہ مہاویر پرشاد کی لاش ملنے کے فوراً بعد ہی یہاں سے کسی
اور جگہ تبادلہ کروا کے جا چکا ہوتا، لیکن اس کے لاشعور میں لگی انتقام کی آگ اب اس کے
شعور کو بھی جھلسانے لگی تھی۔ وہ صرف انتقام کے لیے یہاں رکا ہوا تھا۔ زہراں کے اغوا،

شیرو کے فرار اور لالہ صلاح کی موت کا انتقام ——!

اس سے پہلے اس نے کبھی اپنے لیے خصوصی حفاظتی انتظامات نہیں کیے تھے' لیکن اب وہ اس سلسلے میں خاصا محتاط ہو گیا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا' تین چار سپاہی و نوکر ہر وقت حفاظت کے لیے اس کے ہمراہ ہوتے۔ ایک بات کا تو اسے پکا یقین تھا کہ اس تمام سلسلے میں اندر بھی مجاہدین کا کوئی نہ کوئی ہمدرد ضرور موجود ہے —— اسی کی مدد سے الوہاں نے زہراں کو اغوا کیا اور شیرو کو فرار کروا دیا ہے۔ اس بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے کہ شیرو بغیر کسی "اندرونی امداد" کے وہاں سے فرار ہو سکتا۔

میجر رام سنگھ کا پونچھ میں اب صرف ایک ہی کام باقی رہ گیا تھا کہ وہ آستین کے سانپ کو ڈھونڈے اور اسے اذیتیں دے دے کر اپنے ہاتھوں مار ڈالے۔ یہی عزم تھا جس نے رام سنگھ کا حوصلہ بڑھائے رکھا۔ اس نے تمام معاملے پر براہ راست نظر رکھنے کا فیصلہ کیا تو اور بجائے کسی اور کو شامل کرنے کے اکیلے ہی اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس نے باری باری تمام پولیس ملازمین کو جن میں بلبند سنگھ اور ڈوگرے بھی شامل تھے' علیحدہ علیحدہ اپنے پاس بلا کر ان سے گفتگو کی تھی۔ اس نے کمال مکاری سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کو یہ اظہار ہی نہ ہونے دیا کہ اسے کسی پر کسی قسم کا شک ہے —— اور اپنی طویل تفتیش کے بعد اس کے ذہن نے جن مشتبہ آدمی کی نشاندہی کی تھی' ان میں سے ایک سجاول بھی تھا۔ میجر رام سنگھ نے انتہائی معتمد اور خصوصی آدمیوں کے ذریعے ان لوگوں کے معمولات چیک کیے تھے۔ خود بھی مختلف بھیس بدل کر باری باری ان لوگوں کی نگرانی کی تھی —— جب سجاول کے متعلق اسے خبر ملی کہ اس کے بچے تو تقسیم ملک کے اعلان سے پہلے ہی پاکستان پہنچ چکے ہیں تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"جناب کیا عرض کروں!" جب میجر رام سنگھ نے کمال مکاری سے اپنے چہرے کے تاثرات بدل کر بڑے معصوم سے لہجے میں سجاول سے اس کے بیوی بچوں کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بلا کسی جھجک کے ہنستے ہوئے کہا۔ "میری گھر والی کا دنیا میں اگر کہیں دل لگتا ہے تو صرف اپنی ماں کے گھر۔ پھر یہ بھی تو دیکھئے سرکار کہ آخر میری تنخواہ میں ذرا سب کا گزارا کیسے ممکن ہے؟"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" رام سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے گھریلو معاملات میں مداخلت نہیں کر رہا۔ میں تو محض حالات کے پیش نظر کہہ رہا تھا۔ ایک لحاظ سے تم نے اچھا ہی کیا کہ بچے پاکستان بھیج دیے۔ سرکاری ملازمین کو تو یہ لوگ معاف کرتے ہی نہیں۔ ذرا

امن ہو جائے تو ان کو لے آنا۔"

"ٹھیک ہے سرکار۔" سجاول نے بڑے انکسار سے سر جھکا دیا۔

اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ میجر رام سنگھ نے اس پر یہ الزام کیا ہے۔ شام کو اپنی ڈیوٹی ختم کر کے جب وہ بارک میں پہنچا تو اسپیشل سیکرٹری نے اسے اطلاع دی کہ آج اس کا تھانے میں رات گزارنا ضروری نہیں۔ اگر وہ چاہے تو اپنے گھر بھی جا سکتا ہے۔ "پچھلے آٹھ دس روز سے ان لوگوں کو انتہائی خفیہ طریقے سے تھانے کے پچھلے حصے میں رہنے کا پابند کر دیا گیا تھا کیونکہ ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد بھی کسی بھی وقت کوئی ایمرجنسی پیش آ سکتی تھی۔

اکثر انہیں آدھی رات کو سوتے سے اٹھا کر "ایمرجنسی ڈیوٹی" کا طلب کر لیا جاتا تھا۔ آج جب انسپکٹر میر نے اسے رات کی چھٹی کا مژدہ سنایا تو وہ اپنے گھر کی طرف چل دیا جس کی بغل اس نے پچھلے تین چار روز سے نہیں دیکھی تھی۔ ان چار پانچ دنوں میں گو کہ وہ رات کو تھانے میں سوتا رہا تھا' لیکن اس نے اپنے مہمانوں کو فراموش نہیں کیا تھا۔ وہ ہر شام یا دن کے کسی بھی حصے میں کسی نہ کسی بہانے ان تک پہنچ جاتا' لیکن یہ ملاقات انتہائی مختصر ہوتی تھی۔

سجاول ضروریات زندگی انہیں مہیا کرتا' وہ چار بھرے حوصلہ قائم رکھنے کو کہتا' مجاہدین اور قبائلی پٹھانوں کی سرفروشانہ یلغار کا ذکر کرتا اور رخصت ہو جاتا۔ ایک آدھ مرتبہ لالہ نے اسے کہا بھی کہ مجھے شہر تک ہو آنے دو' بھلے رات کے اندھیرے ہی میں سہی' لیکن سجاول نے سختی سے روک دیا۔ اس نے لالہ کو صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے کبھی بھولے سے بھی اس کمین گاہ سے باہر قدم رکھا تو اپنے ساتھ ان کو بھی لے ڈوبے گا۔

☆○☆

تھانے سے باہر نکلتے ہوئے آج اچانک ہی اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ فوجی کنوائے والے میدان سے پہلے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا تھا' شاید اسے کوئی بات یاد آ گئی یا اپنے کسی لاشعوری فعل کا محتاج ہو کر اس نے یہ عمل دہرایا تو فوجی کنوائے کے نیموں کے عقب سے سپاہی منوہر لال کے چہرے کی ایک جھلک دکھائی دی جو اسے دیکھتے ہی دوبارہ غائب ہو گیا۔ سجاول ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے لاشعور میں دبے خدشات انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے لگے۔ "رام سنگھ کے پاس اس کی طلبی ——!" وہ چونک پڑا۔

—— اگرچہ اکیلے اسی کو طلب نہیں کیا گیا تھا' لیکن منوہر لال جیسے "کار خاص" کے

[illegible]

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء:

[illegible]

[illegible]

مہاراجہ کشمیر جس نے بزعم خویش ۱۹۴۷ء کو کشمیری عوام کی قسمت کا فیصلہ کن [illegible]
شروع کر دیا تھا اور جس نے گھر کے ایک کونے پر بھارت سے الحاق کی تحریر لکھ کر [illegible]
راجستھ میں اپنے لڑاکو ہندو سکھاشاہ کو منعقد ہونے سے محفوظ کر لیا تھا' لیکن اس کے فیصلے
کو کشمیر کے لاکھوں شہریوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے قیام پاکستان کا اعلان ہوتے
ہی مہاراجہ کے خلاف ہتھیار اٹھا کر اپنی نفرت کا علم کھلا اظہار تو کبھی کا کر دیا تھا' لیکن وہ
خوش فہمی یا خلا فہمی جس کا شکار مہاراجہ ہری سنگھ اور گروہ ہو چکا تھا' اب تک ہوں کی توں
قائم تھی۔ جب ریاست میں اس کے اس فیصلے سے نفرت کا اظہار کرنے کے لیے عوام سڑ
آزادی اٹھائی تو اور گروہ محل کی بنیادیں لرزنے لگیں۔

مہاراجہ ہری سنگھ کو شدت سے اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ راج گرو کی مدد سے چلی
جانے والی سازش اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔ وہ پچھتایا ضرور تھا' لیکن اب وہ پچھتاوا بے سود تھا
کیونکہ ۲۷ اکتوبر کی صبح اپنے جلو میں ۳۳۰ فوجیوں کا ایک لشکر بھی لے کر آ رہی تھی۔
فوج بردار طیاروں کے ذریعے سری نگر کے ہوائی اڈے پر اتر کر مورچہ سنبھال چکا تھا۔ اس
کے ساتھ ہی بھارتی فضائیہ بھی حرکت میں آ گئی۔

اسی روز سردار ابراہیم خان کی زیر قیادت کشمیر کے آزاد کرائے گئے علاقوں میں نئی
حکومت کا قیام عمل میں آ گیا' جس کے ساتھ ہی ہندوستان کی طرح کشمیر بھی دو حصوں میں
بٹ کر رہ گیا۔

اسی روز پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خانؒ نے لاہور میں اکابرین ملت کا ایک
خلیت اہم اجلاس اس ضمن میں طلب کیا کہ اب اس نئی اور سنگین پیدا شدہ صورت حال
سے کیسے نمٹا جائے۔ دیگر بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری نمائندوں کے علاوہ اس اجلاس
میں جنرل طارق نے خصوصی شرکت کی۔ کشمیری مسلمانوں کو جبر و استبداد کے نوکیلے پنجوں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ی ہاتھ ثابت کر دیا کہ محکمہ حکومت کی اجازت نہ دینے کے باوجود بھی پکہ
قبائلیوں نے جموں پر خود سے حملہ کر دیا' لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ اس کے بعد باقاعدہ
باقاعدہ فوج کی جنگ بھی کشمیر کے مختلف محاذوں پر بھارتی فوج سے ہوئی' لیکن پاکستان
پاکستان پر کھلا حملہ کرنے کی کوشش نہ کی۔

جموں ایک سلگتا ہوا سوال بن کر کشمیر کے ماتھے پر چمک رہا تھا۔

جنرل طارق نے جو آدمی اس طرف روانہ کیے تھے وہ ابتدائی دنوں ہی میں راشن
لنے کی وجہ سے وہاں سے واپس آ چکے تھے اور اس انتہائی اہم محاذ کا خالی رہ جانا بڑا المیہ تھا

☆○☆

کمانڈر حسین خان اور اشرف دونوں بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شیرو
نے انہیں ساری کہانی سنا دی تھی۔

——پہلے تو ان کا یہی خیال تھا کہ شیرو خود فرار ہوا ہے' لیکن یہ ان کا اجنبی ہمراہ
کون تھا؟ جس کے متعلق شیرو کچھ بتانے کو بھی تیار نہ تھا۔ "وہ جو کوئی بھی ہے' ہم مر
ہے۔ ہمارے ہی راستے کا مسافر اور ہماری اگر کوئی پہچان ہے تو وہ کشمیری حریت پسند
ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟ اگر تم بتاتے بھی تو میرے لیے یہ ضروری بات نہیں تھی۔ شیرو! اگر
ایسی طاقتور اور منظم تنظیم کا قیام عمل میں آ چکا ہے جس نے کشمیر کو آزاد کروانے کے لیے
اندر ہی اندر اور نہایت خفیہ طریقے سے تیاری مکمل کر لی ہے تو یہ میری' تمہاری اور ہم
سب کی خوش بختی کی علامت ہے۔ آج ہم سب بکھرے ہوئے ہیں۔ ٹکڑیوں میں بٹ کر لڑ
رہے ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب ہم سب متحد ہو کر استعماریت سے ٹکر لیں گے اور اپنی
دھرتی کو غیروں کے شکنجے سے نکالیں گے۔" کمانڈر حسین خان نے طویل سانس لے کر اپنی
بات مکمل کی۔

شرفو نے البتہ کچھ نہ کہا۔ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے دوست کی
اس خوشی کی کیفیت کا اظہار کیسے کرے جو اسے اچانک شیرو کے مل جانے پر نصیب ہوئی
تھی۔

وہ رات کمانڈر حسین خان اور اس کے ساتھیوں کے لیے خصوصی اہمیت کی حامل تھی۔
انہوں نے نورولی کو تین چار روز پہلے جموں کی طرف روانہ کیا تھا تاکہ وہاں کے حالات سے
انہیں باخبر کر سکے۔

پندرہ روز پہلے ہی جموں کی طرف سے تشویشناک خبریں آ رہی تھیں۔ پونچھ کوٹ بھمبر

ہی بھارتی فوجیں آ چکی تھیں اور جموں کے لیے خطرہ کی گھنٹی تھی۔
——پونچھ کے جو فوجی چھٹی پر پاکستان کی آزادی کے بعد کشمیر اپنے گھروں کو لوٹ
رہے تھے' اپنے ساتھ بھارتی فوجوں سے متعلق بڑی اہم خبریں لائے تھے۔ کمانڈر حسین خان
تک یہ خبر بھی پہنچ چکی تھی کہ پاکستان نے جموں کے حالات کو سالمیت کے نقطہ نظر سے بہت زیادہ

اور اب جب سری نگر میں بھی بھارتی فوج اترنے لگی تھی اور جموں کے راستے بھی وہ
پوری طرح کشمیر میں پھیل رہے تھے تو حسین خان کو بڑی شدت سے اپنے منصب کے غیر
محفوظ ہونے کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس کی واحد امید اب جموں میں اس کا ہونہار بھتیجا
تھا۔ نورولی کو اس نے نبی خان کی طرف ہی روانہ کیا تھا اور دوران گفتگو ہی اسے نورولی کی
واپسی کی اطلاع مل چکی تھی۔

——گفتگو مکمل ہوتے ہی وہ اس کی طرف چل دیا۔

☆○☆

مسلسل سفر نے بوڑھے نورولی کو تھکا ڈالا تھا اور—— وہ چٹانی زمین پر بچھائے ایک
تکیے سے ٹیک لگائے لیٹا ہوا تھا' جب اس نے حسین خان کو اس طرف آتے دیکھ۔ ایک
دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد وہ دونوں اٹھ کر باہر آ گئے اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک دونوں دوست تنہائی میں باتیں کرتے رہے' پھر نورولی تو سونے چلا گیا جب کہ
حسین خان سوچ میں ڈوبا واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے ہمراہ خاص تومیوں کے
ساتھ جن میں اشرف خان اور شیر محمد بھی شامل تھے' انتہائی اہم صلاح مشورہ کر رہا تھا۔

"میرے دوستو!" اس نے گفتگو کے اختتام پر انہیں مخاطب کیا۔ "ترتیم حالات آپ کے
سامنے ہیں۔ تقدیر نے ہمیں دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ہمارے عقب سے بھارتی فوجیں
ہم پر یلغار کر رہی ہیں اور دائیں بائیں سے ہمیں ڈوگرہ فوجوں نے گھیرے میں لے رکھا
ہے۔ ہماری نظریں سامنے کی سمت اپنے ان بھائیوں پر لگی ہیں جو نہ جانے کیوں ہم تک
پہنچ نہیں پائے' نہ ہی ابھی تک بھارتی فوج کے خلاف پاکستان کی باقاعدہ فوج میدان میں اتری
ہے۔ نہ جانے وہ لوگ کس روز بد کے منتظر ہیں کہ ابھی تک ہماری مدد کو نہیں آئے۔ اس
مرحلے پر اگر ہم نے پونچھ کو خالی چھوڑ دیا تو خدائے واحد کی قسم قیامت تک پھر کبھی ہم
دوبارہ یہاں قدم نہ رکھ سکیں گے۔ الا یہ کہ کوئی معجزہ ظہور پذیر ہو اور ہمیں دوبارہ یہاں
قدم جمانے کا موقع مل جائے۔ ہم نے جس بے سروسامانی کے عالم میں جہاد کا آغاز کیا تھا،،

HBC

آپ سب جانتے ہیں اور آج جب ہماری کوششیں رنگ لانے لگی ہیں تو ہمارا
کے لیے اپنے ہم مذہبوں کو بلا لیا ہے۔"

——— تھوڑی دیر کے لیے رک کر اس نے اپنے ہمراہیوں کے چہروں پر نظر
سب پتھر کے بت بنے اس پر نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔

"جموں میں جس طریقے سے خون مسلم بہہ رہا ہے' آسمان بھی اس پر لہو
ہو گا مگر یہ خدا ہماری غیرت ابھی زندہ ہے۔ کشمیر کے بیٹے ابھی مر نہیں گئے کہ یوں
کی بہو بیٹیوں کو گلیوں میں رسوا کرتا پھرے——— آزمائش کی گھڑی سر پر آگئی ہے
جموں کے بے کس اور مظلوم مسلمانوں کا لہو صرف اپنی بدبختی کی دہائی نہیں دے رہا
غیرت کو بھی للکار رہا ہے۔ خدائے واحد کی قسم! ہم تعداد میں نہ ہونے کے برابر ہیں
ہمارے پاس اسلحے کے انبار نہ سہی' لیکن ہمارے سروں میں آزادی کا سودا سمایا ہوا ہے
ہمارے بازوؤں میں ابھی اتنی سکت ہے کہ وہ ان غاصبوں کا گلا گھونٹ دیں جنہوں نے
پشت میں خنجر گھونپا ہے۔" اس نے رک کر دوبارہ لمبی سانس لی اور گویا ہوا۔

"میں کل رات جموں روانہ ہو جاؤں گا۔ یہاں کی کمان نوروللی کے سپرد کرتا ہوں۔ میں
تم میں سے کسی سے اپنے ساتھ چلنے کی اپیل نہیں کروں گا' لیکن تمہیں تمہارا فرض ضرور یاد
دلاؤں گا....."

"حسین خان! واللہ ہم ابھی اتنے بے غیرت نہیں ہوئے کہ تمہیں اکیلا جانے دیں۔"
شیرو نے تڑپ کر اس کی بات کاٹ دی۔

اس کے ساتھ ہی تمام مجاہدین اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حسین خان نے شیرو کو بہت
سمجھایا' لیکن اس کے جذبہ شوق شہادت کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ اگلی رات سفر کے
لیے منتخب ہوئی۔ ان لوگوں کو پہاڑوں کے بیچوں بیچ پیدل سفر طے کر کے جموں پہنچنا تھا کیونکہ
تمام سڑکیں فوج کے قبضے میں تھیں۔

رات گئے تک شیرو' اشرف خان کو تسلیاں دیتا رہا۔ اس نے زبردستی شرفو کو یہاں چھوڑ
دیا تھا۔ قریباً" آدھی رات کے بعد ایک شدید ذہنی کشمکش کے بعد وہ اس فیصلے پر پہنچا تھا کہ
وہ اپنے دوست کو اپنی ماں اور ہمشیرہ کے ٹھکانے سے آگاہ کر دے تاکہ کسی بھی ناگہانی صورت
حال کے پیش نظر وہ ان لوگوں کو لے کر سرحد پار کر جائے۔

"تم ہمیشہ مجھے چھوٹا سمجھ کر دباتے آئے ہو شیرو———!" اس نے قریباً" سسکیاں لیتے
ہوئے روانگی کے وقت اس سے کہا۔

"شرفو! میرے بھائی میں ایک بہت بڑی امانت تمہارے سپرد کر کے جا رہا ہوں۔
میری ماں کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اگر اس کا بیٹا سرخرو نہ ہوا تو کبھی اس کو منہ نہ دکھائے۔ اپنا
بھی اپنا خیال رکھنا۔" اسے یوں لگ رہا تھا کہ اگر وہ مزید کچھ دیر تک شرفو کے
پاس رہا تو شدت ضبط سے اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔

☆○☆

تھوڑا سا سامان کشمیر کے مقدر کو اٹھانے کے لیے پہاڑوں کے دامن میں اتر رہا تھا۔

——— وہ رات کا دوسرا پہر تھا جب پچاس سرفروشوں کا ایک قافلہ اپنے ہاتھوں میں
رائفلیں اور آتشین گنیں تھامے' کندھوں پر بیگ لٹکائے اپنے ساتھیوں سے ہمیشہ کے لیے
خان کی سرکردگی میں الگ ہو رہا تھا۔ یہ کشمیر کے وہ جیالے سپوت تھے جنہیں وطن کی
یہ گوارا نہ تھی۔ وہ مار دینے یا مر جانے کا سودا سروں میں سما کر یہاں سے رخصت
ہو رہے تھے۔ احساس تفاخر ان کے چہروں سے عیاں تھا۔ بے خدا وہ سربلندوں میں سربلند تھے
کہ مادر وطن کی آزادی و عصمت کی پاسداری کے لیے انہوں نے موت کی شاہراہ پر آگے
ہی آگے بڑھ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ دشمن کی للکار پر لبیک کہہ کر اس سے ٹکرانے چلے
تھے۔ یہ پہاڑ اور چیونٹی کا مقابلہ تھا' لیکن آفرین ہے ان کے شوق جہاد پر کہ وہ کسی مصلحت
کو' کسی دشواری کو خاطر میں نہیں لائے تھے۔

نوروللی کی کمان میں سو مجاہدین کا ایک دستہ انہیں رخصت کرنے کے لیے پہاڑی سلسلے
کی آخری حد تک آیا تھا——— ان سب کی آنکھوں میں آنسو تھے' لیکن ان سب کے
ہونٹوں پر دعائیں لرز رہی تھیں۔ پہاڑی سلسلے کی آخری حد پر پہنچ کر نوروللی کی کمان میں
آنے والے مجاہدین دو رویہ قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے اکثر نے اپنے ہاتھوں
میں پکڑے قرآن پاک بلند کر لیے۔ وہ قرآن کے مقدس و متبرک سائے میں اپنے پیارے کو
رخصت کر رہے تھے۔

پچاس مجاہد ایک ایک کر کے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے رخصت ہو رہے تھے'
سب سے آگے کمانڈر حسین تھا۔

"حسین خان! روز قیامت میں خدا کی عدالت میں تمہیں ضرور کھینچوں گا۔" بوڑھے
نوروللی کی آواز بھرا گئی۔ "مجھے بوڑھا سمجھ کر چھوڑ دیا ہے نا تم نے!"

"نوروللی! واللہ میرے نزدیک تم سے بہتر کوئی نہ تھا کہ جسے میں ان منتشر اور نہتے
مجاہدوں کو سونپ کر جاتا۔ ہم ایک دوسرے سے انشاء اللہ اسی دنیا میں دوبارہ سرخ رو ہو کر

HBC

نیں کے۔ اچانک اللہ۔" اور وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے
آہستہ آہستہ اندھیرے کی وسیع و عریض چادر کا حصہ بننے لگے۔

☆○☆

میجر رام سنگھ نے طاقتور دوربین اپنی آنکھوں سے لگا رکھی تھی اور وہ اس پہاڑی
کے ہالکل آغاز ہی میں ایک چنار درخت کی شاخوں میں خود کو چھپائے بیٹھا تھا۔ وہ
سجاول کو تھانے کی عمارت سے نکل کر بازار کی طرف جاتے دیکھا۔۔۔۔ معمولہ
ٹھیک تھا۔ خاصی دور تک اس کی نظروں نے سجاول کا تعاقب کیا اور جس لمحہ
وہ مایوس ہو کر نیچے اترنے والا تھا' اس نے سجاول کو ایک جگہ سے موڑ مڑتے دیکھا۔
راستہ ویران سمت کی جانب رہنمائی کر رہا تھا۔ میجر رام سنگھ چونکا۔ "یہ کدھر جا رہا ہے"
اس نے سوچا اور دوربین اس پر مرکوز کر دی۔ اس کی حیرت بڑھنے لگی۔ جب سجاول
کے دیکھتے ہی دیکھتے اس درخت کے نیچے سے بھی گزر کر آگے بڑھ گیا جس پر وہ بیٹھا تھا۔
وہ اپنا سانس روکے وہیں رکا رہا اور جب وہ کچھ دور نکل کر ایک موڑ پر گھوما تو رام سنگھ
بھی درخت سے نیچے اتر آیا۔ اب وہ دبے قدموں سے بلی کی طرح بغیر آواز پیدا کیے اس کا
تعاقب کر رہا تھا۔ تعاقب کا یہ سلسلہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ اس پر جھنجلاہٹ طاری
ہونے لگی تھی' لیکن اس نے خود پر قابو پائے رکھا۔ کسی آمدہ کامیابی کی خوشی نے اسے
تھکاوٹ یا سفر کی طوالت کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ اس نے اپنا ریوالور اب مضبوطی سے
دائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ تعاقب کے لیے اس نے بڑا محفوظ طریقہ استعمال کیا تھا۔ دوربین
کی وسیع دوربین کے ذریعے سجاول پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ جہاں کہیں اس کی منزل کے راستے
میں کوئی پہاڑی موڑ یا سلسلہ آتا' وہ فوراً ایسی جگہ تبدیل ہو جاتا جہاں سے سجاول اسے
صاف دکھائی دینے لگتا۔

پھر ایک مقام پر اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا' اس نے تو رام سنگھ کو بھونچکا کر رہ
دیا۔۔۔۔ اس نے بجائے خود آگے بڑھ کر کھیل بگاڑنے کے وہاں سے ہٹ جانے کا فیصلہ
کر لیا۔

۔۔۔۔اب وہ قریباً بھاگتا ہوا تھانے کی طرف آ رہا تھا۔ مسلسل اور تیز رفتاری سے
بھاگنے کی وجہ سے اس کی سانس پھولنے لگی تھی' لیکن اس نے کہیں بھی رک کر سانس
گوارا نہ کیا۔ اپنی زندگی میں بھی وہ کبھی اس طرح نہیں بھاگا تھا' لیکن کامیابی کے نشے میں
چور رام سنگھ کے پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نہیں تھے۔ وہ تو ہوا میں تیرتا ہوا وہاں تک پہنچا تھا

ہوا۔" میں ہوش تیار کرو۔" اس نے اپنے ماتحت کو دور ہی سے چلا کر حکم دیا۔

☆○☆

"ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔" سجاول نے ملتجی لہجے میں کہا۔
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن شیرو کی کوئی خبر؟" ایلا نے بے چینی سے پوچھا۔
"میں تو خود حیران ہوں۔ خیر تم بے فکر رہو۔ مجھے ابھی پتہ چل جائے گا۔" اس نے ایلا
کو تسلی دی۔
"خدا تمہارا بھلا کرے۔ نہ جانے ہم کبھی تمہارے ان احسانات کا بدلہ چکا بھی سکیں گے
یا نہیں۔" شیرو کی ماں نے احساس تشکر سے سرشار لہجے میں کہا۔
"اچھا آپ لوگوں نے تو مجھے شرمندہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں چلتا ہوں۔۔۔۔ خدا
حافظ!"
"خدا حافظ!" تینوں نے یک زبان اسے خدا کی حفاظت میں سونپا۔
جب سابق وہ بڑے اطمینان سے چلتا ہوا آ رہا تھا جب سجاول کو اپنے گرد و پیش
بڑھتے خطرے کا احساس ہوا۔۔۔۔ اس کی چھٹی حس نے اس سنسنے میں اسے کبھی دھوکا نہیں
دیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس نے رک کر بغور ماحول کا جائزہ لیا۔ اپنے دائیں بائیں مختلف
درختوں پر چڑھ کر نظریں دوڑائیں' پھر مطمئن سا ہو کر چل دیا۔
۔۔۔۔لیکن ابھی وہ بمشکل پندرہ بیس گز ہی چل پایا تھا جب اچانک اس کے عقب کی
طرف "ہلن۔۔۔۔ ہلٹ!" کی آوازیں شور پیدا کرنے لگیں اور اس سے پہلے کہ وہ صورت
حال کو سمجھ پاتا' بیک وقت تین چار رائفلوں کی نالیاں اس کے جسم سے آ لگیں۔ "ہینڈز
اپ" اس نے رام سنگھ کی آواز سنی اور بے اختیار اس کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔
ابھی تک اسے رام سنگھ نظر نہ آیا تھا۔
۔۔۔۔اس سے پہلے کہ سجاول خان کی نظریں میجر رام سنگھ کو ڈھونڈنے میں کامیاب
ہوتیں' ایک زوردار ٹھوکر اس کی دائیں پسلی پر پڑی جس سے بے اختیار وہ بائیں طرف
لڑھکا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین بوس ہو جائے' اس کی بائیں پسلی پر بھی وہی قیامت ٹوٹ
پڑی۔ سجاول نے سنبھلنے کی ہزار کوشش کی لیکن اس پر ٹھوکروں کی بارش ہونے لگی۔ چیختا
چلاتا اس نے بزدلی سمجھا اور اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر اپنے اندر سے اٹھنے والی تیسوں
کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرنے لگا' مگر اسے زیادہ دیر تک خود سے جنگ نہیں لڑنا پڑی۔ سر پر
لگنے والے کسی رائفل کے بٹ نے اسے تھوڑی دیر کے لیے تمام لوتھوں سے نجات دلا

HBC

ای ۔ سہاول کا ان اندھیری تاریکیوں میں اٹھتا چلا گیا۔

☆○☆

لالہ اس سمت نظریں جمائے بیٹھا تھا جس طرف سے اکثر سہاول آیا کرتا تھا۔ ۔۔۔ کئے ابھی بمشکل آدھ گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ لالہ کا دل گھبرانے لگا۔ آج پہلی مرتبہ اسے خوف محسوس ہونے لگا تھا' حالانکہ یہاں آنے کے بعد وہ خود کو قدرے محفوظ خیال کرتا تھا۔ ۔۔۔ اس کے وہم نے تب حقیقت کا روپ دھار لیا' جب اچانک اس سمت پہاڑ کے سلسلے سے دو گروہ قوبیوں کو اسی طرف بڑھتے دیکھا۔ پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا تھا' لیکن حقائق سے فرار کی کوئی بھی راہ دکھائی نہ پڑتی تھی۔ پھر ایک جھٹکے سے وہ ہوش میں لوٹ آیا۔ وہ دوڑتا ہوا مچھری غار تک پہنچا۔ اپنی بھابی اور بچی کو اس نے وہاں تیزی سے صورت حال کی سنگینی کا احساس دلا کر سنبھلنے کی تاکید کی۔ آنکھیں دونوں کی تحیر اور خوف سے پھٹنے کو آ رہی تھیں۔ لالہ نے انہیں جھنجھوڑا اور اس غار کی دوسری سمت سے میدانی علاقے کی طرف اترنے کی ہدایت کی۔ خدا حافظ کہا اور اپنی آستین گن لور گولیاں سمیت بھاگتا ہوا اس راستے پر پہنچ گیا جس طرف سے سہاول انہیں ملنے آیا کرتا تھا۔

اس کی نگاہیں اس راستے پر ٹکی تھیں جدھر سے ان لوگوں کی آمد متوقع تھی لور خوف ہم کی کوئی شے اس کے نزدیک نہ پھٹکی تھی۔ اسے اگر کوئی ڈر تھا تو صرف یہ کہ حملہ آوروں کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ اپنی جان سے گزر جانا اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا پھر ۔۔۔ سامنے سے آنے والے نمایاں ہونے لگے۔

وہ لوگ دو دو کی ٹولیوں میں بٹ کر پہاڑیوں میں پھیلے ہوئے تھے اور لالہ ان سے خاصی اونچائی پر مورچہ زن تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی' لیکن آہنین گن پر اس کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ اس لمحے کا منتظر تھا جب حملہ آور اس کی گن کی رینج میں آ جائیں لور وہ مرنے سے پہلے اپنے دل کے ارمان نکال سکے۔ بڑی بے چینی کے ساتھ وہ ان کی آمد کا منتظر تھا' لیکن اچانک اس نے حملہ آوروں کو رکتے دیکھا۔

وہ لوگ مختلف نیلوں اور بڑے بڑے پتھروں کی اوٹ میں پوزیشنیں سنبھال رہے تھے۔ اچانک ایک زوردار آواز پہاڑیوں میں گونجی۔ "تم لوگ گھیرے میں آ چکے ہو' خود کو کرنلدی کے لیے پیش کر دو۔"

لالہ خاموش رہا۔ دوبارہ وہی فقرہ دہرایا گیا۔ اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اس مرتبہ ہ ای آواز نے کہا

"کریم لال! دونوں عورتوں کو ہمارے حوالے کر دو۔ تم تو جانتے ہو ہم تمہیں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہیں گے۔ تمہارا مقصد تو پورا ہو گیا ہے۔ ہم تمہیں اغوا کر کے لے جائیں گے۔ ہم تمہیں اغوا کر کے لے جائ

HBC

آزمانے پر تلی تھی اور گرداش حالات نے اسے ہمیشوں کے لیے سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اپنی زمین اور بیٹی کی عزت کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار تھا۔

جس طرح لالہ کریم کو وطن دوستی اور شجاعت ورثے میں ملی تھی' اسی طرح انسپکٹر میر کو غداری اور قوم دشمنی وراثت میں ملی تھی۔ اس کے باپ دادا بھی ڈوگرہ حکمرانوں کا تختہ الٹنے کی ہر کوشش کو ناکام بنانے کے لیے ہی حمدوں کا مزا لوٹ چکے تھے۔ وہ ضمیر فروش وطن دشمن محض یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح کریم اور اس کی بیٹی کو زندہ گرفتار کر کے میجر رام سنگھ کے حضور پیش کرنے اور انعام کا حق دار ٹھہرے۔ لالہ کریم سے گفتگو کرنے کا مقصد بھی اسے صرف الجھانا ہی تھا جس میں وہ حد تک کامیاب بھی ہو چلا تھا۔۔۔۔ اس نے دور ہی سے گفتگو اپنے سپاہیوں کو ایک پوزیشن سے دوسری کی اوٹ لیتے اس گزرگاہ کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا تھا جو کہ زہراں اور شیرو کی ماں کے فرار ہونے کا واحد راستہ تھا۔

☆○☆

کسی لاشعوری حرکت کے تابع ہو کر ہی لالہ کریم نے اس طرف گردن گھمائی۔ اس کے اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک خیال جاگزیں ہوا تھا۔ اس نے نظریں گھما کر دراصل فرار کے امکانات کا جائزہ لینا چاہا تھا اور جیسے ہی اس کی نظر اپنی بائیں سمت والے ٹیلے کی طرف گئی تو وہ ٹھٹھر کر رہ گیا۔ چار ڈوگرے ایک دوسرے کے تعاقب میں مختلف پتھروں کی اوٹ لیتے اس گزرگاہ کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں سے تھوڑی دیر پہلے زہراں اور شیرو کی ماں کو اس نے فرار کروایا تھا۔

کریم لالہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ "تو یہ مکار مجھے گفتگو کے جال میں الجھا کر یہ گھناؤنا کھیل کھیلتا رہا تھا؟" اس نے لمحہ بھر سوچا اور ساتھ ہی گن کا رخ گرانگ کرتے ڈوگرہ سپاہیوں کی طرف کر دیا۔ ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھا اور پہلے ہی برسٹ میں اس نے گن نے اپنے انجام سے بے خبر رینگتے ہوئے ڈوگرہ سپاہیوں میں سے دو کو چاٹ لیا۔

دونوں نے بھی بے تاب کی طرح تڑپ تڑپ کر لالہ کریم کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ دیا تھا۔ باقی دو کو بھی گولیاں تو لگی تھیں' لیکن ضرب کاری نہ ہونے کے باعث کسی نہ کسی طرح رینگ رینگ کر محفوظ آڑ میں چلے گئے۔

فائرنگ کی آواز سنتے ہی میجر رام سنگھ کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے دل ہی دل میں انسپکٹر میر کو بچھو کی گالیوں سے نوازا جو اسے یہ کہہ کر گیا تھا کہ ایک گولی بھی ضائع کرائے بغیر۔۔

کریم: زہراں اور شیرو کی ماں کو گرفتار کر لے گا۔

انسپکٹر میر کی بیوقوفی نے لالہ کریم کو ہوشیار کر دیا تھا اور اب اگر وہ اسے گھیر کر مار بھی ڈالتے تو زہراں اور شیرو کی ماں کو ڈھونڈنا بڑا مشکل ہو جاتا' کسی کے لمحہ لالہ کریم کی پوزیشن ایسی تھی کہ جب تک اس کے پاس اسلحہ ختم نہ ہو جاتا' کسی کے اس کے سامنے سے گزر کر اس کی پشت تک پہنچنے کے امکانات باقی نہیں تھے۔

میجر رام سنگھ نے انسپکٹر میر کو گالیاں بکتے ہوئے اپنی آنکھوں سے اوجھل کر دیا اور اپنے پہلے سے تربیت شدہ حوالوں کو "حملہ" کا حکم دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ساتھ دو ڈوگرہ سپاہیوں کے تین پوزیشن مختلف اطراف سے فائرنگ کرتے ہوئے لالہ کریم کی طرف بڑھنے لگے۔ لالہ کریم کے عین سامنے' لیکن قدرے نیچی پوزیشن پر گن مشین گن نے لالہ کریم کے مورچے پر آگ اگلنا شروع کر دی۔ فائرنگ اتنی تیز ہو رہی تھی کہ اسے سر اٹھانے کی مہلت بھی نصیب نہ تھی۔

اس تیز رفتار فائرنگ کی آڑ میں میجر رام سنگھ کے خصوصی دستے کے تربیت یافتہ فوجی اس کی طرف گولیاں برساتے بڑھ رہے تھے۔ لالہ کریم کو اپنی موت کا تو پکا یقین ہو چکا تھا لیکن اس کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے کسی نہ کسی طرح زہراں اور شیرو کی ماں کو ظالموں کی دستبرد سے بچا لے اور زیادہ سے زیادہ ڈوگروں کو مار ڈالے۔

تیز فائرنگ اور اس کی طرف ایڈوانس کرتے فوجیوں کے "بے کاروں" نے اسے رتی بھر بوکھلایا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دماغ کو حاضر رکھا اور مشین گن کی گولیوں سے محفوظ رہتے ہوئے اپنی طرف بڑھتے فوجیوں پر فائرنگ شروع کر دی۔

انسپکٹر میر نے فوجیوں کو یلغار کرتے دیکھا تو یہی جانا کہ کھیل اس کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن اتنی جلدی ہار ماننے والا وہ بھی نہیں تھا۔۔۔۔ اس نے فائرنگ کرنے والوں سے ہٹ کر ایک لمبا چکر لگا کر کریم لالہ کے پہلو میں پہنچنے اور اس پر حملہ کر کے گرفتار کرنے کا عزم کیا اور اپنا ریوالور سنبھالتا اس طرف چل دیا۔

کریم لالہ آخری میگزین لوڈ کر رہا تھا جب اچانک اس کے سامنے سے تین چار سر نمودار ہوئے اور اس سے پہلے کہ وہ گن کو فائرنگ کی پوزیشن میں لاتا' ایک ڈوگرہ سپاہی کی گولی اس کا دایاں کندھا بری طرح چھید گئی۔

کریم لالہ تیورا کر الٹ گیا' لیکن سنبھلا اور اس نے میگزین فٹ کر لی۔ اس کو اپنے دائیں کندھے پر چنگاریاں سلگتی محسوس ہو رہی تھیں اور چند ہی لمحوں میں شانے میں پیدا

ہونے والی آگ اس کے سارے بازو میں خون کی گردش کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی' لیکن ابھی وہ ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا—— اس نے ایک تیسرے چرکے سے خود کو نیک نکالی اور اس کی انگلی ٹریگر پر دبتی چلی گئی' لیکن—— اچانک ہی مشین گن کی برسٹ اس کے جسم پر پڑا۔

——اور دم توڑتے کریم لالہ کی نگاہوں نے جو آخری منظر دیکھا' اس نے کریم لالہ کو سکرات کے عالم کو مسہل کر دیا۔

دم توڑتے انسپکٹر میر کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کریم لالہ کے پہلو سے نمودار ہوا تھا اور اپنی دانست میں اس نے بڑی صحیح سمت میں فائر کیا تھا' لیکن بے دم ہوتے کریم لالہ نے زمین پر گرتے گرتے بھی اپنا دبلا اسٹین گن کو پر برقرار رکھا تھا اور گولیاں قطار کی صورت انسپکٹر میر کے جسم میں سوراخ بناتی چلی گئی تھیں۔

☆○☆

اشرف خان پچھلے دو دن سے عجیب و غریب ذہنی کشمکش کا شکار تھا—— شیرو نے پر معمولی ذمے داری نہیں ڈالی تھی۔ دوسری طرف اس کی معروفیات بھی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ مجاہدین نے اب زیرِ زمین کارروائیوں کے بجائے دشمن کے سامنے آ لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ہر روز وہ لوگ کسی نہ کسی محاذ پر جاتے' لیکن آج صبح ناشتے شرفو کو اک بے کلی سی لگی ہوئی تھی۔ وہ کسی کو بتائے بغیر شیرو کے گھر والوں کی خبر گیری طرف روانہ ہو گیا۔ اپنے جسم پر لپٹی ڈھیلی چادر میں وہ اسٹین گن چھپانا نہیں بھولا تھا ہینڈ گرنیڈ بھی اس نے احتیاطاً ساتھ رکھ لیے تھے۔

زہراں تک پہنچنے کے لیے شرفو نے کافی لمبا اور پیچ دار راستہ اپنایا تھا۔ شیرو نے اسے اپنی ماں اور منگیتر تک پہنچنے کے کئی راستے سمجھا دیئے تھے۔ شرفو نے وہ راستہ اختیار کیا جس طرف سے اس کے نظر آنے کے امکانات بہت کم تھے۔

وہ اس تار کی پشت پر تقریباً دو ڈھائی فرلانگ دور تھا جب اس نے زوردار فائرنگ کی آواز سنی۔ شرفو کا دل دھک سے رہ گیا۔ دن کی روشنی میں ایسے دھماکوں کی آوازوں کا سوائے اس کے اور کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ "اس کے سمان کسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ فوجیوں نے حملہ کر دیا ہے؟" اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ اس کے پاؤں حرکت سے عاری ہو گئے تھے۔

شیرو کا چہرہ سوال بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہ پا رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ بھاگ جائے؟ اور ان عورتوں کی مدد کو پہنچے؟ اس بات کا اسے بخوبی احساس تھا کہ وہ اکیلا ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ شیرو نے اسے بتایا تھا کہ ان کے ساتھ ہونے والے حادثے کی صورت میں وہ کیا کرے۔ اس نے اسے گولیاں دی ہوئی ہیں اور اس فائرنگ سے وہ یہی نتیجہ اخذ کر رہا تھا کہ شاید کریم لالہ ان لوگوں کے مقابلے میں ڈٹ گیا ہے۔

وہ اکیلا کیسے اس کی مدد کرے؟ یہ سوال بار بار اسے اکسا رہا تھا۔ پہلے تو اس نے یہ ارادہ کیا کہ وہ واپس ہو جائے اور ساتھیوں کی کمک لے کر یہاں پہنچے۔ اس ارادے کے تحت اس نے ابھی بمشکل دو تین قدم ہی اٹھائے تھے کہ جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس کا ضمیر اس کے راستے کی سد سکندری بن کر اس کے سامنے بازو پھیلائے کھڑا تھا۔

"شرفو!" ایک آواز اس کے اندر سے بلند ہوئی۔ "تیرے واپس آنے تک یہاں کیا بچے گا؟ اپنے دوست سے کیسے آنکھیں ملا پائے گا تو——؟ یہ صلہ ہے اس کی دوستی کا؟"

"نہیں——!" شرفو کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ دیوانہ وار پہاڑی کی طرف دوڑنے لگا—— اپنی گن کو اس نے بھاگتے بھاگتے فائرنگ پوزیشن میں کر لیا تھا۔ اونچے نیچے پہاڑی سلسلے پر تیز رفتاری سے دوڑنے پر وہ دو تین مرتبہ ٹھوکر کھا کر گرا بھی' لیکن اس کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی۔

اچانک وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے پہاڑی سے نیچے آنے والے راستے پر دو عورتوں کو اپنی طرف بھاگتے دیکھا۔ شرفو بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ زہراں اور شیرو کی ماں ہی ہیں۔ اب ساری بات خود بخود اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ لالہ نے فائرنگ کی آڑ میں انہیں پچھلے راستے سے فرار کروا دیا ہے۔ شرفو سے ان کا فاصلہ بمشکل تیس چالیس گز تھا لیکن انہوں نے شاید اسے دیکھا نہیں تھا۔ شرفو نے اپنا رخ بدلا اور ان کی مدد کو لپکا۔

شیرو کی ماں نے اپنی جانب آتے ہوئے شرفو کو پہچان لیا—— زہراں نے اگرچہ اس سے پہلے دو تین مرتبہ ہی اسے دیکھا تھا' لیکن وہ بھی اسے پہچان گئی۔ دونوں عورتیں اسے نادیدہ جان کر اس کی طرف لپکیں' لیکن اچانک ہی اگر شرفو نے ان سپاہیوں کو دیکھ کر ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں چھلانگ نہ لگا دی ہوتی تو رائفل کی گولیاں اسے چاٹ لیتیں۔

اوگرہ فوج کا ایک سیکشن جو تین چار سپاہیوں پر مشتمل تھا' بچتا بچاتا کسی نہ کسی طرف

پکر کھا کر پہاڑی کے ایک پہلو پر ایسی پوزیشن میں آ گیا تھا جہاں سے وہ لوگ راستے پر نظر رکھ سکتے تھے۔

——انہوں نے تو اپنی دانست میں دونوں عورتوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے فائرنگ کی تھی تاکہ وہ سہم کر رک جائیں اور گرفتاری کے لیے خود کو پیش کر دیں' لیکن شیرو اس فائرنگ کی زد میں آ گئی اور تھری ناٹ تھری رائفل کی دو طاقتور گولیاں اس کے پہلو اور پشت میں گھستی ہوئی پار نکل گئیں۔ وہ زمین پر گری ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی تھی۔ فائرنگ کرنے والوں کو شاید اپنی بیوقوفی کا احساس ہو گیا تھا یا کورٹ مارشل کا خوف دامن گیر تھا کہ انہوں نے فائرنگ روک دی۔ ان کی نظر اب تک شرفو پر نہیں پڑی تھی جو آنکھوں میں شیرو کی ماں کو گولیاں کھا کر گرتے ہوئے دیکھ کر خون اتر آیا تھا اور جس کا ہاتھ بڑی عجلت میں اپنے پہلو سے لٹکتے کینوس کے تھیلے میں رینگ گیا تھا۔ وہ شاید گرنیڈ نکال کر ان لوگوں پر پھینکنا چاہتا تھا' لیکن اچانک اس نے اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔ حملہ آور عورتیں اتنا قریب آ گئے تھے کہ گرنیڈ پھٹ کر عورتوں کو بھی ان کے ساتھ ہی اڑا دیتا۔ خوش زیادہ ہوش کی ضرورت تھی۔ اس نے بڑی پھرتی سے ہاتھ باہر کھینچا اور دوسرے ہی لمحے حملہ آوروں سے نمٹنے کے لیے تیار تھا جو اپنی گنوں کے سلنگ کندھوں سے لٹکائے بڑے چلے آ رہے تھے اور ابھی وہ زہراں سے بمشکل پانچ چھ گز دور ہی تھے جب شرفو اچانک چھاؤ اوٹ سے نمودار ہوا۔ زہراں شیرو کی ماں پر جھکی ہوا سے سنبھالا دے رہی تھی۔

"بزدلو——!" نفرت اور غصے سے شرفو پھٹ پڑا۔ اس کی گن کی سرخ لبی زبان باہر لپکی اور قبل اس کے کہ حیرت زدہ اور بھونچکے حملہ آور اپنی رائفلیں کندھوں سے اتار کر سیدھی کرتے' ان کے خون میں نہائے ہوئے لاشے ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے—— غیظ اور نفرت سے کھولتے ہوئے اشرف خان نے پوری میگزین ہی ان پر خالی کر دی تھی۔ ان مناظر نے زہراں کو لرزا کر رکھ دیا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹنے کو آ رہی تھیں۔ اس کا حلق خشک ہو چلا تھا۔ اس نے چلانا چاہا' لیکن نطق نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

"ماں جی——ماں جی!" شرفو نے جھکتے ہوئے شیرو کی ماں کا کندھا آہستہ سے ہلا کر اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

کشمیر کی دم توڑتی آنکھوں نے آخری منظر اس کے ذہن کو منتقل کر دیا تھا۔

——اور ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر خود بخود پھیل گئی۔ اور کشمیر نے بہت سے پہلے دیکھ لیا تھا کہ اس کی مٹی کے ایک سپوت نے اس کے جیتے جی اس کے قاتلوں کو

پہنچ کر دبوچ لیا ہے۔ اس میں نجانے اتنی طاقت کہاں سے عود کر آ گئی تھی کہ اس کا پہرہ اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں کس کر گردن مروڑ دیتا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کا پہرہ اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں کس کر گردن مروڑ دینے کا ارادہ کیا۔ اور پھر کشمیر کے ہونٹ دکھتے انگاروں کی طرح شرفو کی پیشانی پر ثبت ہو گئے۔

"شرفو——! میرے بچے تو آ گیا—— شیرو کہاں ہے؟" وفورِ جذبات اور دم توڑتی توانائی میں وہ سمجھ نہ سکے تھی۔

"وہ بھی ابھی آ جائے گا ماں جی——! ابھی تھوڑی دیر میں——بس آتا ہی ہو گا۔"

——شرفو کے منہ سے بے اختیار یہ فقرے نکل رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماں کو کیا بتائے۔ کیسے بتائے کہ اس کا بیٹا تو یہاں سے بیسیوں میل دور موت کی اس شاہراہ پر اپنے سفر کا آغاز کر چکا ہے جہاں سے لوٹ کر آنا اب شاید اس کے بس میں بھی نہ ہو۔

اس اثناء میں زہراں کے حواس بحال ہو چکے تھے۔ اس نے رندھے ہوئے گلے سے "چاچی" پکارا تو شیرو کی ماں نے کمال ضبط سے اس کے دائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

"بہت دیر ہو گئی بیٹا۔ اس نے بہت دیر کر دی——!" بمشکل اس کی زبان لڑکھڑائی۔

"ماں جی! میں آپ کے لیے....."

——شرفو نے کچھ کہنا چاہا' لیکن ماں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بیٹا!" اس کی آواز لرزی۔ "اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

——اس لمحے اس کی آنکھیں شرفو اور زہراں سے ہٹ کر آسمان پر لگی ہوئی تھیں جیسے وہ کسی کھوئی ہوئی انمول شے کا سراغ لگا رہی ہوں—— اور اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ "مولا! میرے مولا—— میرا بچہ..... میری زہراں..... کشمیر....." اس نے ہچکی لی اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

☆○☆

"چاچی" زہراں کی دلدوز چیخ سے شرفو کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھے سسکیاں لے رہی تھی۔ خود شرفو کو یوں لگا جیسے کسی نادیدہ ہستی نے اس کے اندر داخل ہو کر اس کے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر زور سے مسل دیا ہے۔ اس کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہونے لگا۔ ایک سنسناہٹ سی اس کے خون میں دوڑ کرنے لگی تھی—— کشمیر کی

واسطن حرت کا ایک درخشندہ باب اس کے سامنے کھلا تھا۔ ایک لمبی اور تھکا دینے والی
لڑنے کے بعد لارڈ کشنر اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئی تھی۔ وہ جس نے اپنے خاندان
آزادی کی بھینٹ چڑھا دیا تھا' اب اپنے بیٹے کو آزادی کی شکار راہ گزر پر روانہ
سرخرو فضری تھی۔

جلد ہی شرفو پرسکون ہونے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گرد آگ
پہاڑوں اور میدانوں کا سارا حسن ماں میں سمٹ آیا ہو۔ کشمیر کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر
سورج کی کرنوں کا ہالہ' لارڈ کشنر کے چہرے کے گرد پھیل گیا اور اس میں سے ایک عجیب
قوت خارج ہو کر شرفو کے تن بدن میں سرایت کرنے لگی۔ ایک ولولہ تازہ اسے سیر
لگا۔

ماں کی موت نے اس کے دم توڑتے ارادوں میں بجلیاں سمو دیں۔ ایک کوندا سا لپکا'
اسے قوت ارادی کی دولت سے مالا مال کر گیا۔ شیرو کی ماں نے مر کر اسے جینے کی راہ دی
تھی۔

اس لیے اس نے لارڈ کشنر کی لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر عہد کیا تھا کہ وہ اس کی
عظیم مشن کو زندگی کی آخری سانسوں تک جاری رکھے گا۔ اس نے جھک کر ماں کی منور
پیشانی کا بوسہ لیا' پھر اس کے چہرے کو اس کی خون آلود چادر سے ڈھانپ کر سسکیاں لیتی
زہراں کو بازو سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔

پہاڑی کی دوسری طرف فائرنگ کی آواز اب کم پڑتے پڑتے ختم ہو چکی تھی۔ شاید نہتے
تووں کے سامنے اب کوئی مدافعت باقی نہیں بچی تھی۔ شرفو جانتا تھا کہ اب وہ لوگ شکاری
سوں کی طرح زہراں کو بو سونگھتے اس طرف آئیں گے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ پہلے اس
نے ماں کی لاش کو دفن کرنے کا ارادہ کیا' لیکن پھر اسے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

"چلو زہراں" اس نے زہراں کے بازو کو ہلکا سا اپنی سمت کھینچا تو وہ کسی کٹے ہوئے
درخت کی طرح اس پر آ گری۔ اس کی سسکیاں اور سینے کا زیروبم شرفو کے خون میں
چنگاریاں دوڑانے لگا تھا۔

چند لمحے --- اس نے شاید کسی لاشعوری خواہش کے تحت اس محل سے چھٹکارا پانا
مناسب نہ جانا' پھر جیسے وہ اچانک گہری نیند سے جاگ اٹھا۔ یہ زہراں تھی --- اس کے
دوست کی الفت --- وہ شیرو کی ماں کو تو بچا نہیں سکا تھا لیکن زہراں --- خدانخواستہ زہراں
غم کے سپرد چلی گئی تو وہ کبھی خود کو معاف نہیں کرے گا۔ "وہ لوگ اب اسی طرف

ہے ہیں زہراں۔ وقت بہت کم ہے چلو۔" اس نے زہراں کا بازو تھام کر اسے اٹھایا۔
اٹھ کر اچانک رک گئی۔ پہاڑی سلسلے کے پار آسمان پر سورج کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔
اسے نزدیک آتی سنائی دے رہی تھی --- وہ لوگ اب قریب آ چکے تھے۔
روتے روتے وہ اچانک ہی چپ ہو گئی تھی۔
"تم میری واپسی تک یہیں بیٹھی رہنا۔"
اس نے خوفزدہ زہراں کو ایک محفوظ جگہ میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی واپس
ہوں۔"
زہراں نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ وا کیے' لیکن اس کا نہ کہنے کا انداز بہت
حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ مختلف ٹیلوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ اس
نے شرفو کو اپنی سمت آنے والے راستے میں ایک بلند ٹیلے کے پیچھے چھپتے دیکھا۔
--- خوف کے مارے اس کی ہتھیلیاں پسینے میں نہا رہی تھیں۔ اس کا دل جیسے اس
سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آ گرے گا۔ ایک ایک لمحہ قیامت خیز تھا۔ اسے اپنی سانس رکتی ہوئی
محسوس ہو رہی تھی' پھر اچانک جیسے اس کی شریانوں میں دوڑتا خون رک گیا۔ اس نے راستے
کے اسی موڑ پر ایک دوسرے کے تعاقب میں آتے پندرہ بیس خونخوار سپاہیوں کو دیکھا۔
--- جونہی وہ لوگ اس مقام پر پہنچے جہاں شرفو فرشتہ اجل بنا ان کا منتظر تھا' کچھ لمحے
دیگرے دو زوردار دھماکے ہوئے اور گویا تمام آوروں کے لیے حشر بپا ہو گیا --- ان کے
سروں پر قیامت خونی اور زہراں نے ان کے جسموں کے خون میں ڈوبے ہوئے پتھروں اور گرد
میں اٹے چہرے دیکھے۔
--- اور لمحہ بھر بعد اس گرد اور خون کے بیچ منظر سے اس نے شرفو کو نکل کر اپنی
سمت آتے دیکھا۔ ایک پرسکون سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی۔ بالکل اسی
مزدور کی طرح جسے دن بھر کی محنت کا صلہ خلاف توقع بہت زیادہ مل گیا ہو۔
"آؤ زہراں۔" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔
تھوڑی دیر بعد ہی وہ سائے پہاڑی سلسلوں میں لرزتے دھبوں سے دور بہت پیچھے رہ گئے
تھے۔

☆○☆

۲۹ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح جنرل طارق اپنے ایک ساتھی کے ساتھ تازہ ترین صورتحال کا

ی ایک اپیل اور گرفتاری دیں نظر آئی۔ اڑیوں میں سے قبائلی مجاہدین بھی شرکت کرنے کے لیے سری نگر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ تازہ کمک تھی جو گ میں شمولیت اختیار کرنا اور وہاں پہلے سے موجود مجاہدین کا ساتھ دینا تھا۔ سے قریباً پچاس میل دور اوڑی کے نزدیک پل ٹوٹا ہوا تھا۔

یہ پل پسپا ہوتی مہاراجہ کی فوج نے پٹھانوں کی یلغار کی رفتار سست کرنے کے لیے تھا' لیکن مقامی مجاہدین نے فوراً اس کا حل تلاش کر لیا۔ انہوں نے پہاڑوں سے قریباً ڈیڑھ میل لمبی پکی سڑک بنا کر پیش قدمی کرتے مجاہدین کی یہ مشکل حل کر دی۔ اس راستے سے نکل کر قبائلی مقبوضوں کی طرح مہاراجہ کی (اپنی والست میں محفوظ) پر پہنچے اور وہاں بمشکل ہی کوئی خوش قسمت فوجی جان بچا کر بھاگ پایا تھا۔ ان کی دہشت یہ عالم تھا کہ ان کے محاذ پر پہنچنے سے پہلے ہی ڈوگرہ فوج وہاں سے پسپائی اختیار کر لیتی تھی ڈوگرہ فوجی "مقابلہ" نہیں "مدافعت" کر رہے تھے تاکہ وہ محفوظ طریقے سے پسپا ہوتے ہوئے سری نگر تک پہنچ جائیں اور ان کا کم از کم جانی نقصان ہو اور وہاں سے تازہ کمک حاصل کر کے وہ دوبارہ پوری شدت سے قبائلی مجاہدین پر حملہ آور ہوں۔

مظفر آباد سے قریباً اسی میل دور "وادی کشمیر کا دروازہ" بارہ مولا واقع ہے جس کا زیادہ تر رقبہ میدانی ہے۔ یہ شہر سیاحوں کی جنت تھا' لیکن بھارتی فضائیہ کی پچھلے دو روز کی بمباری اور پسپا ہوتی ڈوگرہ فوج نے اسے آثار قدیمہ کے کھنڈرات میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ مجاہدین یہاں ۲۶ اکتوبر کو پہنچ گئے تھے اور ۳۵ میل دور واقع مہاراجہ کا محل سری نگر میں دریائے کنارے بائیں پھیلائے ان کا منتظر تھا۔ بھاگتی ہوئی خوفزدہ ڈوگرہ افواج میں ہرگز اتنا دم خم باقی نہ تھا کہ وہ ان کے آڑے آئیں۔ منزل نظروں کے سامنے تھی' حوصلے مضبوط' مورال بہت ہوا اور دشمن پر کاری ضرب لگانے کا بہترین موقع میسر تھا' لیکن جاہ و منصب کی خواہش کا برا ہو کہ اس نے ان سربلندوں کے بڑھتے قدم وہیں روک لیے۔

تاریخ حریت کا وہ سیاہ باب ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شام یہاں لکھا گیا جو ہمیشہ آزادی پسندوں کو خون کے آنسو رلائے گا۔

میجر خورشید انور نے جو قبائلی مجاہدین کا کمانڈر تھا' جب سری نگر کو پکے ہوئے پھل کی طرح قبائلی مجاہدین کی گود میں گرتے دیکھا تو کمزور انسانی فطرت کا شکار ہو کر خود غرضی کی دلدل میں پھنس گیا۔ اس نے مجاہدین کو وہاں منصوبہ بندی کا بہانہ کر کے روک لیا اور خود نیچے میدانوں کو یہ پیغام بھیج کر وہاں بلایا تاکہ وہ اسے آ کر بتائیں کہ نو آزاد مملکت کی

بنیاد رکھنے میں اسے کتنا حصہ ملے گا اور کشمیر کی مسند پر کس کی پوزیشن لگا رہی ہے؟

وہ ان اس سودا بازی اور سیاست گری کی تدبیر کر رہا تھا جس سے دور ۱۹۷۱ء تک جب اسے ہوش آیا تو ایک ... طیارہ بردار جہازوں میں مسلح بھارتی فوج اس سے قصور راقی بابو تک سری نگر اور بارہ مولا سے درمیان حائل ہو چکی تھی۔

مجاہدین نے حسب روایت جان توڑ حملہ کیا۔ یہ حملہ ۲۷ اکتوبر کی شام کو ایئرپورٹ بمقابلے کے بہترین اور جدید ہتھیاروں سے لیس مسلح فوج تھی جسے زبردست نقصان حاصل تھی۔ حملہ پسپا کر دیا گیا اور پٹھان اپنے زخمی اور لاشیں ساتھ لے کر پیچھے ہٹ آئے جب جنرل طارق سری نگر پہنچے تو لڑائی اپنے نقطہ عروج کو چھو رہی تھی۔ ہمارا فائرنگ کے دھماکوں سے گونج رہا تھا' لیکن معرکہ جنگ ابھی دور تھا۔ انہوں نے اپنی جیپ کی ہیڈلائٹس بجھا دیں اور اس سڑک پر آگے بڑھتے گئے جو سری نگر کو جاتی ہے۔

یہ خدشہ ان کے ذہن میں چھن چھپا رہا تھا کہ اس سڑک پر بھارتی فوج بھی قابض ہو سکتی ہے کیونکہ ابھی صورت حال واضح نہیں ہو رہی تھی۔ ان کو آخری اطلاع یہی ملی تھی کہ شہر کے باہر دور اوپر کے پہاڑوں میں جنگ جاری ہے۔ وہ جیپ کی چوبیں بجھائے ہوئے اب آہستہ آہستہ چلتے بارہ مولا سے ۱۰ میل آگے آ چکے تھے' پھر ایک تنگ رات کے اندھیرے میں جلتے الاؤ کی روشنی نے انہیں رک جانے پر مجبور کر دیا۔

تجدید عہد

رات کے دوسرے پہر لالٹین کی لو اس نے بڑھا دی تھی اور سب کچھ سمیٹ کر دوبارہ
کا عزم تھا۔ بالآخر وہ لمحہ بھی آگیا: جب اسے دروازے پر مخصوص دستک سننی تھی۔ نووارد
نے دروازے کو ایک خاص انداز سے تین مرتبہ بجایا تھا۔

"کون؟" ممدو گوجر نے دروازے کی جھری سے منہ لگاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"مہمان" جواب میں ایک لفظ کے سوا اسے اور کچھ سننے کو نہ ملا۔

دل کی بے قابو دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے اس نے اگلا کوڈ دہرایا۔ "کہاں سے آئے ہو؟"

"جموں۔" دوسری طرف سے پھر ایک ہی لفظ پر اکتفا کیا گیا۔

ممدو نے دروازے کی کنڈی گرا دی۔

"صاعقہ۔" نووارد نے کہا جس کا سارا چہرہ سیاہ رنگ کے کپڑے میں ڈھکا تھا۔

"صاعقہ۔" ممدو گوجر نے پکارا اور آنے والے نے "السلام علیکم" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اپنا چہرہ ننگا کر دیا۔

"امیر خان۔" بے اختیار ممدو کے منہ سے نکلا۔

"ممدو---- میرے یار!" امیر خان اس سے بغل گیر ہو گیا۔

----دونوں ہی اس حسن اتفاق پر خدا کے شکر گزار تھے۔ آج تقریباً سال بعد ان کی ملاقات ہوئی تھی---- آخری ملاقات ممدو کو کل کی طرح یاد تھی۔ دونوں امنڈین آرمی سے اکٹھے فرار ہو کر برما میں سبھاش چندر بوس کی "آزاد فوج" میں شامل ہوئے تھے جہاں جاپانیوں نے ٹریننگ دے کر انہیں واپس ہندوستانی فوج کو سپوتاژ کرنے اور وہاں سے اطلاعات حاصل کر کے "جاف" (جاپان انٹیلی جنس) کو پہنچانے کا فریضہ سونپا گیا تھا۔

دونوں نے اپنا کام کلکتہ کی گودی میں کام کرنے والے مزدوروں کا بھیس بدل کر بڑے شاندار طریقے سے انجام دیا تھا۔ یہیں سوئے اتفاق سے نبی خان سویداروں سے ٹکرا گیا جو

گھر گھر گھوم کر بہاش چندر بوس کی طرز پر مسلمان افسروں کی مدد سے ایک انقلابی
تشکیل دینے کے خبط میں مبتلا تھا۔

نبی خان جموں کا رہنے والا تھا۔ جلد ہی وہ آپس میں گھل مل گئے۔ نبی خان کی
نظروں نے جانے ان میں کیا دیکھ لیا تھا کہ وہ انہی کا ہو کر رہ گیا۔

ہر روز شام کے بعد وہ لوگ ایک پارسی کے چھوٹے سے ہوٹل کے مخصوص
اکٹھے ہوتے جہاں ایک عالم کی سیاست زیر بحث آتی۔ دونوں دوست یہ بات شدت سے
محسوس کرتے کہ نبی خان جب عالم اسلام کا ذکر کرتا تو حد سے زیادہ جذباتی ہو جاتا۔ برصغیر
برصغیر کے مسلمانوں کی دگرگوں حالت زیر بحث آنے پر تو اس کی حالت دیدنی ہوتی۔
——اس کے اسی "جذبۂ وطنیت" سے متاثر ہو کر ایک روز جب امیر خان نے
کے سامنے "آزاد ہند فوج" کا ذکر چھیڑا تو نبی خان کے لیے جیسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ
اس نے دو تین ملاقاتوں ہی میں دونوں کے جذبہ آزادی کو ایک واضح سمت کی
کر دی اجور ایک روز جب اس نے کھل کر اپنے مقاصد ان کے سامنے بیان کیے تو
نے بے اختیار اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اس پر اپنی طرف سے بہت بڑا انکشاف کیا
ان کا تعلق آزادی ہند فوج سے ہے' لیکن یہ کہہ کر تو نبی خان نے ان کے ارمانوں پر
اوس ہی ڈال دی کہ وہ انہیں روز اول سے جانتا ہے—— اس نے اپنی بات کی
ثبوت میں جب انہیں ان کے پچھلے آٹھ دس روز کے معمول سے آگاہ کیا تو دونوں اس کی
خداداد ذہنی صلاحیتوں کے گرویدہ ہو کر رہ گئے۔

نبی خان نے ان کا باقاعدہ تعاقب کر کے نہ صرف کلکتہ میں ان کا "رنگ" ڈھونڈ لیا تھا
بلکہ یہاں ان کے "ذرائع" بھی اس کی نظر میں آ چکے تھے۔

اس روز وہ تینوں پارسی کے تندور نما ہوٹل سے اٹھ کر ایک "کھولی" میں آن بیٹھے جو
نبی خان کی ملکیت تھی۔ یہاں آ کر ان پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ نبی خان یہاں
لال سوامی جی کے نام سے مشہور ہے اور اردگرد کی قریباً سبھی "کھولیوں" میں اس کے چیلے
رہتے ہیں۔ وہ لوگ اس کی پوجا ایک گرو کے سمان کرتے تھے۔

"کسی بات پر حیرت کا اظہار نہ کرنا—— یہ بھی اپنی عادت بنا لو۔" نبی خان بولا۔ "میں
تو تم بھی سابقہ رائل انڈین انٹیلی جنس (I N I) اور موجودہ چلپانی محکمہ جاسوسی کے ذہین
یافتہ ہو' پھر بھی ممکن ہے کچھ باتیں تمہارے لیے چونکا دینے والی ہوں۔"

——یہ تھا وہ پہلا آوزار جو مستقبل میں کشمیر کو ڈوگرہ اور انگریز سامراج کی ریشہ

دوانیوں سے نجات دلانے کا عزم لے کر میدان عمل میں اترنے والی مہیم "ساہتہ" کے
پہلے سپاہی نے انہیں دیا تھا۔

وہ ساری رات تینوں نے گفتگو اور بحث و تمحیص کی بعینہٖ چھاؤنی نبی خان نے
انہیں اس بات کا قائل کر لیا تھا کہ انگریزوں کے برصغیر سے چلے جانے کے بعد بھی کشمیر
کے مسلمان کبھی آزادی کی نعمت سے بہرہ ور نہیں ہو سکیں گے۔ لہٰذا یہ کہ وہ آزادی کے
حصول کے لیے ہتھیار نہ اٹھالیں۔

"میں نے پندرہ سرفروش اکٹھے کر لیے ہیں۔" نبی خان نے انہیں بتایا۔

"کون ہیں وہ؟" دونوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہاں——!" نبی خان نے ایک لمبا سانس لیا۔ "میں تمہیں کتنا بتانے جا رہا تھا کہ
ہماری تنظیم کی بنیادیں اس اصول پر رکھی جا رہی ہیں کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے تعارف
حاصل نہیں کریں گے—— جہاں ایک دوسرے سے تعارف ناگزیر ہو' وہاں البتہ دوسری
بات ہے۔ پھر اصل بات تو ایک مشترکہ مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد ہے۔ اس کے
لیے کیا طریق کار اختیار کیا جائے کہ کچھ کرنے سے پہلے ہی تنظیم انہی موت نہ مر
جائے؟ یہ سوچنا میری ذمے داری ہے کیونکہ جن لوگوں کے خلاف ہم صف آزما ہونے جا رہے
ہیں' میں نے یہ فن جاسوسی اور تخریب کاری انہی کے درمیان انہی کی سرزمین پر رہ کر انہی
سے سیکھا ہے۔"

——دونوں ہونقوں کی طرح نبی خان کا چہرہ تک رہے تھے جو اس لمحے انہیں کسی اور
ہی دنیا کا پراسرار بندہ نظر آ رہا تھا۔

"ہاں دوستو! ہم چونکہ مستقبل میں ایک نیا اور انوٹھ رشتہ قائم کرنے جا رہے ہیں' اس
لیے تمہیں کسی حد تک اپنا تعارف ضرور کرواؤں گا۔ میں نے گنسٹیچو ایم۔ آئی اور رائل
انڈین انٹیلی جنس سبھی کے لیے کام کیا ہے' لیکن خدا جانتا ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے تھا
کہ میں دشمن کا داؤ اسی کے خلاف استعمال کرنے کے فن سے آگہی حاصل کر سکوں اور
آج جب مجھے قدرت نے کسی قابل کیا ہے تو جان سے گزر جانے کا عزم لے کر——
برصغیر کی گلی گلی کوچے کوچے میں ان طالع آزماؤں کی تلاش کر رہا ہوں جو اپنوں اور پرایوں
کی ریشہ دوانیوں کے شکار ہیں مگر جن کے دل تو زندہ ہیں' لیکن جن کی تلواریں زنگ آلود
اور بازو شل ہو چکے ہیں۔"

رخصت کے وقت جب تینوں نے خدا کو حاضر ناظر جان کر اپنا تن من دھن اور کشمیر

کے لیے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ لے کر نذر کرنے کا ملک اضافہ تسلیم
گلزار نے انہیں کہا تھا۔

"آج کے بعد میں تمہیں اس بستی میں کبھی نظر نہیں آؤں گا۔ تم تین بھائی ہو۔
نبی خان نام کا کوئی آدمی تم سے کبھی ملا تھا۔ بس فی الوقت تمہیں اسلحہ حاصل کرنا ہے۔
کے حصول کی ترکیب سے میں نے تمہیں آگاہ کر دیا ہے اور آئندہ تم جہاں کہیں بھی رہو
گے' میں خود ہی تم سے رابطہ پیدا کر لیا کروں گا۔"

پھر تینوں نے ہاتھ پھیلا کر خدائے بزرگ و برتر کے حضور کامیابی کی دعا کی اور پھر
دوسرے کو "فی امان اللہ" کہہ کر اپنی اپنی راہ لی۔

☆○☆

دوسری جنگ عظیم اور آزاد ہند فوج کے خاتمے تک نبی خان نے صاعقہ کے جانبازوں
کی صرف ذہنی اور جسمانی تربیت ہی کی تھی۔ اس کے بعد وہ لوگ عملی میدان میں کود
پڑے۔ اس نے صاعقہ کے مختلف کمانداروں کو مختلف ذمے داریاں سونپ کر انہیں ملک کے
کی طرف روانہ کر دیا۔

تقسیم ہند کے اعلان تک صاعقہ کے مٹھی بھر سرفروش سارے کشمیر میں پھیل کر اپنے
قدم مضبوطی سے جما چکے تھے۔ فی الوقت انہیں "انتظار کرو اور دیکھو" کی پالیسی اپنانے کی
ہدایت کی گئی تھی۔ اس کے بعد انہیں اپنی اصلیت کو چھپائے رکھتے ہوئے مقامی آزادی
پسندوں کے ساتھ عملی جدوجہد میں شامل ہونے کا حکم ملا۔ یہ ان لوگوں کی تربیت تھی جس
نے انہیں جلد ہی مجاہدین کے نزدیک ممتاز کر دیا۔

انہی سرپھروں میں سجاول اور حسین خان بھی شامل تھے۔

ممدو کو جب پونچھ میں قیام کرنے اور ڈوگرہ چھاؤنی کو دودھ سپلائی کرنے کا حکم ملا' تب
اسے علم ہوا کہ مجاہدین میں حسین خان کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے' لیکن ابھی تک اسے
حسین خان سے براہ راست ملاقات کا موقع نہیں ملا تھا۔ اسے یقین تھا کہ حسین خان کو بھی
اس کی موجودگی کا علم نہیں ہے۔ اسے تو صرف سجاول کا پتہ تھا یا پھر اس درخت کی بیدہ
میں شمال کی جانب رکھے بڑے سے پتھر کا' جو شہر سے باہر جنگل کو جانے والے راستے کے
ایک کونے میں تیز رو نالے کے کنارے تن تنہا جانے کب سے کھڑا اپنے گرد کے کینوں کے
بے بسی کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ سجاول کی طرف سے اسے جو پیغام زبانی یا تحریر کی صورت میں
ملتا' ممدو اسے بڑے سے پتھر کے نیچے دبا کر چلا آتا اور اگلے روز وہیں سے دوسرا حکم وصول

رابطہ اشیائی جنس کا یہ محفوظ طریقہ ہو وہ لوگ ہیشات کی جنگل سے لے استعمال کرتے تھے۔
نبی خان نے ہی انہیں بتایا تھا۔

نبی خان بھی یہ پراسرار طریقہ اسے الجھائے گیا' لیکن جب اس نے ہمدو بھائی نبی خان
کی شخصیت اترتی تو اس کی ساری جھنجلاہٹ اور الجھن غائب ہو جاتی اور وہ پوری طرح
کی شخصیت کر اپنے کام میں جت جاتا۔ اسے نبی خان سے ایک سبق یہ بھی ملا تھا کہ
اور عقیدت کا یہ رشتہ ہر نئی صبح بیدار ہونے پر ممدو کو جذبہ سے سرشار اور اپنے اندر نئی توانائی
بھالی دے رہا تھا۔

پچھلے دو ڈھائی سال میں اس کی ملاقات نبی خان سے بمشکل تین چار مرتبہ ہو پائی تھی'
لیکن اسے اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے نبی خان کی پراسرار اور علمی ذات
قوت کی مائل آنکھوں نے مسلسل اسے اپنی زد میں رکھا ہوا ہے۔

سجاول بتھانی تھانے کا سپاہی تھا اور کبھی کبھی ممدو کو جیرتیون وہ جاتا تھا کہ آخر سجاول نبی
خان سے کیسے ٹکرا گیا۔ پھر وہ یہ سوچ کر خود بخود مطمئن ہو جاتا کہ ظاہر نبی خان کے لیے
کسی دوسرے عالم کی مخلوق سے کوئی تعلق پیدا کر لینا بھی کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔

اعلان آزادی سے پہلے ہی کشمیر کی سیاست کے دھارے نے جو اچانک پلٹا کھایا اور جس
طرح انگریز اور ہندو کی ملی بھگت نے اسے کچے ہوئے پھل کی طرح بھارت کی جھولی میں
ڈال دیا تھا' اس بات نے اس کی نظروں میں نبی خان کی اہمیت کئی گنا بڑھا دی تھی۔ اسے وہ
رات یاد آنے لگی جب کلکتہ کی ساحلی آبادی کی وہ کھولی یاد آنے لگی جہاں کبھی گورو منوہر لال نے اسے اور
امیر خان کو ہو بہو مستقبل کی یہی تصویر دکھائی تھی۔

"نظام کے اندازے کتنے صحیح تھے ـــــ!"

☆○☆

پچھلے دنوں جب وہ سجاول کا ایک خط رات کے اندھیرے میں اس پتھر کے نیچے رکھ کر
آیا تھا تو اس کا جواب اسے تین روز بعد ملا تھا۔ اس دوران سجاول کی طرف سے "رپورٹ"
بند ہو گئی تھی۔

ـــــاور اس خبر نے ممدو گوجر کو خاصا پریشان کر دیا تھا کہ سجاول گرفتار ہو چکا ہے۔
سجاول کی گرفتاری کے بعد سے اسے اپنے گرفتار ہونے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ گو کہ سجاول کو
اس کی قیام گاہ کا علم نہیں تھا' لیکن پونچھ کوئی ایسا بڑا شہر بھی نہیں تھا کہ اسے ڈھونڈا ہی نہ
جا سکے ـــــ ان کی تنظیم کے کسی باقاعدہ رکن کی یہ پہلی گرفتاری تھی۔

ممدو کو امید ہی تھی کہ اب اسے یہاں سے کہیں اور چلے جانے کا روپیل ہوسکے گا۔ لیکن یہ دیکھ کر وہ کچھ حیران اور پریشان بھی ہوا کہ اسے امیر خان کی آمد کا مقصد اور کر اس کو بتائے گئے طے شدہ منصوبے پر عمل کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

اور آج امیر خان آ گیا۔

"کہاں غائب رہے اتنے دن؟" قہوے کی پیالی میں تیسری مرتبہ قہوہ انڈیلتے ہوئے اس نے اپنے دیرینہ دوست کو مخاطب کیا۔

"یہیں سری نگر میں——! پھر یکایک مجھے ٹھکت پہنچنے کا حکم ملا۔ لمبی کہانی ہے بار پھر کبھی سناؤں گا۔" اس نے گہری سانس لی اور یوں بیزاری کا اظہار کیا جیسے اس موضوع پر بات کرنا پسند نہیں کرتا۔

ممدو نے یہ بات محسوس کر لی تھی۔ اسی لیے اس نے نہایت غیر محسوس انداز میں گفتگو کا رخ بدل کر ٹھکت کی باتیں شروع کر دیں۔ رات کا دوسرا پہر ہو چلا تھا، لیکن نیند دونوں کی آنکھوں سے غائب تھی اور دونوں ہی ایک دوسرے سے "مطلب کی بات" شروع کرنے کی توقع لگائے ہوئے تھے، لیکن دونوں ہی جیسے گفتگو کا آغاز کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ بالآخر ممدو گوجر نے ہی ہمت کی۔ "مجھے مرکز کی طرف سے بڑی غیر مبہم سی ہدایات ملی ہیں۔ تم شاید بہتر بتا سکو۔" اس نے امیر خان کو مخاطب کیا۔

"ممدو——!" امیر خان نے پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے الٹا ہاتھ مونچھوں پر پھیرا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی جسے وہ اب تک ختم نہیں کر سکا تھا۔ "میرے ساتھ یہاں دس پولیس آئے ہیں۔ آٹھ مقامی ہیں اور دو سری نگر سے۔ کل تم مجھے بھی اپنے ساتھ چھاؤنی لے جاؤ۔ مقامی رائٹر سے یہی اطلاع ملی ہے کہ رام سنگھ سجاول کو چھاؤنی میں لے آیا ہے۔

——بظاہر تو وہ مسلمانوں پر رحم کرتا ہے، لیکن اصلیت کا علم اسے ہو چکا ہے۔ اسے اس بات کا یقین ہو چلا ہے کہ پولیس میں موجود نوے فیصد مسلمانوں کے دل مجاہدین کے ساتھ اور زبانیں مہاراجہ کے ساتھ ہیں۔ خصوصاً زہراں اور شیرو کے فرار کے بعد سے اس کا انسپکٹر میر پر بھی اعتبار اٹھ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی موت کے بعد یہاں ہندو انسپکٹر کو لایا گیا ہے۔ حالانکہ عموماً یہاں مسلمان انسپکٹر ہی رہتا ہے اور اگر رام سنگھ اسے تھانے میں رکھتا تو ہمارے لیے معاملہ زیادہ مشکل نہیں تھا، لیکن اب بات دوسری ہے۔" امیر خان نے رک کر لمبا سانس لیا اور اپنی کہی باتوں کا ردعمل ممدو کے چہرے پر تلاش کرتا ہوا بولا۔ "ہمیں اصل میں دو کام کرنے ہیں ممدو بھائی۔"

ممدو بے تاب میں ایک ٹک اس کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"ایک تو سجاول کو ان حوالیوں کے چنگل سے نکالنا ہے اور حسین خان کی بات پوری کرنی ہے۔"

"کون سی بات؟" ممدو نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس نے میجر رام سنگھ کو پیغام بھیجا تھا کہ اگر وہ پونچھ سے جا بھی نہ چاہے تو وہ لوگ اسے بارڈر پار کروا دیں گے۔"

"لیکن اس کے لیے یہ کام اتنا مشکل....."

"ہاں اس کے لیے یہ کوئی بہت بڑی بات نہ تھی۔" امیر خان نے اس کی بات کاٹی۔ "لیکن حالات اتنی تیزی سے بدل گئے ہیں کہ اس کے لیے اس معاملے کی طرف توجہ دینے کا وقت نہیں رہا۔ اچانک ہی بھارتی فوج نے مداخلت کی اور نہی خان نے اسے ہمیں بلا لیا۔"

"ٹھیک ہے امیر خان۔" ممدو کی آواز اس لمحے کچھ بدلی بدلی دکھائی دے رہی تھی۔ "پہلے تم کبھی مجھے پیچھے نہ پاؤ گے۔ میں اس راستے پر پیش آمدہ قیامتوں سے خبردار ہونے کے بعد ہی اس پر چلا تھا۔"

"میرے خیال سے اب تھوڑا آرام کر لیں، صبح اٹھ کر تم نے بھینسیں بھی دوہنی ہیں اور شاید آٹھ بجے تک دودھ بھی پہنچانا ہے۔" امیر خان نے بالآخر کہا۔

"نیند تو اب ہے نہیں اور رات بھی بمشکل ایک پہر باقی ہو گی۔ خیر تم کہتے ہو تو کمر سیدھی کر لیتا ہوں۔" اس نے اپنا دیوار سے ٹکا سر چارپائی پر رکھے سرہانے پر دھر لیا اور رضائی اوڑھ لی۔ اس کی مخالف سمت ویسی ہی ایک چارپائی پر بیٹھے امیر خان نے بھی یہی عمل دہرایا تھا۔

☆○☆

پونچھ سے بڑی سڑک کے ذریعے بارہ مولا کی طرف سے کشمیر جانے کے بجائے انہوں نے ایک ذیلی راستہ اپنایا تھا اور اب وہ لوگ گلمرگ کے راستے سری نگر جا رہے تھے جہاں سے انہیں ایک خصوصی بندوبست کے بعد جموں کی طرف سفر کرنا تھا۔

اس خصوصی "بندوبست" کا علم سوائے حسین خان کے اور کسی کو نہیں تھا اور ابھی تک نہی خان کی طرف سے اسے ایسی کوئی ہدایت بھی نہیں ملی تھی کہ وہ "صاعقہ" کو مجاہدین سے متعارف کروائے۔ بسا اوقات اسے نہی خان کی جانب سے ایسے احکامات خاصی تفتیش بعد میں

بتلا کر دیتے تھے۔ لیکن ایک تو اس نے نبی خان کی "مساوات" کے کمانڈر کی وفاداری کا صاف اضافہ تھا اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ آج تک اس نے نبی خان کے فیصلے کو اپنی دانست میں غلط سمجھا' وہ خلاف توقع صحیح ثابت ہوا تھا۔

کبھی کبھی تو حسین خان کو اپنی سوچ سے وحشت ہونے لگتی تھی اور آج بھی ایسی ہی کیفیت سوار تھی۔ اس نے خیالات کی یورش سے بچنے کے لیے اپنی سوچ اور اپنی ساتھیوں پر نظر دوڑائی۔ وہ لوگ پچھلے تین دن سے متواتر سفر کرتے آ رہے تھے سری نگر کے باہر مقیم تھے۔ اپنا اسلحہ انہوں نے تربیت یافتہ کمانڈوز کی طرح اپنے گرم کپڑوں میں چھپا رکھا تھا اور مختلف ٹولیوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے تعاقب میں سفر کرتے یہاں تک پہنچے تھے۔ حسین خان کا ذہن نہ چاہتے ہوئے بھی "شیرو" پر اٹک جاتا تھا۔ اک عجیب سی خلش اسے کبھی کبھی کچوکے دینے لگتی۔ وہ یوں محسوس کرنے لگا تھا جیسے شیرو کو اپنے ساتھ لا کر اس نے شیرو کی ماں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔

رات خاصی بیت چلی تھی اور انہیں اپنے عقب سے کبھی کبھی رائفل یا اسٹین گن سے فائر ہونے کی آواز سنائی دیتی۔ رائفل کا دھماکہ اس امر کی نشاندہی کے لیے کافی ہوتا تھا کہ رات کی تاریکی میں بھی پٹھان اپنے شکار سے غافل نہیں اور گشت پر موجود سپاہیوں میں سے جو بدقسمت بھی ان کی رینج میں آ جاتا' اسے قید حیات سے نجات دلائے بغیر نہیں رہتے تھے۔

دور کہیں کسی بھارتی فوج کے یونٹ نے "روشنی راؤنڈ" فائر کیے۔ شاید انہیں سرحد پار آوروں کی کسی "پٹرول پارٹی" کا شک گزرا ہو گا۔ اگرچہ وہ لوگ میدان سے خاصی بلندی اور بائیں محفوظ' پھر بھی حسین خان نے اشارے سے سب کو کسی آڑ میں ہو جانے کے لیے کہا تھا۔ اس نے شیرو کو اپنے پاس بلا لیا۔۔۔ دونوں اپنے ساتھیوں سے قدرے ہٹ کر بیٹھ گئے۔

سری نگر کی سردی ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھی' لیکن مستقبل کے خدشات اور آنے والے حالات کے متعلق سوچ نے وہاں سردی گرمی کا احساس ختم کر دیا تھا۔ ان لوگوں کو یہاں آ کر علم ہوا تھا کہ انہیں یہاں سے بھیس بدلا کر مختلف ٹولیوں کی شکل میں سفر کرنا ہو گا۔

ان کا بھیس کیا ہو گا؟ کون سا روپ دھارنا ہو گا انہیں؟ اس بات کا علم سوائے حسین خان کے اور کسی کو نہ تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" حسین خان نے اس کے چہرے پر سرسری نظر دوڑائی۔ "ماں کی یاد آ رہی ہے؟"

"نہیں چاچا۔۔۔ میں ایسی اتنا بزدل نہیں ہوا کہ۔۔۔"

"میرا مطلب تھا نہیں تھا شیرو۔ میں تمہیں نہیں تمہارے اسلاف کو بھی جانتا ہوں۔" حسین خان نے بڑی چیزی سے اس کی بات کاٹی۔

شیرو محسوس کر رہا تھا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔ واقعی سری نگر پہنچنے تک اس کا ذہن خاصا منتشر ہو چکا تھا اور اب اسے وہ وہ کر زہراں یاد آ رہی تھی۔ روانگی کے وقت اس کا پیٹ زہراں سے کہنا "جا رہا ہے" تھا۔ اس کا احساس اسے اب ہوا تھا۔ شیرو نے سوچا۔ کاش وہ زہراں سے ایسی باتیں نہیں کہنی چاہیے تھیں۔ آخر وہ ایک عورت ہے اور ایسی عورت جو بدقسمتی سے شیرو سے محبت کرتی تھی۔"

"ہم لوگ جموں کب جائیں گے؟" شیرو نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی غایت

"شاید کل رات کو روانگی ہو۔" حسین خان نے اس کا فرار محسوس کر لیا تھا۔

"سنا ہے جموں کے پورے صوبے میں بڑا ظلم ہوا ہے۔ ہزاروں بے گناہ مسلمان مارے گئے۔" شیرو نے بڑی کڑوی سی بات کہہ دی۔

"ہاں۔۔۔! بدقسمتی سے وہاں ہمارے ساتھی منظم نہیں تھے اور ڈوگروں نے بھی ہماری کم تعداد سے فائدہ اٹھایا۔۔۔ پاکستان کی طرف سے آنے والے لشکروں نے۔۔۔" حسین خان نامکمل بات کہہ کر خاموش ہو گیا۔

اس نے شہر کی سمت سے آنے والے راستے پر ایک مارچ کو تین مرتبہ مخصوص انداز سے جلتے بجھتے دیکھ لیا تھا۔ "تم ذرا یہیں ٹھہرو۔۔۔ میں ابھی آیا۔"

۔۔۔ وہ شیرو کو شش و پنج میں مبتلا چھوڑ کر تیزی سے اندھیرے کی چادر میں غائب ہو گیا۔

حسین خان نے پستول کو فائرنگ پوزیشن میں کر کے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا لیکن اس کا یہ ہاتھ اس کمبل میں چھپا ہوا تھا جس نے اس کے سارے جسم کو ڈھانپ کر سردی کا زور خاصا توڑ دیا تھا۔

دوسری جانب اس کی آمد کو شاید محسوس کر لیا گیا تھا کیونکہ اس نے اپنے سامنے قریباً پندرہ گز دور دوبارہ اسی مارچ کو جل کر بجھتے دیکھا۔ اس مرتبہ طرز سے اسے بائیں سمت

اشارہ کیا گیا تھا۔

ابھی وہ بمشکل دس گز ہی آگے بڑھا تھا جب اس کے عقب میں ایک جانی پہچانی آواز

"ہالٹ!"

حسین خان اپنی قدموں پر جکڑا ہو گیا۔ اس نے فرنٹ کرنے کی یا اتنا وقت ہی

گزرنے نہیں دیے تھے۔

"کون ——؟" وہی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"مسافر ——!" حسین خان نے زیر لب کہا۔

"کہاں ——؟" سوال ہوا۔

"معلوم ——!" اس نے اگلا گولا داغا۔

"ساتھ ——؟" اس کے عقب میں بولنے والا مطمئن ہو کر اس کے ساتھ ہی

ہوا۔

"ساتھ ——!" حسین خان نے پستول جیب میں رکھ کر اپنا ہاتھ شناخت کے لیے

بڑھا دیا۔

دونوں چاند کی نقلی روشنی میں ایک دوسرے کی شکل بآسانی دیکھ سکتے تھے۔ ان سے

عقب میں اب فائرنگ کی آوازیں مسلسل بلند ہو رہی تھیں۔ شاید قبائلیوں نے رات سے

اندھیرے ہی میں سری نگر کے مضبوط دفاع پر قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سری نگر کا بے قاعدہ اور کئی میل لمبا دفاع پر۔ میجر بھارتی فوج کی مکمل گرفت میں تھا

اور اس کی ابتدائی تین پلٹنوں نے جو اپنے ساتھ بھاری توپ خانہ لے کر آئی تھیں، بارہ مولہ

سے اس سمت آنے والی سڑک پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکاوٹیں کھڑی کر کے مورچے

قائم کر لیے تھے۔ ان مورچوں کا محاذ بھارتی توپ خانے کی فائرنگ کنٹرول کر رہی

تھیں۔

نوواردوں حسین خان کے لیے اجنبی تھا۔ اسے اس بات کی خوشی ہوئی کہ "ساتھ" اپنے

قدم مضبوط کر رہی تھی اور اب ناشتا چھوٹے بھی اس میں شریک ہونے لگے تھے۔

"میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ پونچھ کے دیہاتیوں نے جس دلیری کا مظاہرہ کیا ہے

اس نے سارے کشمیر کے مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔" نووارد نے حسین خان سے

مل کر مصافحہ کیا۔

[illegible] سب ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ اپنی اپنی جگہ والی بھی ہی ہیں

حسین خان نے کہا۔

"ہم سے [illegible] ہاتھی [illegible] ہے [illegible] ہوئے [illegible] ہیں۔"

"ہاں۔" نووارد نے کہا۔

"تم [illegible] ہاتھی [illegible] ہے [illegible] ہیں۔" حسین خان نے [illegible]

"ٹھیک ہے تم فکر نہ کرو میں اپنے ہاتھی کو لے کر آتا ہوں۔" حسین خان نے [illegible]

سامان لینے کے لیے واپس آیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنے ساتھیوں میں موجود تھا۔ "ساتھ" سے [illegible]

اس نے اپنے گرد اکٹھے بیٹھے ہوئے مجاہدین سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہمارے [illegible] کے [illegible] ہدایات دی جا چکی ہیں۔ ہم لوگ [illegible] سے یہاں تک [illegible]

نے [illegible] دشمن کی چوکیوں کا صفایا کرتا ہے۔ اگر مجھے ساتھ دینا ہے تو [illegible]

نے والوں میں شیرو یا میں شامل نہ ہوں تو [illegible]

ہوئے [illegible] کی سمت پہلی کرتے ہوئے عقب سے [illegible]

کی [illegible] ہے کہ [illegible] اگر تم میں سے [illegible]

[illegible] مبارک [illegible]

سے زیادہ [illegible]

[illegible] کا ہاتھ پکڑ کر اندھیرے کی چادر میں [illegible]

اس نے شیرو کو بھی صاف [illegible]

[illegible] کی [illegible] اس نے نبی خان کی پوچھ [illegible]

اور دونوں اس کے پیچھے [illegible]

[illegible] کے رضاکاروں سے بھی [illegible]

[illegible] کی [illegible]

[illegible] ساری رات وہ لوگ مقامی [illegible]

[illegible] مراکز کے گرد آمد و [illegible]

[illegible] میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، ان کے [illegible]

رہی تھی اور کشمیر کا پیشتر [illegible]

[illegible] کا [illegible]

[illegible] تب کسی نے اس سے [illegible]

[illegible] اگر اس کی [illegible]

پنڈتوں اور ڈوگروں کا پلیدان دیا جائے' جو ظالم ہوتے ہوئے بھی مظلوم تھے۔

علی الصبح جب کشمیر کے ننگے حسن پر چھائے بدبختی کے کہرے کی چادر میں سے سورج کی لہو رنگ کرنیں اپنا راستہ بنانے کی سرتوڑ کوششیں کر رہی تھیں اور کسی فراری فوجی کی گھنٹہ ڈور زور سے بج کر فضا میں پھیلی نحوست کو چار چاند لگا رہا تھا تو گنجان آباد علاقے بری سنگھ بالی اسٹریٹ میں بنی بظاہر ایک بیکری کی دکان کے باہر کھڑے تین کشمیری مجاہد اپنے سر بلند عزائم کو عملی روپ دینے کے ارکانات کا جائزہ لے رہے تھے۔ دکان کے دروازے پر بنا ایک چھوٹا سا چوکور لکڑی کا تختہ اپنا جگہ سے ہلکا سا کسی پر ٹکراتے پر پھیلی ہوئی گہری لکیروں تلے گھنی بھنوؤں میں دھنسی دو تیز آنکھوں نے باہر بیرونی ماحول کا جائزہ لیا۔ "نوواردوں" سے مخفیہ الفاظ کا تبادلہ کیا اور مطمئن ہونے کے چند لمحے بعد دروازہ کھول کر انہیں نگل لیا۔

☆○☆

پونچھ مجاہدین کے مکمل محاصرے میں تھا اور عملاً شہر میں انہی کی حکومت قائم تھی۔ صرف دفاعی نوعیت کے اہم مقامات اور جیل تھانے وغیرہ ابھی تک ڈوگرہ سامراج کی گرفت میں تھے۔

——— شہر کے عین وسط میں قائم ایک عارضی چھاؤنی کے باہر دو کشمیری گوجر جن کے کندھوں پر دودھ کے پیتل کے بڑے بڑے برتن رکھے تھے' آ کر ٹھہر گئے۔

"سلام صاحب جی———!" ممدو گوجر نے بیل کے سامنے اونگھتے سکھ حوالدار کو مخاطب کیا۔

"او سنا بھئی ممدو۔ کیا حال ہے؟ دودھ میں پانی ڈالا یا ابھی ڈالے گا؟" پہرے پر موجود حوالدار نے حسب معمولی رٹے رٹائے فقرے دہرائے۔

"مہاراج جی! ساری زندگی حرام نہیں کھایا۔ اب تو قبر میں ٹانگیں لٹک رہی ہیں۔" ممدو نے ہمیشہ والا جواب دہرایا۔

"اوئے یہ کون ہے تیرے ساتھ" حوالدار نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اپنی اہمیت جتلائی۔

"رشتے دار سردار جی اپنا۔ ادھر جموں میں تھا بے چارہ۔ میری طرح اکیلا ہی ہے۔ ذرا کر میرے پاس بھاگ آیا ہے۔"

ممدو نے بڑی عاجزی سے جواب دیا۔

حوالدار نے ادھر ہی کہیں مرکب جاتا۔ "مادر چود تمہارا پاکستان جن تو گیا ہے' کہ یہ سالے یہاں کیوں مرنے آ رہے ہیں۔ سیالکوٹ کیوں نہیں چلے جاتے؟" حوالدار کے مائنڈ کرنے سنتری نے محسوس کیا کہ اس کی بات سن کر حوالدار کو کچھ ہوا۔ "رہا ہمارا روزہ تک تک نہ کیا کر۔ فوجی بن فوجی اور انسان سیکھ۔ جب الہر کسی سے بات کر رہے ہوں تو بیچ میں بکواس نہیں کیا کرتے——— میں نے بھی پندرہ سال فوجی نوکری کی ہے' جب کسی لاری آگر میری سیاست بند نہ ہوئی تو سالے پنشن گنوا دوں گا۔ یاد رکھی———" حوالدار نے سنتری کو اس بری طرح ڈانٹا کہ اس کی گھگھی بندھ گئی۔

"شاکر دو حوالدار جی۔" اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ باندھے۔

"جا یار ممدو۔ اس سالے برہمن کی اولاد نے تو سارے دودھ کا صبح ہی فرق کر دیا۔ جانے باقی سارا دن کیسے بسر ہو گا؟" سکھ حوالدار نے ممدو کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

"شکریہ سردار جی۔" امیر خان نے جو اس کے پیچھے تھا' حوالدار کے قریب سے گزرتے ہوئے کہا جو سنتری کو رائفل سیدھی کر کے فوجیوں کی طرح پہرہ دینے کا حکم دے رہا تھا۔

ان کا رخ چھاؤنی کے میس کی طرف تھا۔ راستے کے دونوں اطراف میں فوجی ٹرک کسی بھی خطرناک اور ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار کھڑے تھے۔ ان کے گرداگرد سردی سے ٹھٹھرتے ڈوگرہ فوجی اپنی رائفلیں دونوں ہاتھوں کے درمیان کھڑی کیے اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ زور زور سے رگڑتے ہوئے ان میں سے گرمی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

میس کے باہر ہی انچارج دوار کا داس اس کا منتظر تھا۔ "آؤ میاں۔ رات کیا چڑھا لی تھی؟ آنکھیں بڑی چڑھی ہوئی ہیں۔" اس نے بغیر دعا سلام کے ممدو پر حسب عادت طنز کیا۔

"توبہ توبہ۔ مہاراج جی!" ممدو نے دودھ کا برتن برآمدے میں رکھتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "کس حرام شے کا نام لے دیا صبح ہی صبح۔ وہ تو بھلی ہوئی جس سے آنا تھا بے جان۔ ادھر حالات ذرا خراب ہی ہیں۔ ہم دونوں رات گئے تک پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔ بڑی دیر بعد ملے ہیں نا۔" ممدو نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے امیر خان کے تعارف کے مرحلے سے بھی جان چھڑالی۔

"ابے کیا بات کرتا ہے جموں کی؟ کس کی مجال ہے کہ وہاں سر اٹھائے؟ اپنی بھارتی سینا آ گئی ہے وہاں۔ وہ تو یہاں سالے مسلے اکڑتے پھرتے ہیں ورنہ تو سارے کشمیر میں———"

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ممدو کے کندھے پر حسب عادت زور سے ہاتھ مارا اور کہا
ہوا۔ "بس بیٹا! دو چار روز ہی کی بات ہے۔ پھر دیکھنا یہاں بھی فرنٹ کے پیچھے کی طرح سب کچھ
ٹھیک ہو جائیں گے۔"

ان لوگوں کو علم تھا کہ ممدو گوجر مسلمان ہے۔ وہ اسے کمز نیشنلسٹ سمجھتے تھے
اور بلا تکلف اس کے سامنے راز کی باتیں کر جاتے تھے۔ دوارکا داس نے بھارتی فوج کے
کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ان لوگوں کو علم تھا کہ مارو مار کرتی بھارتی میکانائزڈ پونچھ کی آ
کے دروازوں پر دستک دے رہی تھی۔ وہ لوگ راستے میں اپنی پوزیشن مستحکم کرتے اور رکاوٹ
یورش کو کچلنے کے امکانات پر مکمل نظر رکھنے کے بعد ہی آگے بڑھتے تھے تاکہ ان کا
مجاہدین کے حملوں سے محفوظ رہے۔ جہاں کہیں بھی بھارتی فوج پہنچتی، سب سے پہلے وہ
مقامی مسلمانوں میں سے سرکردہ اور پاکستان کے حمایتی افراد کو کسی نہ کسی بہانے ساتھ لے
دیتی۔ اس کے بعد مضبوط مورچہ بندیاں قائم ہوتیں۔ مقامی نظم و نسق کا کنٹرول بھارتی فوج کا
افسر سنبھالتا اور وہاں "مارشل لاء" کی سی صورت قائم کرنے کے بعد ہی وہ لوگ آگے بڑھتے
تھے۔

دودھ ماپنے والا پیمانہ اور خالی برتن وہ لوگ کچن کے باہر برآمدے ہی میں لے آئے
تھے۔ ممدو گوجر تو ان کے ساتھ باتیں کرنے لگا جب کہ امیر خان کی بے قرار نظروں نے
ماحول کا گہرا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کی بے چین نظروں کا فوکس جلد ہی کچن سے دس
بارہ گز دور بنی کوٹھڑیوں کی اس قطار پر مرکوز ہو گیا جہاں مغتوب فوجیوں کو رکھا جاتا تھا۔
"اگر سجاول یہیں زیر عتاب ہے تو اسے اس وقت ان ہی کوٹھڑیوں میں سے کسی ایک میں
ہونا چاہیے۔" اس نے سوچا۔

نکھرا اور سما ہوا سورج اب پونچھ کی پہاڑیوں اور مرغزاروں پر کرنیں بکھیرنے لگا تھا۔
برآمدے کے سامنے سورج کی پہلی کرنوں کا رقص جاری ہو چکا تھا۔

"بھائی صاحب——!" ممدو گوجر نے اچانک گھوم کر امیر خان کو مخاطب کیا۔ "یہاں
پالے میں کھڑے کیوں اپنی قلفی جما رہے ہو، وہاں سامنے دھوپ میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ ابھی لالہ
نی چائے پلاتے ہیں۔ وہیں دھوپ میں بیٹھ کر پئیں گے۔ بڑا لطف رہے گا کیوں لالہ جی
صلاح——!" اس نے دوارکا داس کی طرف دیکھ کر خوامخواہ دانت نکال دیئے۔

"تم لوگوں کی مانگنے کی عادت نہ گئی۔" دوارکا داس نے باورچی خانے میں کسی کو آواز
دے کر ان کے لیے چائے لانے کو کہا۔ اس کے طنز کا کاٹ بڑی گہری تھی، لیکن کیا مجال ہ

ہے جس بھی کسی ممدو یا امیر خان کے ماتھے پر نمودار ہوئی ہو—— دونوں "بے شرمی"
سے ہنس ٹال رہے تھے۔

پھر ممدو تو لالہ دوارکا داس کے ساتھ چائے پینے کا ہوز تو کرنے لگا اور امیر خان آہستہ آہستہ
کوٹھڑیوں کے آگے بھیلتی دھوپ کی طرف چلتے لگے۔ ان کا ابا جیسے اور "ہوشیار" کا وقت
آنے کی وجہ سے اسے اپنے قرب و جوار میں کہیں کوارٹر گارڈ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ شاید
ان لوگوں کو کم از کم یہاں کسی "غیر معمولی صورت حال" کے وقوع پذیر ہونے کا یقین نہیں
تھا۔

کوٹھڑیوں سے کچھ فاصلے پر فوجی ضرور آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے، لیکن ان
کی طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔ امیر خان بڑی بے تابی سے اس احاطے میں گھسنے کے مواقع
تلاش کر رہا تھا، لیکن کوئی بہانہ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ کسی بھی وقت کسی کے اس طرف آ نکلنے سے اندر داخل ہونے
اور کوٹھڑیوں میں جھانک کر دیکھنے کے تمام مواقع ضائع ہو جاتے اور تیزی سے بدلتی صورت
حال کے پیش نظر کسی بھی گھڑی کچھ بھی وقوع پذیر ہو سکتا تھا۔ "پھر خدا جانے ایسا موقع میسر
بھی آئے گا یا نہیں۔" وہ بڑی شش و پنج میں تھا۔

سامنے برآمدے میں اسے ممدو گوجر کا قہقہہ سنائی دیا۔ وہ اپنی توجہ تر صلاحیتیں دوارکا
داس کا دھیان اسی طرف لگائے رکھنے پر صرف کر رہا تھا۔ محض ایک لمحے کے لیے امیر خان
نے کچھ سوچا، پھر اس کے قدم بے اختیار اسی کوٹھڑیوں والے احاطے کی طرف اٹھ گئے۔

اس احاطے کے تین اطراف میں کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ سامنے کی سمت اندر جانے کا
راستہ ہونے کی وجہ سے خالی تھا اور وہاں دروازہ نام کی کوئی شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ پہلے
شاید یہ کوٹھڑیاں گھوڑوں کے اصطبل کا کام دیتی ہوں گی، لیکن اب ڈوگرہ فوج نے انہیں
"کوارٹرز" میں بدل دیا تھا اور یہ سیل سزا یافتہ قیدیوں کے لیے مخصوص ہو گئے تھے۔

امیر خان نے ازار بند ڈھیلا کر لیا تھا اور بظاہر وہ پیشاب کرنے کے ارادے سے اس
طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے دونوں طرف بنے دس سیلوں میں سے نو خالی تھے، آخری سیل جو
ایک قطار کے کونے پر بنا تھا، وہیں امیر خان کی مراد بر آئی، جب سجاول کو اس نے کوٹھڑی
کے ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کر سر جھکائے بیٹھے دیکھا۔

——اس کے ہونٹ تشدد کی وجہ سے کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے اور ہونٹوں کی سطح
پر بعض جگہ اب بھی سیاہ رنگ کے خون کے دھبے جمے صاف نظر آ رہے تھے—— چہرے

پر پڑے نیل اب سرخی مائل سے سیاہی مائل ہو رہے تھے اور چہرے کی سوجن کم ہو رہی تھی۔ کہ اسے اپنی آنکھیں بھی زور لگا کر کھلی رکھنی پڑتی تھیں۔ کپڑے تبدیل کیے ہوئے بھی اسے چند گھنٹے ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے پر چھائی وحشت پر نظریں ٹھہرتی نہیں تھیں۔ لیکن اس کی آنکھوں کی چمک ابھی ماند نہیں پڑی تھی' جوں کی توں باقی تھی۔

"جلال!" امیر خان کراہا۔

جلال اس کی آواز پر چونکا اور اسے یوں آنکھیں مل کر دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر کسی نہ کسی طرح گھسٹتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ "خدائے بزرگ و برتر کی قسم، میجر رام سنگھ پر ایسی "صاعقہ" گرے گی کہ اس کے گھنٹوں عزائم سمیت اسے بھسم کر ڈالے گی۔" اس نے جلال کے نزدیک آتے ہی کہا۔ "صاعقہ" دشمن کا مقدر ہے جلال" کے لہجے کا وقار بھی اس کے عزم کی طرح قائم دائم تھا۔

بمشکل ایک منٹ کے بعد ہی دونوں میں ایک معاہدہ طے پا چکا تھا۔

——— گھٹنے کے خاتمے تک امیر خان نے شلوار کا ازار بند ہاتھوں میں پکڑے رکھا تو پھر وہ اسی پوزیشن میں آگے بڑھ گیا اور جب وہ فراغت پا کر کھڑا ہوا تو ایک سنتری اس کی طرف رائفل تانے اسے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔

☆○☆

جنرل طارق رکنے یا افسوس کرنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ رات کے دوسرے ہی پہر بارہ مولا سے روانہ ہو گیا۔ اس کی گاڑی کا رخ سری نگر کی طرف تھا جہاں اب قبائلیوں نے لوٹ مار شروع کر دیئے تھے' لیکن بہت وقت ضائع کرنے کے بعد۔

بریگیڈیئر حسن کی قیادت میں بھارتی پلٹنیں دھڑا دھڑ کشمیر میں اترنا شروع ہو گئی تھیں۔ کشمیر تک زمینی راستے سے آنے کا معاملہ ہوتا تو شاید وہ لوگ کبھی اتنی جلدی کامیابی حاصل نہ کر پاتے' لیکن پاکستان کے برعکس بھارت کے حصے میں ایک مضبوط' منظم اور مکمل ایئرفورس آئی تھی۔

رائل انڈین ایئرفورس بظاہر تو برطانوی ہوائی فوج کا بیڑہ تھا' لیکن ۱۹۴۵ء کے بعد سے ہندوستان کی حد تک اس پر عملاً حکمرانی بھارتی غیر مسلموں کی تھی۔ مسلمان کے نعرۂ پاکستان نے جب حقیقت کا روپ دھارنا شروع کیا تو چانکیہ کی روحانی اولاد نے اسی وقت سے اس مسلم مملکت کی تباہی کا سامان کرنا شروع کر دیا تھا جو ابھی وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔

ایک سازش کے تحت جس میں ان لوگوں کو فرنگیوں کی مکمل آشیرواد حاصل تھی'

ہندوستان بھر کے قریباً تمام ایئربیسز کو اور خصوصاً سیکھ رجمنٹ اور ہریانہ کے علاقے میں واقع ایئربیسز کے تمام بھارتی افسروں نے اس بات کا عزم کر رکھا تھا کہ کسی مسلمان کو پائیلٹ نہیں بننے دیں گے۔ اگرچہ افسران تک پہنچنے کے لیے انہیں کمیشن حاصل کرنا پڑتا تھا' لیکن ۱۹۴۶ء تک ایئرفورس کے تمام شعبوں میں ایئرمینوں سے لے کر ایک ہی کورس سے تربیت حاصل ہوا کرتی تھی۔ اس لیے ہر مسلمان کو بھی اس بات کا یقین ہو گیا کہ پاکستان بن کر رہے گا تو اندھا دھند ایئرمینوں نے بغاوت کی دھمکی دے کر اپنے لیے "جھٹکے کا گوشت" منگوانا شروع کر دیا۔ اس بات پر احتجاج کرنے والے مسلمان ایئرمینوں کا کورٹ مارشل ہوا اور ان میں سے بیشتر کو نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے۔

برصغیر میں فضائی تربیت کے لیے دو مراکز قائم کیے گئے۔ ابتدائی تربیت کے لیے امبالہ اور اعلیٰ تربیت کے لیے جودھ پور۔ تقسیم ملک کے بعد یہ دونوں فضائی تربیتی مراکز بھارت کو مل گئے جہاں ٹریننگ سے متعلق تمام ضروری اور جدید ترین سہولیات موجود تھے۔

ایک سازش کے تحت قریباً تمام اہم اسکواڈرن بھارتی ہوائی اڈوں پر منتقل کر دیئے گئے تھے۔ ابتدا میں پاکستان کو چند ٹیپسٹ طیارے دے کر ٹرخا دیا گیا۔ نئی اسٹاف نہ ہونے کے برابر تھا۔ پاکستان کے حصے میں آنے والے ایئرفورس کے ملازمین کی زبان تعدد کو بنگالی ہندو کے دور دراز اسٹیشنوں پر ڈیپوٹ کر دیا گیا تھا اور ملک تقسیم ہوتے ہی ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ پاکستان تک زندہ سلامت پہنچنا بھی ان کے لیے مسئلہ بن گیا تھا۔

سوائے پشاور کے جہاں مسلمان افسران زیادہ تعداد میں تھے' باقی تمام فضائی اڈوں مثلاً ہاری پور' ڈرگ روڈ' چک لالہ' رسالپور وغیرہ ویران پڑے تھے۔ وہ ATC (ایئر ٹریفک کنٹرول) بلڈنگیں یا ایک آدھ ناکارہ طیارہ ہی چند ایسی نشانیاں رہ گئی تھیں جو ان کے "ایئرفورس اسٹیشن" ہونے کی نشاندہی کرتی تھیں۔ روانگی کے وقت غیر مسلم ایئرمین طیاروں کے سپیئر پارٹس نکال کر انہیں اپنے ساتھ ہی بھارت لے گئے تھے۔ اس طرح انہوں نے یہاں بچ جانے والے جہازوں کو عملاً ناکارہ کر دیا اور جو انجن صحیح سلامت بچے' انہیں وہ لوگ جاتے جاتے کباڑیوں کے ہاتھ فروخت کر گئے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ مضبوط ہوائی اڈے' تربیتی مراکز' ہوا باز اور طیارے منظم اور مضبوط نظام کے ساتھ بھارتی فضائیہ کے پاس موجود تھے۔ کشمیر میں "مداخلت" کا بہانہ ہاتھ آتے ہی ونگ کمانڈر مہر سنگھ تمام بھارتی فضائیہ کو حرکت میں لے آیا اور وی بیکل ڈکوٹا

جہازوں میں بھر بھر کر بھارتی ہوا باز اپنی آری کو سری نگر اور جموں پہنچانے لگے۔ ان خونخوار طیاروں کی حفاظت کے لیے اس دور کے لڑاکا طیارے ہری کین اور اسپٹ فائر بھی ان کے ساتھ ساتھ پرواز کیا کرتے تھے۔

ایک طرف تو ایئرفورس نے باربرداری کا ذمہ اٹھایا اور دوسری طرف وہ لوگ اپنی تمام تر قوت کے ساتھ میدان جنگ میں کود پڑے اور ان کی "ناقابل علاج" بمباری نے قبائلیوں کے قدم روک دیئے۔ ان کی دیدہ دلیری کا یہ عالم تھا کہ یہ لوگ اکثر گجرات کے نواحی علاقوں بلکہ مری تک پر بمباری کر کے چلے جاتے تھے۔ ہمارے پاس اول تو ان کے مقابلے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اگر پاس کچھ تھا تو پاکستان ایئرفورس ان کے خلاف کسی کارروائی میں حصہ نہیں لے سکتی تھی کیونکہ اس سلسلے میں حکومت کے دو ٹوک اور سخت احکامات موجود تھے۔

جنرل طارق کی موجودگی بارہ مولا میں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ انہیں علم تھا کہ مقامی غداروں نے یہ اطلاع آگے پہنچا دی ہو گی اور صبح ہوتے ہی بھارتی فضائیہ کے طیارے چیلوں کی طرح آسمان کو بھر دیں گے اور وہ جنرل کو مارنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے، لیکن سری نگر تک پہنچنا ان کے لیے بہت ضروری تھا کیونکہ ابھی تک محاذ کی صورت حال صرف کانوں سنی تھی، آنکھوں سے وہ اب دیکھنے جا رہے تھے۔

رات کے دوسرے پہر وہ سری نگر سے دس میل دور مجاہدین کی ایک چوکی کے پاس رک گئے۔ جہاں قبائلی مجاہدین اگلے روز علی الصبح حملے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ یہیں پہنچ کر جنرل کو "اندرون خانہ" حالات کا علم ہوا اور اس تلخ حقیقت کا ادراک بھی کہ اب قبائلی مجاہدین کا مقابلہ ڈوگرہ فوج سے نہیں بلکہ بھارتی مسلح افواج سے ہے جس نے ہوائی اڈے اور سری نگر پیر۔ میٹر کے گرداگرد مضبوط مورچہ بندیاں کر لی ہیں۔

جنرل نے وہاں رک کر وقت ضائع کرنے کی بجائے آگے سفر کرنے کا قصد کیا اور صبح طلوع ہونے سے پہلے وہ چوتھے سنگ میل پر کھڑے تھے جہاں سے سری نگر صرف چار میل دور تھا۔

سڑک کے گرداگرد بھارتی فوج نے مورچے سنبھال لیے تھے۔ ان لوگوں نے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر کے مورچے قائم کر لیے تھے۔ بڑا خطرہ انہیں سری نگر کے اندر سے حملے کا تھا، لیکن اس طرف سے شیخ عبداللہ نے انہیں مکمل اطمینان دلا رکھا تھا اور اپنے عقب کے اس طرح محفوظ ہونے سے بھارتی فوج کا مورال آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا تھا۔

قبائلیوں نے سری نگر پر بجائے سامنے سے حملہ کرنے کے دائیں بائیں پہلو سے داخل

ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا اور انہوں نے یہ طریقہ آزمایا بھی، لیکن قدرت کبھی کبھار ہر انسان کی سری نگر کے مضافات میں کمزوری پانی نے ان کا راستہ روک لیا۔ اس طرح دشمن کو ایک زبردست فوج کے بالکل سامنے سے حملہ آور ہونے، لیکن سامنے سے آنے والے ہر دشمن کو بھاری مشین گن کے فائر نے اور پیچھے سے آنے والے توپ خانے کی گولہ باری نے ان کے اس حملے کو بری طرح ناکام بنا دیا۔

جنرل طارق آنکھوں سے دوربین لگائے ایک قدرے محفوظ جگہ میں کھڑے میدان کارزار کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے قبائلی مجاہدوں کے پٹنے اور ہٹنے کے کئی مظاہرے اس سے پہلے بھی دیکھے تھے، لیکن آج ان کے انداز ہی نرالے تھے۔ اپنے اسلاف کی روایت دہرانے کے لیے وہ جان سے بھی گزر رہے تھے۔

عین ان لمحات میں جب قبائلی مجاہدین پسپائی اختیار کر رہے تھے اور سورج سری نگر کی پہاڑیوں پر اپنی بکھیر رہا تھا، ہوائی اڈے کی طرف سے "ٹیپسٹ" اور "اسپٹ فائر" طیاروں نمودار ہوئے۔ ونگ کمانڈر مہر سنگھ بذات خود اس حملے کی قیادت کر رہا تھا۔ اس کے علم میں یہ بات جنرل طارق کی موجودگی آ چکی تھی اور اس بات کا علم بھی اسے تھا کہ جنرل کے اپنے بھی اس کی مدد کو نہیں آئیں گے اور یہاں موجود قبائلیوں کی تھری ناٹ تھری کی رائفلیں یا ایک آدھ مشین گن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔

اس نے فتح کے نشے کو دوآتشہ کرنے کے لیے بیک وقت قبائلیوں اور جنرل طارق کے مشترکہ شکار کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے باقی ساتھیوں کے ہمراہ حملہ آور ہوا تھا۔ جنرل طارق نے کسی محفوظ مقام تک پہنچنے کے لیے وہیں سے بارہ مولا کی طرف لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ابھی وہ اپنی جیپ کے نزدیک ہی پہنچے تھے جب آسمان بھارتی طیاروں کی چنگھاڑ سے لرزنے لگا۔

ونگ کمانڈر مہر سنگھ نے شاید ان کی جیپ پہچان لی تھی اور وہ پیش آمدہ فتح کے نشے سے سرشار اب خاصی نیچی پرواز کرتا جیپ پر راکٹ پھینکنے آ رہا تھا۔

جنرل کے لیے یہ کوئی نیا کھیل نہیں تھا۔ محض چند لمحوں میں وہ تیار ہو چکے تھے۔ انہوں نے طیاروں کی آواز سنتے ہی جیپ سے باہر چھلانگ لگائی اور ڈرائیور کو جیپ بھگا لے جانے کا حکم دیا۔ خود وہ لڑھکنیاں کھاتے نزدیکی درختوں کی طرف جا رہے تھے۔

ونگ کمانڈر مہر سنگھ کا طیارہ اپنے پیچھے گولیوں کی قطار بناتا جیپ پر آ رہا تھا۔ ڈرائیور نے

اسے نزدیک آنے کا موقع دیئے بغیر ایک جھٹکے سے موڑ کاٹا اور جیپ کو انتہائی بائیں طرف لہرا دیا۔ مرسنگھ چکرا گیا۔ اس کو سامنے کی بائیں دیوار بھاگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے بائیں ہاتھ لگی اسٹک کو اس نے یک دم گھما کر سر سے اوپر اٹھایا پھر طیارے کا منہ اوپر کو اٹھا اور اٹھا ہی رہ گیا۔ پہاڑی کی چوٹی ایک قاتل مجاہد جانے کب سے اس "ساعت" کا منتظر تھا۔ اس کی رائفل کی نالی بیک وقت اسکرین سے ٹکرائیں، جن سے دو اسکرین کو توڑ کر مرسنگھ کے جسم میں گھس گئیں۔

دماغ میں پہنچنے والی گولی نے اس کا سر توڑ دیا اور بھارت کا ملیہ ناز و تمکنت کشمیر پر ایٹمی فورس کا سایہ کر کے اسے مظلوموں کے ہاتھ جانے سے بچا لیا تھا۔ گولی اپنا کام انجام دیئے بغیر اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ "لیڈر" کی موت نے "فارمیشن" کے باقی طیاروں کو نوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی جنرل طارق چھلانگ لگا کر جیپ میں جا بیٹھا۔ انہوں نے ذرا ایونگ سیٹ خود سنبھالی تھی اور روانگی سے پہلے اس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر کسی بھی طرح وہ چند بکتر بند گاڑیاں یہاں تک لے آئیں اور ان میں سوار کر کے مجاہدین کو سری نگر میں داخل کر دیں تو شاید تاریخ کا دھارا اپنا رخ بدل لے۔ انہیں ہر صورت میں یہ بکتر بند گاڑیاں حاصل کرنا تھیں اور یہی ارادہ لے کر وہ راولپنڈی کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔

☆○☆

نبی خان نے بذات خود ان کا استقبال کیا تھا۔ اس نے ان پچاس مجاہدین کو "ہوم گارڈ" کے لبادے میں جموں تک پہنچانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اس سلسلے میں ایک پیغام اس نے حسین خان کے سامنے رکھ دیا۔ ان لوگوں کو اب دو حصوں میں بٹ کر سفر کرنا تھا۔

نبی خان کی مسحور کن شخصیت کا جادو شیرو پر چل چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک نیند کا ہم و نشان بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نبی خان نے بالآخر اسے "صاحبہ" سے مخاطب کروا دیا تھا اور تین گھنٹے کی مسلسل گفتگو کے بعد جب دوسری طرف حسین خان ایک بھرپور نیند سے لطف اندوز ہو کر اب بیدار ہو چکا تھا، شیرو نے "صاحبہ" کے سے روپ کو ہمیشہ کے لئے اتار پھینکا تھا۔ اسے مرعوب کرنے کے لیے یہی بات کافی تھی کہ حسین خان نظیر اس کے لیے اپنی جان نثار کرنے پر تلا ہوا ہے جس نے آج تک اپنی وابستگی کا کسی کو شک بھی نہیں ہونے دیا تھا۔ "تم جاؤ حسین سے کہو اب تم آرام کرو۔" نبی خان نے اسے کہا۔ "ہم ہوگ شاہ سے ہو

بات کریں گے۔"

"میں اور امراؤ مل" تک ہو آؤں۔ ایک دفعہ پھر ہوٹل کی [illegible] میں دیکھ لوں کہ حسین خان نے کوئی اور [illegible] سے [illegible] ہیں [illegible] لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ [illegible] ہو گئے ہیں اور دوپہر تک ہر صورت میں لوٹ آنا ہے۔"

نبی خان نے یہ کہہ کر حسین خان کو باہر بھیج دیا۔

ان دنوں امراؤ مل کے بازاروں میں یہ بات عام تھی کہ [illegible] وزارت عظمیٰ کے عوض کشمیر کو بھارت میں ضم کرنے [illegible] کشمیر میں وزارت عظمیٰ کی پیش کش اتنی پرکشش تھی کہ شیخ کے لیے [illegible] کی کوشش [illegible] حسین خان امراؤ مل کے قہوہ خانے میں [illegible] کے سلسلوں کے لیے اب اس کے سوا اور کوئی مشغلہ باقی نہیں رہا تھا۔ [illegible] پیپو سے خبریں سن کر اپنا دل بہلایا کریں۔

خیوں کے خاتمے پر حسب معمول قہوہ خانہ سیاسی آماجگاہ بن گیا۔ ہمیشہ کی طرح حسین خان ہونٹوں سے قہوے کی پیالی لگائے بیٹھا تھا، لیکن اس کا دھیان لوگوں کی گفتگو کی طرف تھا۔ لوگ وہ چوٹکا ہوٹل کے دروازے سے اس کا دیرینہ رفیق قیوم احمد داخل ہو رہا تھا جس نے کی۔ آبی سوزی کے لیے اچھے خاصے کلرنامے انجام دیئے تھے اور جو حسین خان کی اصلیت سے بھی واقف تھا۔

حسین خان جانتا تھا کہ یہاں ہوٹل میں بھی یقیناً اس کے ساتھی مختلف بھیس بدل کر خصوصاً سری نگر میں ایسے حالات پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ اس نے چاہا کہ قیوم سے نظریں بچا کر نکل جائے اور اس اندیشے سے وہ اٹھ اور ہوٹل کے کاؤنٹر کی طرف چل پڑا لیکن ابھی وہ کاؤنٹر پر پیسے دے کر گھوما ہی تھا کہ قیوم کی نظریں اس سے ٹکرا گئیں۔

"تم یہاں بھی آ گئے۔" حیرت اور غصے کے ملے جلے جذبات سے قیوم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "اب زیادہ چالاکی نہ دکھاؤ۔" اس نے اپنے ہولسٹر پر ہاتھ ڈالتے ہوئے حسین خان کو حکم دیا۔

حسین خان کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ محض ایک لمحے کی غفلت بھی اسے لے ڈوبے گی۔ اس نے قیوم کو ہولسٹر میں ہاتھ ڈالتے دیکھ لیا تھا۔ یہاں بھی وہ سر بازی ہارنے کو تیار نہ تھا۔

——— بجلی کی سی پھرتی سے حسین خان نے اپنی چادر میں ہاتھ ڈالا اور حیرت زدہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں' جب اس نے اپنے سینے کی طرف پستول کی نلی اٹھی دیکھی۔ دوسرے ہی لمحے یکے بعد دیگرے دو شعلے اس کی طرف لپکے۔ حسین خان کے ذہن کے گوشے گوشے میں متعلق دم توڑتے قیوم کو کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ خود حسین خان بھی جانتا تھا کہ ایک گولی اس کے انجام کو کافی ہے' لیکن وہ قیوم کو اتنی مہلت بھی دینے کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ مرتے مرتے بھی اس کا نام لینے کے قابل رہ جائے۔ اس نے قیوم کے دل کا نشانہ لیا تھا اور یکے بعد دیگرے دونوں گولیاں ایک دوسرے کے تعاقب میں ایک دوسرے سے محض دو انچ دور لگی تھیں۔ آخری میز کے کونے میں بیٹھے قیوم بٹ کے دونوں ساتھیوں نے ریوالور نکالے' لیکن انہیں اپنے ریوالور استعمال کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا کیونکہ اسی کمرے میں داخلے کے دروازے سے لگے ایک شخص نے کسی میکانکی عمل کے تحت ایک ساتھ ہی ان پر گولیاں برسائیں تھیں۔ دونوں کچھ کرنے کی حسرت دل ہی میں لیے ٹھنڈے پڑ گئے۔ "قہوہ گھر" حیرت زدہ اور سہمے ہوئے لوگوں کو کچھ سوچنے یا کرنے کا موقع دیئے بغیر بڑی پھرتی سے باہر نکلا اور ہجوم میں غائب ہو گیا۔

یہ نبی خان تھا جو حسین خان کی مسلسل نگرانی کر رہا تھا۔

فائرنگ کی آواز پر لوگ ادھر متوجہ ہوئے۔ انہوں نے پستول ہاتھ میں پکڑے کسی کو بازار میں بھاگتے دیکھا——— لیکن یہ سارا معاملہ پلک جھپکتے——— ہی رونما ہو گیا تھا اور ان پر اتنی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ کسی نے قاتل کا تعاقب کرنا تو ایک طرف رہا ی۔ آئی۔ ڈی کے دم توڑتے انسپکٹر——— قیوم تک پہنچنے کی زحمت تک گوارا نہ کی اور پھر ہوٹل کا مالک ہی جرات کر کے اٹھا۔

وہ قیوم کی سرکاری حیثیت سے واقف تھا۔ اس نے مزید ہمت کا مظاہرہ کیا اور مرعوب پر جھک کر اسے اٹھانا چاہا۔ قیوم کی نیم مردہ آنکھوں نے جب ایک سائے کو خود پر جھکتے دیکھا تو اس کے منہ سے بمشکل "ح..... ح....." ہی نکل پایا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

حسین خان اس کا انجام دیکھنے کے لیے وہاں رکا نہیں تھا۔ قہوہ خانے کے گرداگرد ہوتے ہوئے ہجوم میں سے وہ بڑی تیزی سے راستہ بناتا بیکری کی دکان کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا اور جب وہ بیکری کی دکان تک پہنچا تو نبی خان اور شیرو کو اپنا منتظر پایا۔

"تمہاری خبر تم سے پہلے ہی تیز رفتاری سے چل کر ہم تک پہنچ گئی حسین

خان——" نبی خان نے اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہا۔

"الحمد للہ کہ——— ایک غدار تو اپنے انجام کو پہنچا۔" حسین خان نے اپنے کندھے پر دھری چادر کو ایک طرف رکھا اور سکون کی لمبی سانس لی۔

"انسپکٹر قیوم ہماری لسٹ میں تھا حسین خان۔" نبی خان نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "جلد یا بدیر اس کو اپنے انجام تک پہنچنا ہی تھا۔"

"بس کم جہاں پاک۔" شیرو قریب ہی سے بولا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اب یہاں سے اٹھنا چاہیے۔ ی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر کی موت ان لوگوں کو چوکنا کر دے گی۔ ایک لحاظ سے تو یہ اچھی بات ہے کہ دشمن خوف زدہ ہو جائے' لیکن اس طرح بھارتی فوج ہوشیار ہو جائے گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" حسین خان بولا۔

تھوڑی دیر بعد ہی تینوں ایک دوسرے کے تعاقب میں بیکری کی دکان سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے اپنے چہرے سردی کے بہانے قریباً ڈھانپ رکھے تھے۔ ان کی منزل سری نگر ہی کا ایک اور محلہ تھا جس کے ایک محفوظ مکان میں "کشمیر ہوم گارڈز" کے السرین کی وردیوں میں ملبوس تین سرفروش ایک پلانگ کے تحت حسین خان اور شیرو کا انتظار کر رہے تھے۔

سورج ڈھلنے سے پہلے ہی وہ لوگ ایک فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔ رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پونچھ سے آنے والے مجاہدین مختلف ٹولیوں کی شکل میں ہوم گارڈز کا روپ دھارے اپنے کمانڈر کے حکم کے منتظر سری نگر شہر میں موجود تھے۔

ان لوگوں کو تین مختلف ٹولیوں میں بٹ کر جموں کی طرف سفر کرنا تھا۔ وہ ہوم گارڈز کی جس کمپنی میں شامل ہوئے تھے' اسے جموں سے کچھ پیچھے ہی بٹوٹ ناہی ایک صحت افزا جگہ میں پہنچ کر اپنی ذمے داریاں سنبھالنی تھیں۔ یہاں سے ان لوگوں کو "امن و امان" قائم کرتے ہوئے جموں تک پہنچنا تھا۔

اگلے روز علی الصبح شیرو اپنے دس ساتھیوں کے ہمراہ ایک ٹرک میں بانہال کے سلسلہ ہائے کوہ کی طرف جا رہا تھا——— ان کی کمانڈ ایک ڈوگرہ صوبیدار کے ہاتھ میں تھی اور ان لوگوں کو بٹوٹ جا کر اپنی ذمہ داریاں سنبھالنی تھیں۔ حسین خان اس سے الگ ایک گروپ کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔

جیپ بڑی تیزی کے ساتھ ان کے قریب سے گزری تھی اور ہارن بجا
پر برانے کی آواز سے دونوں ہی چونک کر رہ گئے۔ انہوں نے جیپ کو رکتے اور
سوار کے اور اپنی طرف آتے دیکھا۔

اگر امیر خان اپنے ہوش و حواس قائم رکھ کر اچانک ہی پیچھے نہ ہٹ جاتا تو
اسے کچل کر رکھ دیتا۔ اس نے دونوں کے ہاتھ آگے بڑھ کر جیپ لاکر اس طرح کھڑی کی کہ
ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے میجر رام سنگھ سے ان کا فاصلہ بمشکل تین گز ہی رہ گیا تھا۔
رام سنگھ کی شکل پر نظر پڑتے ہی مدو گوجر کا ہاتھ پہلے تو ماتھے تک گیا پھر اس
دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"ست سری اکال سردار صاحب۔" میجر رام سنگھ کو سردار صاحب ہی کہا کرتا تھا
خان نے بھی اس کی تقلید میں یہی جملہ دہرایا۔

"یہ کون ہے؟" میجر رام سنگھ کی آواز میں نہ جانے کیا بات تھی کہ مدو گوجر کی ریڑھ
کی ہڈی میں ایک سنسناہٹ تیزی سے دوڑ گئی۔

"بھائی ہے میرا سردار صاحب۔" اس نے اپنا لہجہ حتی المقدور ہموار کرکے نارمل رکھ
"پہلے کبھی دیکھا نہیں۔" رام سنگھ نے اب اپنی نظریں امیر خان کی طرف گاڑ لیں
تیکھیوں سے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ جموں میں رہتا تھا میجر صاحب جی۔" مدو گوجر کے حواس قائم تھے۔ "اب
کے بعد میرے پاس آگیا ہے۔ اب یہی دودھ لے کر آیا کرے گا مہاراج جی۔ میں تو
ڈنگر کی سیوا ہی کیا کروں گا۔ اسی لیے اسے لنگر خانہ دکھانے لایا تھا۔"

-----میجر رام سنگھ کے متوقع سوالوں سے بچنے کے لیے مدو نے اپنی دانست میں پیش
بندی کر لی تھی۔

"ہوں-----!" رام سنگھ نے ہنکارا بھرا۔ "اس کے بیوی بچے کہاں ہیں؟"

"میری طرح چھڑا چھانٹ ہے مائی باپ۔ ہم غریب لوگ شادیاں کہاں کر سکتے ہیں
حضور۔ دو وقت کی اپنی ہی روٹی پوری ہو جائے تو لاکھ شکر ادا کرتے ہیں مولا کا۔" مدو کی
زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔

میجر رام سنگھ نے ٹھنکی باندھ کر اسے گھورا' پھر کچھ کہے سنے بغیر اسی آندھی اور طوفان
کی سی رفتار سے جیپ آگے بڑھا لے گیا۔

مدو نے جیپ کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا۔ پھر اس نے
اس کی دھول کو بیٹھتے دیکھا۔ پھر اس نے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے
اس کی دھول کو بیٹھتے دیکھا۔ پھر اس نے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے
گویا اس کی دھول کو بیٹھتے دیکھا۔ پھر اس نے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے
چوں کہ جانے کا۔

"مہاراج" کا جملہ سنتے ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ اب اسے اس کی صفائی نہ دینی پڑے گی۔
مدو نے شکر ادا کرنے کے انداز میں ہاتھ سے امیر خان کا ہاتھ دبائے ہوئے کہا۔
دونوں اب جیلانی کے دروازے سے باہر نکل آئے تھے اور اس وسیع و عریض کو چھوڑ کر
ہی کی طرف چلے۔

سُلگتی آہیں

دونوں ایک تہہ خانے میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ لالٹین کی روشنی نے ماحول کی پراسراریت کو دوچند کر دیا تھا۔

پچھلے دو روز سے زہراں نے بمشکل اس سے دو تین فقرے ہی کہے تھے۔ اس نے مسلسل خاموشی اختیار کر رکھی تھی اور شرفو سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیسے بہلائے۔

اس کے دوست نے زہراں کی ذمے داری سونپ کر دراصل شرفو کو زبردست امتحان میں ڈال دیا تھا۔ پہاڑی سلسلے سے یہاں تک کا سفر اس کے لیے طلسمات کا سفر تھا۔ اس مختصر سے سفر میں اس کو اسرار و رموز کے کئی جہانوں سے آگاہی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے اس کی زندگی کا مقصد صرف تعلیم حاصل کرنا اور پھر کشمیر کو آزاد کروانا ہی تھا۔

لیکن آج----!

آج جب اس نے زہراں کو اتنے قریب سے دیکھا تو لاکھ ضبط کے باوجود وہ بے خودی کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے بہت عرصہ پہلے ایک دفعہ زہراں کو دیکھا تھا' تب تو وہ ایسی نہیں تھی۔ نہ اسے دیکھ کر یوں کبھی شرفو کو اپنے خون کی گردش رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے اس جذبے کو کن معنوں سے تعبیر کرے۔

کیا وہ زہراں کی محبت کا اسیر ہو گیا ہے؟ یہ خیال ہی اس کے لیے اتنا وحشتناک تھا کہ اس کے لیے اس مفروضے پر سوچنا ہی عذاب وہ تھا۔ شرفو نے چاہا کہ کسی طرح بھی اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر باہر نکال دے' لیکن جب کبھی اس نے یہ ارادہ کیا' ایک صدا اس کے اندر سے اٹھتی جو اسے منافق اور جھوٹے ہونے کا طعنہ دینے لگتی۔

----زہراں اس کے دوست کی منگیتر تھی۔ وہ دوست جس نے شرفو کے لیے کبھی زبان سے گزر جانے میں بھی بخل کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔ ایک ایک کر کے اسے تمام گزرے واقعات یاد آنے لگے تھے اور یہ کوئی بہت پرانی بات بھی نہیں تھی' کل ہی کی بات تو تھی۔

"کیا میں اتنا کمزور انسان ہوں کہ انسانیت کی سطح سے بھی نیچے گر کر رہ گیا ہوں؟" اس

نے سوچا اور اسے خود پر رحم آنے لگا۔ — اسے خود سے ایک لمبی اور مکمل لڑائی لڑنا پڑی لیکن وہ اپنی
من مانی کرکے اسے کسی پل چین ہی نہیں لینے دیتا تھا۔

"میں مر جاؤں گا' خود کو کوئی مار لوں گا لیکن یہ شیطانی جذبہ کبھی مجھ پر غالب نہ آسکے
گا۔" اس نے اپنے آپ کو کوسا اور وہاں سے اٹھ کر باہر آگیا۔

"یہاں ان لوگوں کا قیام تھا جو ابھی تک اس لیے محفوظ تھی کہ جنگ کا دائرہ ابھی
محدود تھا' لیکن کسی بھی لمحے زلزلہ یہاں تک پھیل سکتا تھا۔ نورولی نے حسین خان کی
خصوصی ہدایت کے پیش نظر اس بات کا خیال رکھا تھا کہ شرفو کو کسی "حساس مقام" پر جانے
سے بچایا جائے۔ اس نے زہراں کی حفاظت کے لیے ایک بوڑھی عورت کو بھی وہاں رکھا ہوا
تھا جو زہراں کا خیال اپنی بیٹیوں کی طرح رکھ رہی تھی —— لیکن زہراں.....

زہراں تو جیسے اس عالم میں تھی ہی نہیں —— لالہ اور شیرو کی ماں کی موت نے اس
کو اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگر شیرو یہاں ہوتا تو کوئی اور بات تھی۔ شاید وہ اس
کے زخموں پر اپنی محبت کا پھایا رکھ سکتا۔ یہاں کون تھا جو اس کے دکھ کو جان پاتا؟ ایک
بوڑھی مجاہدہ تھی اور دوسرا شرفو اور جس طرح دن رات شرفو نے اس کا دل بہلانے کے
لیے اپنے سے بتیں کر ڈالے تھے' اس پر وہ دل سے شرفو کی عزت کرنے لگی تھی۔ اسے یہ
نوجوان واقعی غیر معمولی نظر آرہا تھا۔ چپ چاپ سا تنہا سا۔ "یہ جنگ و جدل اس کے بس کا
روگ کہاں تھا؟" زہراں سوچتی لیکن پھر خود ہی اسے جواب مل جاتا کہ آج کشمیر کا جو سپوت
ہتھیار نہیں اٹھا سکتا' وہ بے غیرت ہے۔ اس نے پچھلے دو روز سے یہاں درجنوں ایسے
زخمیوں کو آتے جاتے دیکھا تھا جن کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا محال تھا' لیکن لڑ رہے
تھے۔

یہ شاید مجاہدین کا کوئی خفیہ مرکز تھا جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے بعد انہیں دوبارہ
محاذ پر روانہ کر دیا جاتا تھا۔

☆○☆

شرفو جب خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا تو اس غار نما کوٹھڑی کا سناٹا اسے ڈسنے کو
آنے لگا۔ وہ بوڑھی عورت جو اس کی خدمت پر مامور تھی' تھوڑی دیر پہلے ہی حسب
معمول بکری کے تھنوں سے دودھ لینے چلی گئی تھی۔ ماحول کی یکسانیت سے اسے اب ہول آنے
لگا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر آگئی۔ اس وقت عموماً نورولی وہاں اس کی خیریت دریافت کرنے آیا
کرتا تھا۔ وہ ہاتھ شیرو کے متعلق بھی اسے سنا دیا کرتا اور اتنے وثوق سے

وہاں دل رکھنے کے لیے جھوٹ بولتا کہ وہ اسے بہل جانا چاہتا تھا۔
وہاں کی نظریں ... اس راستے پر لگی تھیں جو سیدھا اس طرف آتا تھا۔ جہاں اس نے
نظر آنے والے ہر قافلے کو ابھرتے دیکھا اور جب آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے سلام دعا کرنے اس
نظر جمالی تو قافلے نے مجاہدین کے منتہائی کمانڈر نورولی کی قابل اختیار کر لی۔
زہراں نے دل کی دھڑکنوں نے اس کے ساتھ ہی اپنی رفتار تیز کر لی۔
"کیسی ہو بیٹی؟" اس نے زہراں کے سلام کے جواب میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے
ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں چاچا۔" زہراں نے آج پہلی مرتبہ اسے روتے ہوئے جواب دیا تو نورولی کو
ایک گونہ اطمینان سا ہوا۔

"شیرو جلد ہی جنوں سے لوٹ آئے گا۔ ابھی ابھی اس کے بستے کی طرف سے ایک
مجاہد ایک خبر لے کر آیا ہے۔ بس تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے بیٹی۔ پھر تم دیکھنا۔ ہم سب
آزاد ہوں گے۔ یہ ہمارے پہاڑ' دریا' درخت' وادیاں' یہ فضائیں' ہمارا کشمیر جنت نظیر آزاد
ہو گا۔"

—— نورولی نہ جانے جوش میں اور کیا کیا کہہ جاتا' لیکن جلد ہی اسے اپنی بے توفی کا
احساس ہو گیا اور وہ خاموش ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ شرفو اسے اس طرف آتا دکھائی
دیا۔ اس نے راکٹل اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور گولیوں کے پٹے ایک دوسرے کو کراس
کرتے ہوئے اس کے سینے پر نمایاں تھے۔

"میں اب یہاں نہیں رہوں گا چاچا۔" اس نے نورولی کو ایک طرف لے جاتے ہوئے
کہا۔

"خیریت ——؟" نورولی نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"مجھے وحشت ہونے لگی ہے اس ماحول سے۔ یوں بے عملوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ
دھرے آخر میں کب تک بیٹھا رہوں گا —— میرا یہ مقام نہیں چاچا نورولی۔"

جانے اس کے لہجے میں کیا بات تھی کہ نورولی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں سمجھتا ہوں بیٹا۔" اس نے شرفو کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر اسے مخاطب
کیا۔

"تمہارے جذبات مجھ سے چھپے نہیں' لیکن ابھی تمہیں اس لڑائی کے جہنم میں' جو ختم
ہوتے نظر نہیں آرہی' جھونکنے کا وقت نہیں آیا۔ یقین جانو جب بھی ایسا موقع آیا

تمہارے سارے ارمان نکل جائیں گے۔ ابھی انتظار کرو اور دیکھو۔"

"لیکن یہ ظلم ہے چاچا۔ میرے ساتھی محاذ پر مر رہے ہیں اور میں یہاں روئیں تو رہا ہوں۔ میرا دوست شیرو سینکڑوں میل دور بنوں میں دشمن سے برسرپیکار ہے اور میں یہاں....."

——— وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ شدت جذبات سے اس کا گلا رندھ گیا۔ لورالی نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف نظر بھر کر دیکھا' پھر اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر آگے بڑھ گیا۔

☆○☆

شرفو نے اپنی دانست میں یہ باتیں تخلیئے میں کی تھیں' لیکن وہ اس بات سے لاعلم تھا کہ جس پتھر کی اوٹ میں وہ دونوں محو گفتگو تھے' اس کے ایک کونے سے ٹیک لگائے زہراں نے ان کی ساری باتیں سن لی تھیں۔

"شرفو یہاں سے کیوں جانا چاہتا ہے؟" اس نے سوچا۔ "شاید میری وجہ سے' میری مسلسل سوگواری سے تنگ آ کر۔" وہ خود کو قصوروار گردانے لگی۔ "اسے کیا حق حاصل تھا کہ دوسروں کو بھی اپنے ساتھ رلاتی پھرے' لیکن اگر شرفو بھی چلا گیا تو کون اس کی غم گساری کرے گا۔ یہاں اس بھرے پرے پونچھ میں وہی تو اس کا سب سے نزدیکی عزیز تھا۔ باقی سب تو ایک ایک کر کے ختم ہو چکے تھے——— ایک جو تھا اس کی خبر بھی نہیں تھی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی کسی بلیدہ طاقت کے انتہائی مجبور کرنے پر وہ خواب کی سی حالت میں چلتی ہوئی شرفو کے سامنے آن کھڑی ہوئی جو پہاڑی کے دامن میں بہتے چشمے کے کنارے ایک درخت سے ٹیک لگائے اپنی گود میں رائفل رکھے پتھروں سے ٹکرا کر جھاگ اڑاتے پانی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"کیا مجھ سے بہت تنگ آ گئے ہو شرفو؟" اس کی آمد سے بے خبر شرفو اچانک اس کی آواز پر چونکا۔

اس نے گردن دوسری طرف موڑی تو زہراں کو اپنے سامنے پایا جس نے اپنے بکھرے بالوں کو سینے سے باندھ کر خود کو ایک بڑی سی چادر میں ڈھانپ رکھا تھا' لیکن جس کے جسم سے خارج ہوتی ہوئی برقی رو چادر کا پردہ چاک کرتی ہوئی باہر نکل کر شرفو کے دل و دماغ میں [illegible] کی لہر دوڑا رہی تھی۔ وہ پل دو پل سے زیادہ اس کے چہرے پر نظریں نہ جما [illegible] اس نے گردن جھکا لی۔

[illegible] نے جھیں تک بھی تو بہت کیا ہے۔" زہراں نے [illegible] وہ سری بات بھی کہہ کر سر [illegible] سے اس کی طرف دیکھا۔

[illegible] شرفو نے جواب میں کچھ کہنا چاہا' لیکن اس کا تو جیسے حلق سوکھ کر رہ گیا تھا۔ اسے یوں [illegible] وہ اب کبھی بول ہی نہیں پائے گا۔ "تیرا تا شرفو! کیا کہہ دیا ہے میں نے تمہیں؟ ایک [illegible] اور یہاں کون ہے میرا؟"

——— شرفو کو زہراں کی اس بات نے لرزا کر رکھ دیا۔ وہ زہراں کو کیسے بتاتا کہ پیچھے وہ [illegible] ہے جو ازیتناک جنگ اس کے اندر چھڑی ہوئی ہے' اس سے کہیں بہتر تھا کہ وہ محاذ [illegible] ہوا شہید ہو جاتا۔

"نہیں زہراں۔" اس نے حوصلہ کیا۔ "اگر تم ایسی بات سوچو گی تو مجھے بہت دکھ ہو گا۔ میں تو صرف اس لیے کہہ رہا تھا کہ یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہوں۔ میرا ضمیر ملامت کرتا ہے۔ مجھے شرم آنے لگی ہے خود سے۔"

زہراں نے دوبارہ اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں اب نمی تیرنے لگی تھی۔ "شاید بے چارے کو میرے دکھ نے غمگین کر دیا ہے۔" اس نے سوچا۔ وہ اس سے زیادہ بہتر جواز بھی تلاش کر سکتی تھی۔ "دیکھو شرفو! تم شیرو کے دوست ہو اور مجھے بے حد عزیز، لیکن میں تمہارے لیے کوئی مجبوری نہیں بننا چاہتی۔ اگر تمہیں میری حفاظت کے خیال سے یہاں رکھا گیا ہے تو مطمئن رہو۔ تمہارے دوست کی غیرت پر کوئی حرف نہ آئے گا۔ جاؤ اور غاصبو کو بتا دو کہ تمہاری رگوں میں بھی بڑا غیرت مند خون دوڑ رہا ہے اور تم آزادی کے لیے بہت کچھ قربان کر سکتے ہو' حتیٰ کہ اپنے دوست کا پیار بھی۔"

اس لمحے زہراں جوالا مکھی بن چکی تھی——— اس کی آنکھوں سے اٹھنے والے شعلوں کی لپٹیں شرفو کے دامن دل تک آ پہنچی تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولے' زہراں پروقار چال چلتی وہاں سے واپس ہو گئی۔

——— شرفو میں اتنی ہمت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ واپس جاتی زہراں کو نظر بھر کے دیکھ بھی سکتا۔

وہ چپ چاپ اٹھا' اپنی رائفل سنبھالی اور مجاہدین کے نزدیکی ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆○☆

پونچھ خاصا بڑا شہر اور مہاراجہ کے دور میں "پونچھ جاگیر" کا دارالخلافہ بھی تھا۔

ایک سایہ وہاں موجود تھا۔

نزدیک پہنچ کر جب اس نے نووارد کو پہچان لیا تو ہاتھ کے مخصوص اشارے سے اپنے قتل" دیا اور اس کے ساتھی اٹھ کر قریب آ گئے' پھر وہ سب ہیم وائرے کی شکل میں نووار کے گرداگرد بیٹھ رہے۔ امیر خان کی نظریں جب اس کے چہرے پر پڑیں تو اسے یاد آ گیا کہ اس نے آج صبح ہی جب وہ عمدو گوجر کے ساتھ چھاؤنی میں دودھ لے کر گیا' اسے دیکھا تھا لیکن کس روپ میں؟ یہ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

"قریباً" پچاس ساٹھ سپاہیوں کی ایک کمپنی میجر رام سنگھ کی قیادت میں وہاں موجود ہے۔ جلاول بھی وہیں ہے۔ میں نے اس تک منصوبہ پہنچا دیا ہے۔" اس نے سرگوشیوں میں مخاطب کیا۔ پھر وہ انہیں فوجیوں کی پوزیشنیں سمجھانے لگا۔

"ٹھیک ہے دوست۔ اب تم چلو۔" امیر خان بولا۔

"خدا حافظ۔" کہہ کر نووارد جس طرح آیا تھا' اسی طرح غائب ہو گیا۔

☆○☆

اس کی روانگی کے بمشکل دو تین منٹ بعد ہی وہ لوگ بھی وہاں سے اٹھ کر چل دیئے۔۔۔ ان کی کمان امیر خان نے سنبھال لی تھی۔ مسلسل اندھیرے میں چلتے رہنے کی وجہ سے اب ان کی آنکھیں کسی قدر دور دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔

چھاؤنی سے کچھ ہی دور وہ رک گئے۔ ان میں سے ایک نے جس کے ہاتھ میں ڈسچارجر کپ تھا' وہاں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ یہ جگہ چھاؤنی سے بمشکل پندرہ بیس گز دور تھی اور یہ امر ان کے لیے باعث رحمت تھا کہ یہاں سرچ لائٹ موجود نہ تھی' نہ ہی چار دیواری میں کوئی "چیک پوسٹ ٹاور" بنایا گیا تھا۔ رک جانے والے کو امیر خان نے ہاتھ کے مختلف اشاروں سے سمجھایا اور باقی ساتھی اسے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

روانگی سے پہلے امیر خان نے اپنے پستول پر سائیلینسر فٹ کر لیا تھا اور وہ ان سب کے آگے چل رہا تھا۔ ان کا رخ اس دروازے کی طرف تھا جو ایک طرح سے چھاؤنی کا عارضی دروازہ تھا اور جس کے باہر لگے بیریئر کے ایک کونے پر بنے لکڑی کے ایک کیبن میں دو سنتری سکڑے سمٹے بیٹھے تھے۔ انہیں اصولاً" تو اٹھ کر گشت کرنا چاہیے تھا' لیکن انہوں نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کر لی تھی کہ جب سے شیرو فرار ہوا ہے' میجر رام سنگھ لاکھ چوکنا اور محتاط ہونے کے باوجود کبھی رات کے وقت چھاؤنی کے بیرونی دروازے تک آنے کا حکم نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے ذہن پر ایک ہی بات سوار تھی کہ۔۔۔۔ اگر وہ رات کو

کہیں اور لاش تو مجاہدین اپنی دھشتگرد کارروائی مکمل کر کے گزریں گے۔

چاروں طرف زمین سے نیچی چیزوں کی طرف رینگ رینگ کر اس طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے رینگنے کا انداز بھی بالکل کمانڈو جیسا تھا' پھر ان میں سے وہ تو کمال کر گئے جنہوں نے امیر خان اور عمدو گوجر کی اس بوتل سے نئی بہا رہے تھے' جو ان میں سے ایک کسی طرح خبر دونوں سنتری رم کی اس بوتل سے نئی بہا رہے تھے' جو ان میں سے ایک کسی جیب میں چھپا کر یہاں لے آیا تھا۔

دونوں دوست ایک دوسرے کی متضاد سمت میں لیٹے تھے۔۔۔۔ امیر خان کی نظریں نیچی کے کیبن پر جمی ہوئی تھیں اور دائیں ہاتھ میں پکڑے پستول کی نال اس طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اکیم کے مطابق جب عمدو گوجر نے کیبن کی اپنی سمت والی دیوار کو آہست سے ٹھوکر لگائی تو اندر بیٹھے دونوں سنتری یوں بدکے جیسے انہیں کسی بچھو نے ڈس لیا ہو۔

"کچھ سنا؟" ایک نے دوسرے کو مخاطب کیا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں! کچھ بات ضرور ہے۔" دوسرے کی خوفزدہ آواز سنائی دی۔

"لیکن یار۔۔۔ یہ اس وقت یہاں کون ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔

"کہیں میجر صاحب ہی نہ ہوں۔" دوسرے نے اندیشہ ظاہر کیا۔

دونوں کا خیال چھاپہ ماروں کی طرف نہ گیا کیونکہ ابھی تک ان کی دانست میں وہ لوگ اس چل نہیں ہوئے تھے کہ اس طرح چھاؤنیوں پر بھی گھات لگا سکیں۔ دونوں اسی خیال کے تھے کہ میجر رام سنگھ تک ان کی ڈیوٹی سے غفلت کی رپورٹ پہنچ گئی ہے اور وہ خود اچانک چھاپہ مارنے آیا ہے۔

دونوں ایک کونے میں رکھے لکڑی کے بکس میں رم کی بوتل چھپا کر دونوں ہی اپنی اپنی رائفلیں سنبھالتے افراتفری میں باہر نکلے کہ اپنی ڈیوٹی پر مستعد ہو جائیں۔ امیر خان کو بس اتنا ہی کافی تھا کہ ہدف نظر آ جائے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس کا نشانہ کبھی خطا ہوا ہو۔ وہ اندھیرے میں صرف آواز پر نشانہ لگانے کا ماہر تھا۔ محض دو سیکنڈ کے وقفے سے دو گولیاں ایک دوسرے کے تعاقب میں لپکیں اور بوکھلائے ہوئے سنتری باری باری اپنے سینوں کے بائیں طرف ہاتھ رکھے کوئی آواز نکالے بغیر زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ صرف ٹریگر دبنے کی ہلکی سی آواز دو مرتبہ امیر خان کے پستول سے برآمد ہوئی تھی۔

دونوں بجلی کی سی پھرتی سے دم توڑتے سپاہیوں کے سروں پر پہنچ گئے تھے اور اس خطرے کے پیش نظر کہ مبادا ان کے منہ سے کوئی آواز نکلے' انہوں نے دونوں کے منہ پر

اپنے ہاتھ روک دیئے تھے۔

——پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ چاروں دیواروں سے چھٹے اندر داخل ہو رہے تھے اور ان میں سے ایک مشین گن والے کو ایک محفوظ پوزیشن میں لگا کر آگے بڑھ گئے۔ مشین گن مین اس بیرک کے سامنے نصب کی گئی تھی' جہاں سپاہی سو رہے تھے۔ انہیں یہاں گشت پر موجود پہرے داروں سے نمٹنا تھا۔

امیر خان ان سے الگ ہو کر ان کوٹھڑیوں کی طرف نکل گیا جہاں سجاول کو اس نے بند دیکھا تھا۔ مرد گوجر اور اس کے دوسرے ساتھی نے بھی مشین گن والے سے ہٹ کر اپنی پوزیشنیں سنبھال لی تھیں اور اب ان سب کو محض اپنے اس ساتھی کے اشارے کا انتظار تھا جو انہیں اطلاع دے کر واپس یہاں آ گیا تھا۔

——بالآخر وہ ساعت سعید بھی آ گئی۔ بیرک کے دروازے کے سامنے لگے "الارم" کے پاس انہوں نے ایک سائے کو کھڑے دیکھا۔ یہ الارم آگ لگنے کے خطرے کے پیش نظر بجایا جاتا تھا۔ سائے نے الارم کا بٹن دبایا اور انتہائی تیز ہوٹر بجنے لگا۔

——بیرک میں آگ لگنے کی اطلاع سے افراتفری پھیل گئی۔ سپاہی ہوٹر کی آواز پر چیختے چلاتے باہر لپکے جہاں ہلکی مشین گن نے انہیں چاٹنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ان پر مختلف اطراف سے پوزیشنیں بدل بدل کر پھینکے گئے دستی بموں نے قیامت ڈھا دی۔ مجاہدین کے اس دلیرانہ شب خون نے ان کے اوسان خطا کر دیئے۔ صرف ڈیوٹی پر موجود سپاہی ہی ایسے تھے جو کارروائی کر سکتے تھے' لیکن انہیں ابھی تک یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر یہ حملہ آور ہیں کدھر؟ وہ گولی چلائیں تو کس پر؟

☆○☆

امیر خان دیوار سے چمٹا اس طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے فائرنگ اور مرنے والوں کی چیخ پکار سے گھبرا کر باہر نکلتے گارڈ کو دیکھ لیا تھا اور اب وہ بے چینی سے اس لمحے کا منتظر تھا جب یہاں موجود پہرے دار اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے یہاں سے باہر نکلے' لیکن اس کم بخت نے شاید باہر نہ نکلنے کی قسم کھا رکھی تھی یا پھر اسے میجر رام سنگھ کی طرف سے بڑی سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں' وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

امیر خان کے اعصاب انتظار کی شدت سے تڑخنے لگے تھے۔ اس نے مزید انتظار کا عذاب سہہ لینے کی بجائے آگے بڑھ کر کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا وہ ان کوٹھڑیوں کے کمرے تک آ گیا جہاں اس کا غازی مرد--- سجاول خان

[illegible] کی سرحدوں پر لڑنا اپنے جیالے ساتھیوں کا مقصد تھا۔

[illegible] تک امیر خان کو یہاں موجود پہرے دار نظر نہیں آ رہا تھا' پھر جیسے خود بخود وہ [illegible] کی تہ تک پہنچ گیا اور گارڈ کی چالاکی کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اندازہ لگا لیا [illegible] یہاں موجود پہرے دار مضبوط اعصاب کا مالک ہے اور اپنے ساتھیوں کی طرح بوکھلا کر [illegible] جانے اور حملہ آوروں کی گولیوں کا شکار بننے کی بجائے وہ یہاں چھپ کر حملہ آوروں کا [illegible] تاکہ اچانک اندر گھس آنے والوں پر نشانہ آزما سکے۔ اسے شاید سجاول خان کی [illegible] کا احساس تھا اور یہ اندازہ بھی اس نے لگا لیا تھا کہ حملہ آوروں نے یہ سارا [illegible] سجاول خان کو دشمن کی قید سے رہا کروانے کے لیے پھیلایا ہے۔

[illegible] امیر خان جیلان اتحلی جنس کا تربیت یافتہ اور پیشہ ور کمانڈو تھا۔ اس نے اچانک اپنے [illegible] آگے بڑھائے اور اپنے سامنے دو تین گز کے ایریا میں تیزی سے پاؤں زمین پر مارے [illegible] یہ تاثر ابھرنا تھا کہ کوئی بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا ہے۔ اس کی یہ تدبیر کارگر ثابت [illegible] دوسرے ہی لمحے اسے ایک سیل کے سامنے سے بھاگ کر دوسری طرف جاتا ہوا [illegible] اور دکھائی دے گیا۔

[illegible] خطرناک حد تک چالاک تھا۔ گو کہ وہ امیر خان کے دھوکے میں آ گیا تھا' لیکن اس [illegible] نے بھی ایک چال چلی تھی اور ایک طرف سے دوسری طرف بھاگ کر تیزی سے اس طرح [illegible] گیا جیسے وہ بھی اپنی موجودگی کا دھوکہ دے کر وہاں آنے والے کو سامنے آنے پر آمادہ کر [illegible]

[illegible] دونوں میں ایک دوسرے کو دھوکا دے کر مارنے کا مقابلہ شروع ہو گیا اور دو ہی [illegible] پھر ان دونوں میں ایک دوسرے کو دھوکا دے کر مارنے کا مقابلہ شروع ہو گیا اور دو ہی [illegible] بعد اس مقابلے کا اختتام امیر خان کے پستول سے نکلی گولی نے کر دیا۔ گجرو کے کندھے [illegible] بائیں طرف دو گولیاں ایک دوسرے سے محض تین چار انچ کے فاصلے پر لگیں اور وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

اس کے ساتھ ہی پستول امیر خان کے ہاتھ سے جیب میں پہنچ گیا اور اس نے اسٹین گن سنبھال لی۔ بلی کی سی پھرتی سے وہ اس کوٹھڑی کے سامنے جا پہنچا جہاں اس کے خیال میں سجاول کو موجود ہونا چاہیے تھا' لیکن اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا جب اس نے سجاول کو وہاں سے غائب پایا۔ امیر خان دیوانہ وار ایک ایک کوٹھڑی میں جھانکتا پھرا اور ہلکان ہوتا رہا۔ آخر ایک کوٹھڑی کے فرش پر اسے گوشت کا ایک ڈھیر سا بنا نظر آیا' لیکن اس کے جسم میں جنبش نہیں ہو رہی تھی۔

HBC

امیر خان نے اسے آواز دے کر مخاطب کرنے کی بجائے اشین گن کا فائر کھول دیا۔ اشین گن کی گولیوں کی باڑھ سے بچنے کے لیے سجاول کو فوراً ہی زمین پر لیٹ جانا پڑا۔ امیر خان نے جھک کر دیکھا اس کی آنکھیں تو کھلی تھیں' لیکن چہرہ خون سے لت پت ہو رہا تھا۔ بری طرح سوج چکا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ کر پھیل گئے تھے۔

اس لیے وہ کریہاک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی' اس نے امیر خان کو جسم میں چنگاریاں دوڑا دیں۔ اس کی آنکھوں کی تیزی سے بدلتی رنگت نے امیر خان کو اندھیرے میں بھی سجاول خان محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے زمین پر گرنے سجاول کو گھسیٹ کر اضافی اور باہر کو پھینکا' لیکن ابھی وہ کوٹھڑی والے احاطے کے بیرونی دروازے تک اسے ایک جیپ جس کی ہیڈلائٹس بجھی ہوئی تھیں' بڑی تیز رفتاری سے اس طرف آتی دکھائی دی۔ اتنے اندھیرے میں اتنی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرنا کسی عام آدمی کا کام نہیں تھا۔ تھا یا تو یہ شخص پاگل ہے یا پھر جیپ اس کے کنٹرول سے باہر ہو چکی تھی۔

"کہیں میجر رام سنگھ ہی نہ ہو؟" اس نے سوچا کیونکہ اس افراتفری کے عالم میں ایک شخص تھا جو اپنے "شکار" کی فکر کر سکتا تھا۔ اپنی دانست میں شاید وہ اس لیے اس طرف آ رہا تھا کہ حملہ آوروں کے سجاول تک پہنچنے سے پہلے پہلے یا تو وہ اسے گولی مار دے یا پھر یہاں سے چپ چاپ نکل کر کسی محفوظ مقام پر لے جائے۔

میجر رام سنگھ کا خیال دل میں آتے ہی ایک مسکراہٹ خود بخود امیر خان کے ہونٹوں پر آ گئی۔ اس نے بڑی احتیاط لیکن پھرتی سے سجاول کو ایک کوٹھڑی کے آگے سے آمد و رفت اس طرح لگا دیا کہ نزدیک آنے پر ہی وہ نظر آ سکتا تھا اور خود وہ اس احاطے میں داخل ہونے والے دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اشین گن پر اس کی گرفت مضبوط تھی اور دھڑکتے دل سے انگلی ٹریگر پر جمائے وہ آنے والے کا منتظر تھا۔

---دوسرے ہی لمحے جیپ کے بریک دور سے چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ اور ساتھ ہی امیر خان کو جھٹکے سے جیپ رکنے کا احساس ہوا اور اس نے اپنی سمت آتے قدموں کی آواز سنی--- آنے والا ہر قسم کی احتیاط کو بالائے طاق رکھے جیپ سے اتر کر برق رفتاری سے احاطے میں داخل ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پکڑا ریوالور امیر خان کو بخوبی نظر آ رہا تھا۔

---اور جیسے ہی وہ اس سے چند گز آگے نکلا۔ امیر خان پکارا۔

"ہالٹ!"

"فائر!" سننے والے کے منہ سے نکلا اور اپنی دانست میں اس نے اشین گن

سنبھالتے ہوئے قدرے جھک کر اس کی طرف گھومنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہا' لیکن وہ ایک اٹل حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یہ کہ اشین گن کے برسٹ نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر گرا اور وہ خود بھی اس کے ساتھ ہی زمین پر گر پڑا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ یا آواز اس کے حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ امیر خان نے آگے بڑھ کر زمین پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"میجر رام سنگھ"۔ وہ بڑبڑایا۔ "بلاشبہ تم اسی موت کے مستحق تھے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد وہ سجاول کو میجر رام سنگھ کی اس جیپ میں پچھلی سیٹ پر لٹائے بڑی احتیاط سے حویلی کے بیرونی دروازے کی طرف جا رہا تھا---- دھماکوں اور گولیوں کی آوازیں رفتہ رفتہ مدھم پڑنے لگی تھیں۔

اس کے ساتھیوں نے بھی "شکار کھیلنے" میں کسی بخیلی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

---جیپ اس نے حویلی کے بیرونی دروازے کے ایک طرف کھڑی کر دی اور خود اس سے بہت کر اشین گن تان کر کھڑا ہو گیا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا اور تین چار منٹ بعد ہی باقی تینوں ساتھی بھی اس تک پہنچ گئے۔ واپسی کا سفر انہوں نے اسی جیپ میں کیا۔

جیپ "ڈیچارجر کپ" والے ساتھی کے نزدیک جا کر ٹھہر گئی' جس نے انہیں دیکھتے ہی اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ "کپ" سے نکلنے والے بم بڑی عجلت سے ایک ترتیب کے ساتھ پہلے سے مقرر کردہ ٹارگٹ پر گر رہے تھے---- ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ "چاند ماری" کی مشق کر رہا ہو۔

ان کے دیکھتے ہی دیکھتے چھاؤنی سے شعلے بلند ہو کر آسمان کو چھونے لگے۔ انہی شعلوں کی روشنی نے ماحول کو روشن کر دیا تھا اور وہ جلد از جلد اس "بربادی" سے نجات پانا چاہتے تھے۔

جیپ بڑی تیزی سے واپس بھاگ رہی تھی۔ "صاعقہ" کے جانباز' میجر رام سنگھ کو موت کی نیند سلا کر اور اس کی "چھاؤنی" کو نیست و نابود کر کے اپنے ساتھی کو اس کے خونی پنجوں سے چھین لائے تھے۔

لہو کا چراغ

جنرل طارق نے اس واضح حقیقت کا اعتراف کر لیا تھا کہ جب تک توپخانوں کو بکتر بند گاڑیاں نہ دی گئیں، ان کے لیے اس قیامت کی گولہ باری سے گزرنا ناممکن ہو گا کہ بھارتی فوج نے سری نگر کے اردگرد اپنی قلعہ بندیاں مستحکم کر لی تھیں اور ان کی ایمونیشن تک کر میدان میں آ چکی تھی۔

قبائلی حملہ آوروں نے دشمن کی پشتوں پر سامنے سے بڑا تیز اور جان توڑ حملہ کیا تھا کیونکہ دشمن کے پہلو یا بارش کی وجہ سے گھنے ہو جانے والے پانی نے بالکل محفوظ کر دیئے تھے، لیکن اپنی لاکھ جواں مردی کے باوجود وہ سری نگر کا دفاعی حصار نہ توڑ سکے کیونکہ ان کی توقعات کے بالکل برعکس شہر کے اندر سے کوئی مداخلت نہیں ہوئی تھی اور سری نگر میں موجود بھارتی افواج کو شیخ عبداللہ کی مہربانیوں کے طفیل بالکل محفوظ "عقب" میسر آ گیا تھا۔

جنرل طارق بڑی تیز رفتاری سے بھاگم بھاگ راولپنڈی پہنچا تاکہ کم از کم دو بکتر بند گاڑیاں ہی مجاہدین کے لیے حاصل کر سکے۔ اس کی پہلی ملاقات کرنل مسعود سے ہوئی جنہوں نے اپنے جذبہ جہاد سے سرشار جنرل طارق کو پوری بکتر بند رجمنٹ دینے کی یقین دہانی کروا دی۔ اس حوصلہ افزائی نے جنرل طارق کا سیروں خون بڑھا دیا، لیکن یہ خوشی بالکل عارضی ثابت ہوئی کہ ایک طرف تو رجمنٹ کو خفیہ طور پر تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا جب کہ دوسری طرف وقت قیامت کی چال چل گیا۔ جب ——— "سیاست کے فرزانوں" تک ان "دیوانوں" کی تازہ واردات کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے سر پیٹ لیا اور فوراً شور مچاتے جنرل طارق کی طرف دوڑے۔ ان سب کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا

"انڈیا ہم پر حملہ کر دے گا——— انڈیا ہم پر حملہ کر دے گا"

بے چارے جنرل طارق کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ میدان جنگ کا جیتا جرنیل حیرت اور افسوس سے کار پردازان سیاست کے منہ دیکھتا رہ گیا۔ اس نے لاکھ کوشش کر ڈالی

☆○☆

— تمام تاریخ حقائق جنرل طارق کے سامنے تھے اور ہزار طرح کی سوچیں بھی ——!

— لیکن اسی شام ان کے مکان پر ۶ نومبر کی رات کو کشمیر کی جنگ آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے لیڈروں کی خفیہ میٹنگ ہوئی تھی۔ یہ لوگ ہر صورت جہاد جاری رکھنا چاہتے تھے جب کہ حکومت کی فوج کو سختی سے غیر جانبدار رہنے کی ہدایات بھی پیش نظر تھیں۔

ان کشمیری لیڈروں کو کسی ایسے فوجی کی تلاش تھی جو اپنی جان اور مستقبل داؤ پر لگا کر ان کے مظلوم مسلمان بھائیوں کی مدد کو آگے بڑھے اور پہاڑوں کے خلاف برسرپیکار مجاہدین کو سنبھالے۔ یہ لوگ اس سے پہلے آرمی کے قریباً سب ہی سینئر کمانڈروں سے مظلوم کشمیریوں کی مدد کرنے کی اپیل کر چکے تھے اور اب ہر طرف سے مایوس ہو کر اس بخت آور جرنیل کے پاس آ گئے تھے جو اپنے خون جگر سے تاریخ کے اوراق پر وہ لہو رنگ کہانی لکھ رہا تھا جو نسلیں اپنی آنے والی نسلوں کو تحفہ میں پیش کیا کرتی ہیں۔

وہ سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے —— اور آخر ہوا کی لہروں میں ارتعاش ہوا۔

"میں جیوں گا وہاں —— میں مروں گا —— میں اکیلا ہی لڑوں گا۔ خدا کی قسم! جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے' بھارتی فوج کو آزاد کشمیر پر قبضہ نہیں کرنے دوں گا۔" جنرل طارق نے چٹان کے سے مضبوط عزم سے انہیں مخاطب کر کے ان کے مردہ چہروں پر زندگی کی لہر دوڑا دی۔

اور پھر ۷ نومبر کی شام ایک اسٹیشن ویگن جو جنرل طارق کا ہیڈکوارٹر بھی تھی اور جس میں ایک وائرلیس سیٹ' دو ریڈیو سگنلز اور کیپٹن تسکین الدین موجود تھے' تاریخ حریت کا نیا باب رقم کرنے کے لیے مکھ کی طرف روانہ ہو گئی۔

—— ان کے سنگ سنگ ان ہزاروں لاکھوں مجبور اور بے کس انسانوں کی دعائیں بھی تھیں جو اپنے پیاروں کو شہید کروا کے جانے کب سے کسی طارق بن زیاد کے منتظر تھے۔

طارق بن زیاد کا پہلا بحری بیڑا جبل طارق کے ساحل پر لنگر انداز ہو رہا ہے

☆○☆

لوزی ۹۰ ویں رات کے بعد پیچھے تھے۔ فضا میں موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ بربری جنگجوؤں نے سارا اسلحہ گھنگھرالت میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ ایک مکان بھی ایسا نہیں تھا جس کی چھت ان کی دھنائی، بمباری سے محفوظ رہی ہو۔ ایک جگہ جنرل طارق کو پکا ہوا لاشوں کی گنتی دیکھنی پڑی۔ قریب ہی جھونپڑیوں میں قبائلی لشکر یتیم تھا۔ جنرل کو یہ خبر خورشید کی طرح تھی جو ریسل سے بھی کامیاب ہو چکا تھا۔

ریسل پہنچ کر بڑی تیز رفتاری کی کہ راتوں رات ایک بحری بریگیڈ بارہ سو لا پہنچ گیا۔ جس کا مسئلہ ریسل سے بمشکل ۳۰ میل تھا لیکن یہ ۳۰ میل مکمل پہاڑی علاقہ تھا جس کے بیچ درمیان سے ایک سڑک گزر کر لوزی تک آتی تھی۔ ایسا علاقہ قبائلی جنگجوؤں کے لیے بالکل موزوں تھا۔ سڑک دونوں اطراف سے بند تھی۔ ایک طرف تو درختوں اور جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں تھیں جب کہ دوسری طرف تیز رفتار جہلم کی سرکش موجیں۔

دریا پر ایک پل لوزی سے قریباً پندرہ سولہ میل دور بنا ہوا تھا، لیکن پیدل گزر کر فوجی گاڑیوں اور بھاری اسلحہ ریسل سے پار نہیں اتارا جا سکتا تھا۔ سڑک نیزمی میزمی تھی اور راستے میں جگہ جگہ رسوں کے بنے ہوئے جھولا نما پل موجود تھے۔

بربری پر دشمن کے لیے رکاوٹ کھڑی کی جا سکتی تھی۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر "پکٹوں" کے ساتھ لیڈ دانش کر بھارتی لشکر کے بس کا روگ نہیں تھا کیونکہ قبائلیوں کی موجودگی میں "پکٹیں" بنانا ممکن نہیں تھا۔ اس کے لیے بے تحاشا نفری درکار تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ جوانوں کو بھرتا کر ایڈوانس کیا جا سکے۔

جنرل نے یہاں رک کر وقت ضائع کرنے کی بجائے فوراً اور راتوں رات آگے بڑھ کر راستے میں آنے والے ایک اہم پل کو اڑانے کا پروگرام بنایا تاکہ دشمن کی پیش قدمی رک جائے اور انہیں دفاعی مورچہ بندیاں قائم کرنے کی مہلت نصیب ہو۔

یہاں ذہانت سے کام لیتے ہوئے پیدل کے چند کمانڈو اور گھنٹیاں ہاتھ لگ گئیں۔ جنرل نے کسی طرح وہاں سے لوزی تک آئی۔ این۔اے (انڈین نیشنل آرمی) کے رضاکار جو جہلم کے کنارے کیمپ لگائے ہوئے تھے، ان رضاکاروں کے اس مختصر یونٹ کے ساتھ [illegible]

[illegible] کے ساتھ ہی [illegible] کے ساتھ ہی [illegible] کے ساتھ ہی [

میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں واپس جانے کے لیے نہیں آیا۔" اس نے غصہ
بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"ہم سب یہیں ایک ساتھ مر جائیں گے۔ ہم ——— " اس سے آگے وہ
بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

☆○☆

ان کا یکشن کمانڈر پھن داس مہاراجہ کی فوج کا ساتھ صوبیدار آگے ٹرک میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ باقی تمام یکشن پیچھے سکڑی کسی بیٹھی تھی۔ شیرو کے پہلو میں موجود غلام محمد بھی مہاراجہ کی فوج کا ساتھ حوالدار تھا' لیکن تھوڑے ہی عرصے کی ملازمت میں اس نے شیرو کو اپنا معتقد کر لیا تھا۔ وہ بظاہر تو ان پڑھ نظر آتا تھا' لیکن اس کی باتیں بڑے پڑھے لکھے مالوں جیسی تھیں۔

"میں پچھلے ہفتے جموں سے واپس آیا ہوں۔" اس نے خاموشی کو توڑا۔

"پھر؟" شیرو کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"تم نے ابھی تک بتایا نہیں کہ تم ہو کہاں کے رہنے والے؟" اس نے اچانک ہی شیرو سے پوچھ لیا اور شیرو کا خیال نبی خان کی طرف چلا گیا جس نے روانگی کے وقت اسے اس بات کی تاکید کی تھی کہ وہ اپنے پونچھ کے ساتھیوں کے علاوہ اور کسی کو اپنا رازدار نہ بنائے۔

"میں پونچھ سے آیا ہوں۔" شیرو نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

"پونچھ سے؟" غلام محمد کو حیرت ہوئی۔ "تم سے کس گدھے نے کہا تھا یہاں کری گڑھ آنے کے لیے؟ ادھر مظفر آباد کی طرف نکل جاتے۔" اس کے لہجے میں حقارت اور طنز نمایاں تھا۔

"نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔" شیرو نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

"پھر تو تم بہت مطمئن ہو گئے ہو گے یہ نوکری پا کر؟" اس کے لہجے کی کاٹ بڑی گہری تھی۔

"تم جموں کی کیا بات کر رہے تھے؟" شیرو نے چاہا کہ موضوع بدل کر اس سے جان چھڑا لے۔

"ہاں جموں ———" اس نے لمبی سانس بھری۔ "ادھر جموں کے سارے صوبے میں شاید ہی کوئی مسلمان زندہ بچا ہے۔ جموں' کٹھوعہ' ادھم پور' رام گڑھ اور ریاسی کے علاقوں میں ہندوؤں نے بھارتی فوج کی مدد سے انہیں چن چن کر مار ڈالا ہے۔ وہ مظفر آباد

وہ ہمارے ہی بھائی ہیں۔ ہم لوگ ہیں جو انہیں اپنے مسلمان بھائیوں سے صلح صفائی کی تلقین کر رہے ہیں۔ سنو!" اس نے شیرو کی طرف جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "یہاں جو کچھ ہو رہا ہے کمو کملا اور سب بیاد بن ڈاہا ہے۔ یہاں کانفرنس کے سیاسی مقتدیوں کی گڑبڑ ہی میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں جہاں شیخ عبداللہ سارا لشکر مسلمانوں کو اسلام کے نام پر بھیڑوں کی طرح ذبح کی طرف جا رہا ہے' ہانک کر لے جائے وہاں جموں میں امن امن کی رٹ کے معنی ہے۔"

"چاچا غلام محمد" شیرو نے انتہائی ضبط کا مظاہرہ کیا۔ "میں سیدھا سادا سپاہی ہوں' کوئی سیاسی لیڈر نہیں کہ تمہاری باتوں کی تہہ تک پہنچ سکوں۔ میرا کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے اور بس۔ جموں میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے مسلمانوں کا کیا پتہ!"

"اور ہاں" حوالدار غلام محمد نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ "یاد رکھو نفرت کا ردعمل صرف نفرت ہوتا ہے ——— نفرت! جب ہندوؤں کے دل میں نفرت کا جذبہ اور مستحکم ہو جائے گا اور یہ نفرت صرف جموں یا ہندوؤں کے نہیں' سارے کشمیر کے ہندوؤں کے لیے ہو گی۔ تب کیا کرے گا یہ شیخ عبداللہ ——— شیر کشمیر؟" آخری الفاظ اس نے خاصے طنزیہ اور حقارت سے ادا کیے تھے۔

"تم یہ سب کچھ مجھے ہی کیوں سنا رہے ہو؟" شیرو بالآخر چیخ پڑا۔ یکشن کے باقی تمام ہوم گارڈز انہیں چونک کر دیکھنے لگے۔

"سنو ———" حوالدار غلام محمد کی آواز خاصی بلند تھی۔ وہ اپنے انجام سے بے خبر نظر آ رہا تھا۔ "تم سدھن ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔ وہاں تمہارا قبیلہ ہندوؤں کے ساتھ زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہا ہے اور تم یہاں منہ اٹھا کر امن قائم کرنے آ گئے ہو۔" شیرو مسکرا کر چپ ہو رہا۔

ناسری نالے کے پاس پہنچ کر ٹرک رک گیا۔ شاید ان کا یکشن کمانڈر پل کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

"وقت وقت کی بات ہے" غلام محمد پھر بولنا شروع ہو گیا۔ "میں ۲۵ اکتوبر کو مہاراجہ کو بھی جو سری نگر سے بھاگ کر جموں جا رہا تھا' رکنا پڑا تھا۔ اس نے شاید اسی جگہ کھڑے ہو

کر پل نمبر ۸ سے آنے والے سکھوں سے کہا تھا "خالصہ! راج ہاتھ سے جا رہا ہے تو بچاؤ۔" اور جانتے ہو خالصہ جی نے راج دربار کو بچانے کے لئے کیا کیا؟" اس نے شیرو کے کندھے پر ہاتھ مار کر قریب کو ایک طرف ہٹا کر باہر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔ "انہوں نے اس وقت بونت میں پہلا قدم رکھا اور بے خبر اور نہتے مسلمانوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ مظفر آباد اور راولپنڈی کے سکھوں نے اپنا سارا غصہ بونت کے نہتی بھر پر نکالا۔ اب وہاں کیا رہ گیا ہے؟" حوالدار غلام محمد خاموش ہو گیا۔ اس نے بھن داس کی طرف آنا دیکھ لیا تھا شاید وہ ان لوگوں کو تازہ ہدایات دینے آ رہا تھا۔

"تم لوگ ذرا "وارم اپ" کر لو۔ ہم یہاں پانچ دس منٹ ٹھہریں گے۔"

تمام لوگ ایک ایک کر کے نیچے اتر آئے اور ہاتھ پیر ہلا کر اپنے شل ہوئے اعصاب اور جسموں کو حرارت پہنچانے لگے۔

——اس یکشن میں صرف یہی تین آدمی 'ڈرائیور' بھن داس اور غلام محمد ان کے لئے اجنبی تھے' باقی تمام لوگ وہی تھے جو پونچھ سے اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ کر آئے تھے۔ وہ سب شیرو کے صرف ایک اشارے پر کسی بھی لمحے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھے۔ شیرو نے بونت سے پہلے ہی کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر غلام محمد ان کے ساتھ نہیں تھا تو وہ ان کی مخالفت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

انہیں یہی مشن سونپا گیا کہ ٹرک پر قبضہ کر کے اپنی اصلیت چھپاتے ہوئے وہ لوگ بونت میں موجود بھارتی فوج پر قہر بن کر ٹوٹیں۔

یہ دس منٹ شام کو پورے ہوئے۔ بعد میں بونت پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ پہلی خصوصی ہدایت کے تحت روکا گیا تھا کیونکہ ابھی مقامی ہندوؤں اور سکھوں کے لئے بونت کے نواحی دیہاتوں میں "شکار" موجود تھا اور وہ لوگ دوران شکار بوم گارڈز کے اس یکشن کو جس میں زیادہ تعداد مسلمان سپاہیوں کی ہے' یہاں بلا کر کباب میں ہڈی بنانے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

☆○☆

شام کے گہرے سائے بونت کی فضا کو چار چاند لگانے کے لیے اب آہستہ آہستہ اپنے دامن میں سمیٹ رہے تھے۔

۔۔۔۔ کی ان لوگوں نے ناکہ بندی کا کام سنبھال لیا تھا جب اچانک ٹرک ایک دھچکے سے ۔۔۔ کے ۔۔۔ کے احساس ہوتے ہی تمام سپاہی پھرتی سے چھلانگیں لگا کر نیچے از

[illegible] ایک ہوشیار، چوکنا اور [illegible] سپاہی تھا۔ اس نے [illegible] اور [illegible] ایک [illegible] کو [illegible] دیکھا تھا اور ایک نیم پاگل عورت کو ایک بوڑھے شہری نے اپنی گرفت [illegible] اور [illegible] اس کی حفاظت کر رہی تھی۔ ان دونوں کی آنکھوں سے [illegible] ہو رہا تھا۔

[illegible] حوالدار غلام محمد ان کے درمیان سے نکل کر آگے بڑھا۔ اس نے [illegible] میں [illegible] کیا تھا۔ دونوں مقامی دیہاتی سکتے کا شکار تھے۔

"میری زبان میں انہیں مخاطب کیا تھا۔ "کچھ نہیں۔" بوڑھے نے سہمی سہمی آواز میں کہا۔ "پاگل ہے یہ۔"

"پیچھے ہٹو۔۔۔۔ آپ لوگ جائیں۔"

"مار ڈالا۔۔۔۔ غداروں نے مار ڈالا۔" وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر بھن داس کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے چلا رہی تھی۔ اس نے بچہ بوڑھے کے ہاتھ سے چھین لیا تھا جب کہ عورت بچی ہوئی شیرنی نظر آ رہی تھی۔

اس کا بس چلتا تو وہ اکیلی ہی سب کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتی۔ خوف اور دہشت سے محلہ سب کی سمجھ میں آ گیا۔ اس بدنصیب کی لڑکی کو وہیں بے آبرو کر کے قتل کر دیا گیا اور جب یہ جان بچا کر سری نگر کی طرف بھاگ رہے تھے تو ٹرک ڈرائیور نے لاپرواہی سے اس کے بچے کو مار ڈالا۔ صوبیدار بھن داس اسے کہا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"دیکھتی ہے سالی۔" کہہ کر اس نے اپنا ریوالور سیدھا کیا اور عورت پر گولی داغ دی۔

یک وقت دو فائر ہوئے تھے۔ ایک گولی بھن داس کے پستول سے نکلی اور پاگل عورت کے سینے میں لگی جبکہ بوڑھے کشمیری نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ خون میں بھیگ گئے۔ دوسرا فائر حوالدار غلام محمد نے کیا تھا۔ گولی صوبیدار بھن داس کی پشت پر لگی اور وہ منہ کے بل آگے جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ معاملے کی نوعیت جان سکتے' شیرو نے گن کا بولٹ گرنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا فائر ہوا اور گولی بھن داس کی کھوپڑی کو توڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

ٹرک ڈرائیور نے اپنی اسٹین گن سیدھی کی ہی تھی کہ شیرو کی گن سے نکلی گولیوں نے اسے چاٹ لیا۔ سبھی لوگ بھونچکے سے وہاں کھڑے تھے۔ یہ سارا عمل اتنی تیزی سے اور اچانک انجام پایا کہ کسی کو اپنی جگہ سے ہلنے کی مہلت بھی نہ ملی۔

سب سے پہلے شیرو ہی اس عورت پر جھکا جو اب بوڑھے کشمیری کے ہاتھوں سے نکل کر

دشمن پر جا پڑی تھی۔ اس کا منہ کھل گیا تھا اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابل رہی تھیں۔ سانسوں کا تلاطم دیکھ کر ہی پتا چلتا تھا کہ اس کے منہ میں پانی ہے۔ ایک گلاس سے پانی سے پہلے کہ کوئی سپاہی اپنی بوتل سے پانی اس کے منہ میں انڈیلتا، شیرو نے بخشا ہے غیرتوں کے لیے پانی کی ہر بوند بھی تنگ نہ تھی کہ ہم عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ شیرو نے حوالدار غلام محمد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ "چاچا غلام محمد! ہم آگے اس لیے نہیں جا رہے کہ جس حد تک ممکن ہو دشمن کا نقصان پہنچائیں اور پھر ایک ہی تک محدود نہ رہے۔ سارے کشمیر میں پھیل جائے۔" چاچا غلام محمد نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جن میں بیک وقت محبت اور حیرت کی پیش اٹھ رہی تھیں۔ "میں فوج سے ریٹائرڈ ہو چکا ہوں بیٹا، لیکن ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا کہ یہ سمجھ سکوں کہ دشمن کا گلا گھونٹ سکیں۔ میں تمہارے جذبے کو سلام کرتا ہوں۔ لیکن ابھی ان ہاتھوں میں اتنا دم ہے کہ پوچھ کی بوٹوں پر سلامتی بھیجتا ہوں جنہوں نے کشمیر کو ایسے غیرت مند سپوت عطا کیے ہیں جو کبھی پیچھے نہ ہٹ پائیں گے۔"

"یہ سب ہمارے ساتھی ہیں اور پونچھ سے ہم اکٹھے آئے ہیں۔" شیرو نے غلام محمد کو بتایا۔ باقی مجاہدین کی طرف سے بھی مطمئن کر دیا۔

بوڑھے کشمیری کی داڑھی بھی آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔ وہ سسکیاں لے کر رو دیا تھا۔ کبھی وہ بے بسی سے روتے روتے بچے کی لاش پر نظر ڈالتا، کبھی پاگل عورت کی لاش پر اور بچوں کی طرح سسکنے لگتا۔ پھر اچانک جیسے اسے چپ لگ گئی۔ اس نے اپنا پھٹی پھٹی میلی کچیلی قمیص کے پلے سے اپنا چہرہ صاف کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں رائفل چلانا جانتا ہوں۔" اس نے شعلے برساتی نظروں سے شیرو کو مخاطب کیا "اسے ایک وردی دے دو۔ دونوں لاشیں دفن کر دو اور ان دونوں کو اٹھا کر ان گھنٹوں میں پھینک آؤ۔" اس نے پھمن داس اور ڈرائیور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احکامات جاری کیے۔ "ان کی تلاشی اچھی طرح لے لینا۔"

مرنے والوں میں سے ایک کی رائفل اور گولیوں کا پٹہ اس نے بوڑھے کشمیری کو تھماتے ہوئے کہا۔ "ہم ان دونوں کا انتقام بھارتی فوج سے ضرور لیں گے۔ بخشا انہیں لیے ہزاروں معصوموں کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب دینا ہو گا۔"

سپاہیوں نے دونوں لاشیں کندھوں سے گڑھے کھود کر وہاں دفن کر دیں اور باقی دونوں کو گہری کھائی کی نذر کر دیا۔ اب ان سب کی کمان عملاً شیرو کے ہاتھ میں تھی جسے حالات نے

ہیں ان کا سامنا کرنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا تھا۔ اس نے اپنے دو ساتھیوں کو ایک طرف بھیجا اور ان سے مخاطب ہوا۔

"تم دونوں جاؤ اور دیکھو کہ کوئی زندہ تو نہیں بچا۔ الحمد للہ فتح ہمیں حاصل ہوئی ہے۔ ہم نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ ہم اپنے خدا کے حضور دعا کریں کہ وہ ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی نصیب فرمائے اور ہم کسی کو زندہ نہیں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے جوانوں کو ہدایات کے مطابق ان لوگوں کی موت کے متعلق وہ کہانی سمجھائی جو ان لوگوں نے آگے بیان کرنی تھی۔ اور خود حوالدار غلام محمد نے سری نگر سے آنے والی سڑک پر شہر کے باہر ہی بنے ہوئے بنگلے میں قیام کرنا تھا اور امن و امان قائم کرنے میں "متقامی پولیس" کا ہاتھ بٹانا تھا۔ وہ اپنے ہمراہ لے کر آئے تھے۔ ڈاک بنگلے پر موجود انسپکٹر اشونی کمار ان کا منتظر تھا۔

پھمن داس اور ڈرائیور مارے گئے۔ میرا نام پرتاب ٹھاکر ہے اور میں ہی اب اس ٹیکشن کا دوسری جلد عبور کرتے ہوئے ہم پر اچانک حملہ ہوا اور ہمارے سنبھلنے سے پہلے ہی ڈپٹی ہوں۔" شیرو نے اشونی کمار کے کچھ پوچھنے سے پہلے ساری کہانی سنا دی۔

"اوہ حملہ آور؟ یہاں سے تو کوئی....." اشونی کمار کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

شیرو کو بات کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اشونی کمار کی آنکھوں میں جھانکا جو اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ "یہ تمہارے بچنے کا کام نہیں انسپکٹر۔ ہمارا درد سر ہے کہ وہ کون تھے۔ میرے خیال میں شاید وہ حملہ آور تھے۔" اپنی کہی ہوئی بات کا ردعمل تلاش کرنے کے لیے اس نے دوبارہ انسپکٹر اشونی کمار کی آنکھوں میں جھانکا۔

"لیکن یہاں؟" اشونی کمار نے حیرت سے کہا۔

"اچھا انسپکٹر! جے ہند۔" شیرو نے مزید گفتگو سے بچنے کے لیے کہا۔

"مجھے اپنے جوانوں کے لیے لنگر کا انتظام بھی کرنا ہے۔" اور وہ آگے بڑھ گیا۔

"جے ہند!" انسپکٹر اشونی کمار کے منہ سے نکلا اور وہ بنگلے کی طرف جاتے شیرو کو دیکھنے لگا۔

☆○☆

رات ایک پہر بیت چکی تھی۔ ڈاک بنگلے کے بندوبست کیدار نے ان کے کمرے میں ایک

طرف لکڑیوں کا گٹھا کر رکھ دیا' پھر لکڑیاں آگ دھن میں رکھ کر بڑی سہولت سے بجھانے بجھانے اس نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر پہلے ہاتھ جھاڑے' پھر مونچھوں کی طرف دانت نکال کر بولا۔

"مہاراج جی! یہاں سب سے اچھی چیز لکڑی ہے۔ اس موسم میں تو خاص طور پر۔ میرے لائق کوئی سیوا ہو تو ضرور بتلیئے۔ ادھر گرمی کا سارا بندوبست موجود ہے۔ جو مسلمان چھوکریاں آئی ہیں نا' ایک دم پٹاخہ ہیں صاحب۔۔۔۔ ایک دم پٹاخہ۔ سونی لاج میں رہتے ہیں وہ لوگ۔"

"بکو مت اور دفع ہو جاؤ۔" شیرو کا ساتھی ضبط نہ کر سکا۔

چوکیدار نے اس ڈانٹ کو مسلسل لوگوں کا "نخرہ" جانا اور ہاتھ باندھتا ہوا باہر نکل گیا۔

پچھلے پندرہ سال سے اس ڈاک بنگلے کی چوکیداری کے ساتھ ساتھ یہاں آنے والے "صاحب لوگوں" کی اسی طرح خدمت انجام دے رہا تھا اور اب کافی حد تک ان صاحبوں کے مزاج سے آشنا ہو چکا تھا۔

"صبح ہونے پر ہی حالات کا صحیح اندازہ کیا جا سکے گا۔" شیرو نے چٹخی لکڑیوں پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"ہاں اس کے بعد ہی کوئی منصوبہ بندی ہو گی۔ میرے خیال سے ہم لوگوں کو جلد از جلد جموں کی طرف نکلنا چاہیے۔" اس کے سری نگر والے ساتھی نے جواب دیا۔

دونوں لیٹنے کے ارادے سے کمرے کی دیوار کے ساتھ زمین پر بچھے اپنے بستروں کی طرف چل دیئے۔۔۔۔ باقی گارڈز دوسرے کمروں میں موجود تھے۔

"۔۔۔۔ کسی ممکنہ "شرارت" کو شیرو نے نظر انداز نہیں کیا تھا۔ وہ حوالدار غلام محمد کے زیر کمان دس جوان اس ڈاک بنگلے کے گرد وا گرد باری باری پہرہ دے رہے تھے۔ اس نے خود کو تو اشونی کمار کے سامنے ہندو ظاہر کر دیا تھا' لیکن اشونی کمار کو یہ علم تھا کہ باقی تمام اردم گارڈز مسلمان ہیں۔ یہاں یہ تاثر عام پایا جاتا تھا کہ شیخ عبداللہ اپنی سیاسی طاقت بڑھانے کے لیے اردم گارڈز میں مسلمانوں کی تعداد بڑھاتا چلا جا رہا ہے اور اس بے چارے کے "منصوبہ امن" میں بھی متعصب ہندوؤں نے کیڑے نکالنا شروع کر دیئے تھے۔

ساری رات شیرو برف کے مرغزاروں میں زہراں کا تعاقب کرتا رہا۔ کبھی وہ برف سے ڈھکی ہوئی وادیوں سے' کبھی کسی شوریدہ سر ندی کی لہروں کے دوش پر اور کبھی برف کے تودے پر بنے جاتا جہاں وہ ان لوگوں کو چھوڑ کر آیا تھا۔ ہر جگہ' ہر موڑ پر

ہوں کو اس نے اپنا منتظر پایا۔

ہو اس بی اور سرور رات کا خاتمہ ایک جشن اور رقص پر ہوا۔ ان کے ہمراہ گلزار جشن
کر رہے تھے۔ ان دونوں کو منتظر پولیس والوں سے ملاقات کا اور ان کو
ہاتھ کرنا تھی۔ یہ بھی ہزم نے کر دیا تھا۔ پہلے سے ہاتھ تھے۔ ان کو ہلاک کرنے کے
ہاتھ ہو گئی کی طرف تھا جس کے مسلمان مالک کو قتل کر کے وہ مسلمان ملکیتوں نے
بنا جا رکھا تھا۔

☆○☆

ابھی دونوں پچھلے کی حدود ہی میں تھے کہ رات والا چوکیدار انہیں اپنی سمت آتا دکھائی
دیا۔ اس نے ایک فوجی کمبل اپنے جسم پر اچھی طرح لپیٹ کر خود کو سردی سے بچانے کا انتظام
خود بندوبست کر رکھا تھا۔ شیرو نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے ساتھی کو پرسکون رہنے کی
ہدایت کی۔

"بچے بند مہاراج جی!" اس نے سرکس کے بندروں کی طرح ہاتھ باندھ کر باہت ہلائی۔

دیکھیے ہو؟" شیرو نے زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی۔

"کہا ہے بھگوان کی مہاراج جی۔ ایک خبر سنانے آیا ہوں۔ ابھی ابھی ایک آدمی پہنچا ہے
بھدر واہ سے۔ ارے میں بھی کیا بیوقوف ہوں' پہنچا تو وہ مہاراج جی رات کو تھا' مجھے ابھی ہی!
ہے۔ ادھر جو کمپنی ہے نا ہوم گارڈز کی' اس نے اپنے پلاٹون کمانڈر کو مار ڈالا ہے۔" اس
نے بڑی مکاری سے آنکھ دبائی اور بولا۔ "بے چارہ ہندو تھا نا۔ یہ سالے مسلمان اعتبار کے
چل نہیں ہیں۔ ایسے واقعات تو ہوم گارڈز میں اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تو ہم خبریں پہنچی
جاتی ہیں۔ وہ تو بھگوان بھلا کرے سنگھ (جن سنگھ) والوں کا' جو کشتواڑ سے وہاں پہنچے اور
انہوں نے راتوں رات مسلمانوں کا وہ حشر کیا کہ بس سالوں کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہو گا۔
کچھ مال ادھر بھی پہنچا ہے مہاراج جی۔ ایک دم گرم مال ہے۔ کہیے تو آج ہی۔۔۔۔" اس
نے دوبارہ اپنی ایک آنکھ دبائی۔ ادھر سونی لاج پر جو گارڈ انچارج ہے نا پولیس کا حوالدار
بھوپت رائے۔ پکا یار ہے اپنا۔ بس آپ کے اشارہ کرنے کی دیر ہے مہاراج۔"

"اچھا۔۔۔۔ اچھا اپنے کام سے کام رکھو۔ زیادہ باتیں نہ کیا کرو۔" شیرو نے وہاں سے
آگے بڑھ جانے کا ارادہ کیا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ساتھی کے صبر کا پیمانہ اب
چھلکنے کو ہے۔

"ایک بات ہے سردار۔ ان مسلمانوں سے ارادہ ہمیشہ ہی مسئلہ کھڑا کرتا ہے۔" اس نے جلتے جلتے فکر ان کی سمت اچھال دیا اور "سہ ہنڈ" کر کر آگے بڑھ گیا۔ وہ "سونی لان" کے قریب سے گزرتے ہوئے دونوں کے پیچھے قدم اور فیصلے کی شدید ضرورت یاد تھا۔ "تمہارا ایک غلط قدم نہ صرف ان سب لوگوں کو مروا دے گا بلکہ تحریک اپنے ابتدائی مراحل میں زبردست صدمے سے دوچار ہو جائے گی اور جانتے ہم یہ برداشت کر سکیں گے یا نہیں۔"

دونوں سونی لان کے قریب سے بلند آواز پیدا کیے گزر گئے تھے اور ان کا رخ اب ہوٹل کی طرف تھا جسے مقامی لوگ "ر۔خیونی ہوٹل" کہتے تھے۔ ان کی آمد سے پہلے ہی خبر ہوٹل میں پہنچ چکی تھی۔ جبھی تو وہ موٹا سا سکھ سردار جو سامنے کاؤنٹر کے ایک کونے میں قوم کے ایک گدے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، انہیں دیکھتے ہی لپکا اور ان تک جا پہنچا۔

"ست سری اکال جی—— ست سری اکال! جی آیاں نوں! دھن بھاگ، ملہوترا تے بھائے کے ساتھ جو بھی تمہارے پاس تیار ہے لے آؤ۔" شیرو کے ساتھی نے اس کی مزید بکواس سے بچنے کے لیے جلن چھڑائی۔

"لوئے نگے۔" اس نے وہاں موجود ایک لڑکے کو آواز دی۔

"آیا باؤ جی۔" کاؤنٹر کے پیچھے سے ایک سر نمودار ہوا۔

تھوڑی ہی دیر میں چائے اور پوریاں ان کی میز پر موجود تھیں۔ اس دوران موٹا سکھ مسلسل ان کا دماغ چاٹتا رہا۔ "ادھر مظفر آباد میں اپنا ہوٹل تھا جی، لیکن ایسا نہیں۔ وہ گورو جی کی کرپا سے اس سے تین گنا بڑا ہوٹل مل گیا۔ وہ مالکا تیری لیلا بھی نیاری ہے۔ سنتے ہیں ڈوگرے۔" وہ اپنی ترنگ میں کہہ تو گیا لیکن فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ "کیا لینا جی۔ وہ بھی مجبور ہیں بے چارے ادھر پٹھانوں نے بھی تو ان کے ساتھ برا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ صدیوں جی! ایک رات میں سات ہزار ڈوگرے تو انہوں نے بارہ

[illegible] دونوں کے کان تو اس کی گفتگو پر ہی لگے تھے، لیکن ان [illegible] سردار کی گفتگو کا سلسلہ دو فوجیوں کی آمد پر ٹوٹا۔ دونوں ایک

ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔ ساتھ والی میز سے مزاحیہ کلمات نے انہیں متوجہ کر لیا۔

"کیا بجتے صبح ہی صبح تم مرے۔" سردار نہایت سے پیٹا ہوا ملہ کر قہقہہ کی طرف بڑھا۔ "واہ گورو—— واہ گورو۔ ست گرو نانک تیری لوٹ۔" اس نے جام شروع کر دیا۔

"لوئے ہوئے کیا ہے تیرے پاس؟" ان میں سے ایک لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ابھی لاتا ہوں صاحب جی۔" اس نے جان چھڑانی چاہی، لیکن وہ تو اس کی جان کو آ گئے تھے۔

"لوئے ہوئے۔ وہ سامنے بیٹھی لوگ کون ہے—— بیٹھی لوگ۔ جن کے پاس ترسم محمد گرم مال ہوتا ہے۔ کشمیر کا بیٹھی لوگ تو لودھر صاحب اشتر میں بہت مشہور ہے لیکن ادھر تو——" مرشد حوالدار کی آواز نشے سے لڑکھڑانے لگی تھی، پھر نجانے انہیں کیا ہوا۔ شیرو پر نظر ڈالتے ہی وہ نارمل ہو گئے۔ شاید انہیں ہدایات ہی ایسی دی گئی تھیں۔ موٹا سردار دوبارہ ان کے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔

"لوئے—— کہاں مر گیا ہے لوئے تو——!" اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے لڑکے کو تو ہانک دی جس نے حسب سابق کاؤنٹر کے پیچھے سے سر نکال کر اس کی طرف دیکھا—— "منورا گرم پوریاں نکال صاحب لوگوں کے لیے—— اور تازہ چنی کی چائے بنا کر لا۔"

"لایا سردار جی۔" لڑکا دوبارہ کاؤنٹر کے پیچھے غائب ہو گیا۔

"مہاراج جی! یہ جو سالہ اشونی کمار ہے نا—— یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ بڑا بدمعاش آدمی ہے۔ اس نے تو مسافروں کے ناک میں دم کر رکھا ہے اور ہوم گورنر والوں کا تو دشمن ہے دشمن---- اسے ہر مسلمان پر شک رہتا ہے کہ وہ ڈوگروں کے خلاف ہے۔ پہلے تو ہمارے پیچھے بھی کافی دیر تک لگا رہا—— بڑی مشکل سے جان چھڑائی ہے ہم نے اپنی۔"

"اچھا سردار جی۔ ہم چلتے ہیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ادھر ڈاک بنگلہ میں ہم لوگ رہتے ہیں۔ کوئی بات ہو تو چلے آنا—— پر تب ٹھاکر ہم ہے میرا اور جو تمہارا اشونی کمار ہے نا---- اس سے تو میں نمٹ لوں گا۔" شیرو نے سردار کے "ہا ہا" کرنے کے باوجود اسے مل لوا کیا اور دونوں باہر نکل آئے۔

ہوٹل کے باہر دھند اور سورج کی طویل لڑائی اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی اور فضا میں دھند غائب ہو گئی تھی۔ ان کے چاروں اطرف سبزے پر شبنم کے قطرے اب بھی بستے

[illegible]

☆○☆

سہیل کی ساعت مسلسل اور بھرپور تشدد سے اس قابل نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا بھی رہ سکے۔ یہ تو اس کی مضبوط قوت ارادی تھی جس نے کسی کمزوری کو اس کے نزدیک نہ پھٹکنے دیا اور کسی نہ کسی طرح دو چار روز ہی میں وہ اپنے پاؤں پر نہ صرف کھڑا رہنے بلکہ چلنے کے قابل بھی ہو گیا تھا۔

بجرنگ رام سنگھ کی موت کی خبر نے اسے خوشی کے بجائے مایوس کر دیا تھا۔ سہیل نے قسم کھائی تھی کہ وہ خود موذی کو اپنے ہاتھوں اس کے بھیانک انجام تک پہنچائے گا اور وہ اب اپنی اس قسم کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا' مگر دیکھتے ہی دیکھتے حالات نے اتنی تیزی سے پلٹا کھایا کہ سہیل اور اس کے ساتھی سوائے بے بسی سے تماشا دیکھنے کے اور کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔

پونچھ کی جاگیر کا دارالحکومت یہی پونچھ شہر تھا جس کی ۳ لاکھ ۸۲ ہزار مسلم اور ۳۹ ہزار غیر مسلم آبادی زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہی تھی۔ اس شہر کی خصوصی جنگی اہمیت کے پیش نظر فوج کو سختی سے حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے مورچوں سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹے۔ کوہالہ اور آزاد پتن سے دشمن کو رگیدتے ہوئے مجاہدین نے اسے پونچھ میں محصور کر دیا تھا۔ دوسری طرف وہ لوگ سالم حویلی اور مینڈھر کی تحصیلوں سے گزرتے راجوڑی تک آ گئے تھے۔ دشمن کے لیے پونچھ شہ رگ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ یہ شہ رگ کٹ جاتی لیکن اس کی سیاہ کاریاں رنگ لائیں اور ایک شاندار فتح کا موقع جان بوجھ کر ہاتھ سے نکل جانے دیا گیا۔

یہ کشمیر کی تاریخ حریت کا وہ اندوہناک باب ہے جس پر ماضی کی گرد کریدی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن جس میں چھپے المناک سوالوں کے جواب مورخ کو اس لیے بھی میسر نہ آ سکے کہ

[illegible]

پونچھ شہر میں چاروں طرف پھیل کر دشمن کا شب خون مارنے کے ارادے کو ناکام بنا دیں۔

نازی امیر خان اپنے درجنوں جوانوں کو شہید کروانے کے بعد بھی مایوس نہیں ہوئے اور زخمیوں کو کندھوں پر اٹھائے واپس آ گئے کیونکہ اب شہر کے اندر لوٹنا سوائے حرام موت مرنے کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

شہر کے اندر موجود مجاہدین اپنی معمولی رائفلوں اور ایک آدھ برین گن کے ساتھ دشمن پر "سرپرائز" یا پھر اکا دکا معمولی نوعیت کے شب خون مارنے کے ذمہ دار اور کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

نازی امیر خان کے دلیرانہ حملے کی ناکامی کے فوراً بعد کشمیر اور بھارت کے اتحاد کے تحت بھارتی فوجیں سارے کشمیر میں پھیل گئیں۔ پونچھ میں موجود "لینڈنگ کرافٹس" پر بھارتی فوجیوں سے بھرے بازار اترتے اور چڑھتے رہے۔ معمولی رائفلیں ان کا کیا بگاڑ سکتی تھیں؟

پونچھ کے باہر مجاہدین کا محاصرہ اب خاصا سخت ہو گیا تھا' لیکن ایک روز جب زخمیوں اور بیماروں کو شہر سے نکالنے کے بہانے تھوڑی دیر کی فائر بندی عمل میں آئی تو بریگیڈیئر پریتم سنگھ کے زیر کمان بھارتی فوج کا پورا بریگیڈ بڑی ہوشیاری سے شہر میں داخل ہو گیا اور

کامرے پر موجود کشمیری فوج اس تماشے سے محظوظ ہوتی رہی۔
جلد ہی بریگیڈ کے شہر میں داخل ہوتے ہی وہاں کا نقشہ بدل گیا۔ ان لوگوں نے شہر کے
چاروں اطراف زبردست مورچہ بندیاں کر کے شہر کو اب باقاعدہ کشمیر قلعے میں تبدیل کر دیا
تھا۔

☆○☆

"حالات تمہارے سامنے ہیں دوستو۔" امیر خان نے اپنے سامنے موجود پانچوں کو مخاطب
کیا۔

"بی خان نے آخری ہدایت یہی بھیجی ہے کہ ہم اپنی صوابدید کے مطابق کوئی فیصلہ کر
لیں۔ ہمارے لیے سری نگر اور وہاں سے پھر جموں تک جانے کا بندوبست بھی ہو چکا ہے۔
اب میں معاملہ تم پر چھوڑتا ہوں۔"

"یہ آخری ضرب ضرور لگانی ہو گی امیر خان! سجاول کی کمی بات کے پیچھے کارفرما مسرت
کا امیر خان کو اندازہ تھا' پھر بھی اس نے ایک کمانڈر ہونے کی حیثیت سے اپنے باقی ساتھیوں
کی طرف استفسار نظروں سے دیکھا۔ وہاں موجود ہر شخص آتش فشاں پہاڑ کی طرح کسی
بھی لمحے پھٹ جانے کو تیار تھا۔ پھر ایسے "غنیمت" مواقع سے فائدہ نہ اٹھانا ان کے نزدیک
کفران نعمت کے مترادف تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ ایک "ہدف" منتخب کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اب وہ
اس پر آپس میں بحث کر رہے تھے۔ ان کا انتخاب دریائے پونچھ کے کنارے دشمن کا ایک
کیمپ تھا جہاں گھوڑا بگھیوں سے وہ لوگ مجاہدین پر دن رات آگ برسایا کرتے تھے۔

زمین پر ایک نقشہ بچھا کر امیر خان نے ماہر جرنیلوں کی طرح اس پر لکیریں کھینچ کر ان
لوگوں کو اس مورچے کے گرد و گرد موجود رکاوٹوں اور مشکلات سے آگاہ کیا۔ انہوں نے مدد
گجر کو یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ کل رات کو اس علاقے میں "ریکی" کر کے دشمن کی
پوزیشنوں کا ایک مرتبہ پھر قریب سے جائزہ لے لے تاکہ وہاں عمل میں آئی کسی بھی نئی
تبدیلی سے وہ لوگ آگاہ ہو سکیں اور ضرورت کے مطابق اپنے پلان میں تبدیلی کر سکیں۔

دو سرے ہی روز پھر رات گئے وہ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ مدد گجر کے سامنے وہی نقشہ
بچھا ہوا تھا اور وہ اندازے سے پہلی لکیروں سے کچھ مختلف لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اس کی
بتائی ہوئی لکیروں کا ایک مرکزی نقطہ بہرحال تھا۔

"یہ سب سے اونچا مورچہ ہے جس پر ان لوگوں نے "میڈیم گن" عین اسی جگہ پر نصب کی ہے۔" اس

نے امیر خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے نقشے میں ایک
مقام پر انگلی رکھ دی۔ "محمد اقبال" والے پہاڑ تک کیسے پہنچا جائے گا؟" امیر خان نے
واپس لوٹ جانے کا تذکرہ کیے بغیر پوچھا۔
"ایک جگہ میں نے ایسی گھاٹی دیکھی ہے امیر خان۔ وہ کوہ پیما لوگ وہاں سے ہم
دشمن کے عقب پر اسی "بگر" کا بخوبی جائزہ لے سکتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے ہم صبح اسے دیکھ لیں گے۔" امیر خان نے کہا۔ "تم لوگ واپس کب
جانے ہو؟" اس دفعہ اس کے مخاطب وہ دو نوجوان تھے جو اس سے پہلے اس مہم میں اس کے
ساتھ حصہ لے چکے تھے۔
اپنی تنظیم کے اصول کے مطابق اس نے ابھی تک تمام لوگوں سے انفرادی طور پر کوئی
تیسری ملاقات تھی۔ امیر خان شاید یہ بات محسوس نہ کرتا لیکن افشاں کی غیر حاضری کی
وجہ سے آئی کہ وہ اپنے ہم کار کے متعلق ہمہ وقت متجسس رہتا ہے۔
"میں لینڈری سے آیا ہوں۔ یہ یہاں کا مقامی ہے۔" ان میں سے ایک نے مختصر سا
جواب دیا۔
امیر خان کو اس کے جواب نے احساس دلایا کہ اس کو ان دونوں سے یہ سوال نہیں کرنا
چاہیے تھا۔ "اصل میں' میں یہ چاہتا تھا کہ تم میں سے ایک ہمارے ساتھ جائے تاکہ ان
علاقے کی واقفیت رکھتا ہو۔ یہاں ہمارے اس مختصر لشکر کی حفاظت کے لیے بھی کسی نہ
کسی کا رہنا تو ضروری ہے' پھر ہم میں سے کوئی ایک تو بچ جائے جو ہمارے آپریشن کی خبر بی
خان کو پہنچا سکے۔" اس نے نوواردوں کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا۔
وہ رات انہوں نے اکٹھے ہی باری باری پہرہ بدل کر اپنے لشکر پر گزاری۔ صبح
جب شہر کے کسی کونے سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو سجاول' امیر خان اور مدد گجر دونوں
ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ طاقت ور شیشوں کی ایک دوربین
امیر خان نے اپنے گلے میں لٹکا کر اس پر کمبل لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے دونوں ساتھیوں کی
آستین گنیں بھی اسی طرح ان کے جسموں سے چپکی ہوئی تھیں۔
ان کے مطلوبہ مقام تک پہنچنے تک جہاں سے انہوں نے "بگر" کا نظارہ کرنا تھا' سورج
نہیں نکلا تھا' لیکن پرندوں کی ملی جلی آوازیں اگلی وادیوں کی آوازوں کے درمیان اپنا راگ
الاپ رہی تھیں۔ تینوں بخ بستہ چٹانوں پر چلتے اس جگہ پر پہنچے تھے۔ پہاڑوں کی سرخ سیاہ
چوٹیاں نیلے آسمان پر پھیلتی ایک پراسرار سی سرد روشنی میں لب ان کے سامنے نمایاں ہو رہی

تھیں۔

پتوں دم سادھے ایک لیلی چٹان سے چپکے بیٹھے تھے اس سمے وہ بے حد محفوظ تھا۔ دور دور تک فوجی مورچوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ صرف وہی راستہ محفوظ تھا جس پر وہ گزر کی سردی میں سفر کرتے ہوئے آئے تھے۔ اسے گزرگاہ کا نام دیا تھا۔ وہ پتوں اور اپنے پیچھے نیلوں میں بکر لگتے یہاں تک پہنچے تھے۔ سردی اور ماحول کی پراسراریت کے لئے پہلے احساس نے انہیں دم سادھ کر چپ بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دم توڑتے اندھیرے میں سہاول نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حد نظر تک جائزہ لیا تو وہ محمود کو دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کے دشمن کے مورچوں کے لئے ان دشوار ایسی جگہ دھونڈی تھی جہاں کسی بھی "سرپنگ بمبار" کا دھیان ہی نہ جا سکتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سورج کی پہلی کرن چنگی اور خوشبو کی طرح ان کے احساس کی گہرائیوں میں رچ گئی۔ وادی جنت نظیر نے گھور اندھیروں کا سیاہ غلاف اتار پھینکا تھا۔ یہاں دشمن کے بیچوں بیچ بیٹھے ان تینوں سرفروشوں نے جیسے اپنی زندگیوں پر پڑے خول کو بھی اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ ان سبھوں نے نئی زندگی کی نئی صبح کو سرد ہوا کے لمس اور دہکتے سورج کی لو رنگ کرنوں کے بوسے کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ ان کے چاروں طرف پھیلی چوٹیوں پر دھوپ نے نوزائیدہ بچوں کی طرح لرز لرز کر سانس لینا شروع کر دیا تھا۔ پہلی کرنوں نے سرکش مجاہدین کے عزم و استقلال کو ہدیہ تہنیت پیش کرنے کے لیے پہاڑوں کی پیشانیوں کو چومنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے سلسلہ ہائے کوہ پر پھیلی کرنوں کے سرد شعلے بھڑک کر اب لطیف ہوا کے برفیلے جھونکوں میں تبدیل ہونا شروع ہو گئے تھے۔

سامنے کا منظر نمایاں ہونے لگا تھا۔ ان کے سامنے والی پہاڑی سڑک پر ایک جیپ نمودار ہوئی۔ یہ سڑک تنگ درے کے بیچوں بیچ لہراتی بل کھاتی ہوئی چلتی تھی۔ جیپ کبھی اونچی چوٹی پر چڑھتی اور کبھی ڈھلوانوں سے لڑھکتی نظر آ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ چوٹیاں کشمیر کے بلند و بالا سپوتوں کی عظمت کی طرح بلند سے بلند تر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ پہاڑی سڑک کا کھنڈ والا استرے کی دھار کی طرح تیز اور باریک کنارہ انہیں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جیپ ایک خطرناک موڑ پر ان کی نظروں کے سامنے سے اوجھل ہو کر پہاڑی کے پیٹ میں کہیں اتر گئی۔

امیر خان نے اپنی گود میں رکھی دوربین کے شیشوں کو اپنی چادر کے ایک کونے سے صاف کیا اور دوربین آنکھوں پر جما لی۔ اس کی آنکھوں کے عین سامنے پستہ قد کی ایک

پہاڑی چوٹیوں نے گھنی ہریالی کے سحر انگیز رنگوں میں ڈوبنا شروع کر دیا تھا۔ [illegible] اس اختیار کر چکی تھی۔ یہ پہاڑی چوٹیاں [illegible] بھی رہی تھی۔

امیر خان نے دوربین کا فوکس [illegible] اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح واضح اور الگ الگ [illegible] ایک ایک ڈھلوان، ایک ایک اصلخان، چھوٹوں کی ایک ایک [illegible] کر دیکھی گھنی جھاڑیوں کا ایک ایک پتہ اس کے [illegible]

جھاڑیوں کا یہ سلسلہ پہاڑی کے وسط سے شروع ہو کر [illegible] ختم ہو گیا تھا۔ چوٹی سے ذرا نیچے بکھرے پتھروں کی [illegible] خان کی نظریں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ سیاہ کوئلی چٹانوں کے [illegible] اور کانٹے دار جھاڑیوں سے پھسلتی، اٹکتی، ڈگمگاتی اس کی نظروں کو [illegible] سے میڈیم گن کی بابر کو جھاکتی مل اور اس کے ساتھ ساتھ [illegible] دھار میں جکڑ لیا۔

"یہ لوگ یہاں تک پہنچے کیسے اور راشن اور ایمونیشن یہاں تک کیسے پہنچاتے ہیں؟" اس نے دوربین آنکھوں سے الگ کر کے محمود گوجر سے پوچھا۔

"امیر خان ——!" محمود گوجر نے اس کی طرف دیکھے بغیر سامنے پہاڑی پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ "دوربین کو شمال اور مشرق کے مرکز میں رکھ کر دیکھو۔"

سورج اب پہاڑی چوٹی کے سر پر چمکنے لگا تھا۔ امیر خان نے قدرے مشکل سے [illegible] کر دوربین کو سیٹ کیا تو اس کی نظریں تیز کرنوں میں نکھی ہوتی ہوئی اس سبزپوش چٹان سے ٹکرائیں جس کی بغل میں ایک پتلی سی لکیر پھوٹتی نظر آ رہی تھی۔ سورج کی روشنی میں [illegible] اور سیاہ عریانی اسے مسکرا مسکرا کر ان کے ارادوں کا مذاق اڑاتی نظر آئی۔ اس چوٹی پر کمین کو تباہ کرنا فوجی لحاظ سے قطعی ناممکن تھا۔

امیر خان کو الجھن سی ہونے لگی، پھر یہ الجھن غصے میں بدل گئی۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے ایسا سوچا ہی کیوں؟ "میں تمہارا زعم خاک میں ملا دوں گا۔ کل صبح جب سورج تمہارے سروں پر خدا کا عذاب بن کر طلوع ہو گا تو یہ سامنے کا منظر بدل چکا ہو گا۔ تب اس محفوظ بنکر کے پرخچے اس میں موجود "میم راجوں" اور ان کے آتشیں ہتھیاروں سمیت اڑ چکے ہوں گے۔" اس نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔

دونوں ساتھیوں نے چونک کر امیر خان کی طرف دیکھا۔ دوربین اس کی آنکھوں سے
الگ ہو چکی تھی اور اس کے چہرے پر آنکھوں کی جگہ دو انگارے دہکتے ہوئے نظر آ رہے
تھے۔

یہ خیال انتہا لذت انگیز تھا کہ امیر خان کو اپنی رگ رگ میں طمانیت کا ایک سمندر
ہلکورے لیتا محسوس ہوا۔ اس پر نشے کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

☆○☆

رات اپنی مسافت بڑی تیزی سے طے کرتی دن کے تعاقب میں لپک رہی تھی۔ جنرل
طارق ایک پتھر پر پاؤں رکھے پاؤں کی پنڈلی پر دھرے ہاتھ کی ہتھیلی میں اپنی ٹھوڑی ٹکائے
سوچ میں غرق تھا۔ اس کے گرداگرد اوڑی کے اطراف میں پھیلے پہاڑوں کے درمیان وادی
ایک پیالے کے پیندے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔
وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے ۷۵ میل لمبی اس سڑک کو خالی چھوڑ دیا تو دشمن یلغار کرتا ہوا
کسی بھی لمحے پاکستان کی سرحدوں تک پہنچ جائے گا۔ اگر اسے صاف راستہ مل گیا تو وہ محض
تین گھنٹے میں مظفر آباد پر قابض ہو جائے گا۔

پٹھان یہاں سے فرار ہو کر اس کے لیے ایسا خلاء پیدا کر گئے تھے جس کو پر کرنا بظاہر
ناممکن نظر آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے بڑے "حساس مقام" سے پسپائی اختیار کی تھی۔ ممکن ہے
اگر وہ کشمیر کے کسی اور علاقہ کو خالی کر جاتے تو اس کے نتائج اتنے ہولناک نہ ہوتے، لیکن یہ
سڑک جو کشمیر کے سب سے زیادہ وسیع و عریض خطے میں سے گزرتی تھی، بڑی نازک اہمیت
اختیار کر گئی تھی۔

جنرل طارق سوچ رہا تھا کہ اگر بھارتیوں نے علی الصبح ایڈوانس نہ کیا تو بھی ان کی نگرانی
کرنے والے جہاز دن کا اجالا پھیلتے ہی یہاں آئیں گے اور دشمن کو "خالی علاقے" کی
خوشخبری سنا کر اس کے ایڈوانس کی رفتہ ہموار کر دیں گے۔ اگر خدانخواستہ دشمن اس سڑک پر
قابض ہو جاتا تو سارے کشمیر میں پھیلی تحریک آزادی اپنی موت آپ مر جاتی کیونکہ اس سے
لڑنے والوں کا مورال تباہ ہو کر رہ جاتا۔ یہ بڑی بھیانک صورت حال تھی۔

پاکستان سے رضاکاروں کے یہاں پہنچنے میں چند دن تو ضرور درکار تھے جب کہ صرف چند
گھنٹے کا تعین باقی تھا۔ اس علاقہ کو خالی چھوڑنا کشمیر اور پاکستان کی قسمت سے کھیلنے کے مترادف
تھا۔ اچانک اس نے ایک سائے کو اپنی طرف آتے دیکھ کر جنرل چونکا۔ قریب آنے پر جب
اس نے روشنی ڈالی ہوئے تو اسے اپنا اردلی نظر آیا۔ وہ اسٹیشن ویگن کو روانگی کی حالت میں

[illegible] کر کے اپنے جنرل کے پاس آیا تھا۔ جنرل کو سلیوٹ مار کر وہ پرے [illegible]
[illegible] کے اگلے حکم کا منتظر رہ گیا۔
[illegible] جنرل کے منہ سے [illegible] کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس
نے ایک [illegible] میں کہا۔
"میں [illegible]" اردلی نے گردن کو خم دیا اور وہ جس سمت سے آیا تھا اس سمت میں
اندھیرے کی چادر میں غائب ہو گیا۔

جنرل سوچ رہا تھا کہ دشمن کو اس بات کا احساس دلانا ضروری ہے کہ قافلہ پھنسا رہا
یہاں سے نہیں گئے ہیں اور وہ اوڑی میں اس کی گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ اس مقصد کی خاطر
کے لیے لازم تھا کہ تخریبی کارروائیاں کی جائیں۔ جنرل نے فیصلہ کیا کہ وہ سب سے پہلے
دشمن کے راستے میں آنے والے کچھ پلوں کو بیچ کر دے گا اور اپنی اس جنگی تربیت
کے ساتھ اس انداز سے پہاڑوں میں پھیل کر "سنائپنگ" کرے گا کہ دشمن کے ایڈوانس
کرنے کے کام پر اکا دکا گولیاں اسے سنبھلنے اور باآسانی آگے بڑھنے سے باز رکھیں۔

جنرل طارق نے اپنی فوج کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک حصے کو چند میل نیچے "ہیں"
بنانے کے لیے بھیج دیا اور چار آدمیوں کے ساتھ وہاں مورچہ بند ہو کر دشمن کا انتظار کرنے لگا۔

——— ساری رات ان لوگوں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح کے آثار جب واضح
ہونے لگے تھے۔ سامنے سے دشمن تو نظر نہ آیا البتہ عقب سے روشنی کی دو لکیریں جنرل
طارق کو اپنی سمت لپکتی نظر آئیں۔

بھیا دشمن نے راستہ کاٹ کر انہیں گھیرے میں لے لیا ہے کیونکہ پیچھے جو گھنٹوں سے
میدان اس کے لیے خالی تھا اور اس کی کوئی نقل و حرکت سامنے سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔
یہ تھا پہلا خیال جو جنرل طارق اور اس کے ہمراہیوں کے ذہن میں کھلبلایا۔

جنرل نے اپنے ساتھیوں کو فوراً پوزیشن لینے کا حکم دیا اور خود جیپ کی طرف بڑھنے لگا
جو تیز رفتاری سے اس کی طرف بھاگی چلی آ رہی تھی۔

——— صبح کاذب کے اجالے میں جیپ اب صاف دکھائی دینے لگی تھی۔ یہ پاکستان کی
باقاعدہ آرمی کی جیپ تھی۔ جیپ جنرل طارق سے چند گز کے فاصلے پر آ کر رک گئی اور کچھ
بعد دیگرے چار کبھرو پٹھان اس میں سے چھلانگیں لگا کر باہر نکل آئے۔ وہ شاید جنرل طارق
کو پہچانتے تھے کیونکہ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی ان کی ایڑیاں بجیں اور ان کے ہاتھ ان کی
پیشانیوں کو چھونے لگے۔

"ہاں ہاں تم لوگ؟" جنرل طارق نے انہیں جانتے ہوئے بھی سوال کیا۔

"سر ہم اپنی یونٹ سے ـــــ" ان میں سے ایک جو شاید ان کا کمانڈر تھا بولتے بولتے رک گیا۔

"بھاگ کر آئے ہو؟" اس کی بات میں ہی بات جنرل نے پوری کر دی۔

"یس سر۔" اس نے جواب دیا۔ باقی تینوں کے سر بھی اس کے ساتھ ہی جھک گئے۔

"کیوں؟" جنرل نے ان پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"ہم جہاد میں حصہ لینا چاہتے تھے۔"

"جہاد اور اسلحہ؟" جنرل کے ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ سے ان کے کھنچے اعصاب کو سکون میسر آنے لگا۔

"ہم نے یہ فیصلہ بالکل اچانک کیا تھا سر۔ یہ ایم سی کا جوان ہے۔" اس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ "جیپ لے کر کہیں جا رہا تھا۔ ہم نے نیکی فل کی اور اس طرف بھاگ آئے۔ افسوس ہم یونٹ سے اسلحہ نہ چرا سکے ـــــ!"

ان چاروں کے چہروں سے ٹپکتے جوش اور عزم نے جنرل طارق کو اس بات کا یقین دلایا کہ خدا کو اس کے حال پر رحم آ گیا ہے اور یہ چاروں جوان اس کے لیے تائید غیبی بن کر آئے ہیں۔ انہیں راستے میں بھگوڑے قبائلیوں کی قافلے بھی ملے تھے جنہوں نے انہیں بددل کر کے یہاں سے بھاگ جانے کو کہا تھا اور یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ محاذ پر اب کوئی رہا ہی نہیں' اگر کوئی بچا بھی ہے تو وہ کوئی پاگل ہو گا کیونکہ ان حالات میں وہاں کوئی عام انسان قیام نہیں کر سکتا۔

ان بے چاروں کو کسی نے اپنی رائفل بھی مستعار نہیں دی تھی۔ یہ چاروں جوان اپنا مستقبل اور نوکری داؤ پر لگا کر ایک عظیم مقصد کے لیے یہاں آئے تھے۔ ان کی آمد گویا کہ جنرل طارق کے لیے غنیمت تھی' لیکن اس نے ان کے عظیم جذبے کو "ایکسپلائٹ" کرنے کے بجائے انہیں حقیقت حال سے باخبر کرنا ضروری جانا۔

"کوئی کی صورت حال تمہارے سامنے ہے بہادرو۔ ہمارے ساتھی منہ موڑ کر چلے گئے ہیں۔ ہم فوجی لحاظ سے نہتے ہیں۔ ان رائفلوں اور برین گنوں کی حیثیت دشمن کے نزدیک کچھ بھی نہیں۔ پاکستانی افواج اور برسراقتدار طبقہ ہماری مدد کرنے کے بجائے ہمارے حوصلے پست کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ہم چومکھی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ دشمن اور اپنوں کی ریشہ دوانیوں کے خلاف ہمیں بیک وقت لڑنا پڑ رہا ہے۔ ان حالات میں کوئی بھی جذباتی فیصلہ تمہیں

کے بجائے انتہائی سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ میرا تم پر کوئی اختیار نہیں۔ میں بھی اس جنگ میں ہی اپنی زندگی کا مقصد ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم اگر چاہو تو اب بھی واپس جا سکتے ہو۔" جنرل نے اپنی بات ختم کی۔

"سر ہم میں سے ایک کی آواز جوش جذبات سے لرزنے لگی۔ "ہم مسلمان فوج کے سپاہی ہیں۔ ہم قرآن کی سرزمین کے رکھوالے ہیں۔ ہمارے بھائیوں پر کافر ظلم توڑ رہے ہیں۔ ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کو نیلام کیا جا رہا ہے اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے یہ تماشا دیکھتے رہیں ـــــ لعنت ہے ہماری زندگیوں پر۔"

ان کا عزم دیدنی تھا ـــــ "ہم آپ کے ساتھ ہی جئیں گے اور مریں گے۔" ان کے کمانڈر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

☆○☆

رات برق رفتاری سے اپنی دکان بڑھا رہی تھی۔ سورج نکلنے میں بمشکل ایک آدھ گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ دن چڑھتے ہی دشمن کی زمینی اور فضائی افواج کی سرگرمیاں شروع ہونے والی تھیں۔ جنرل نے ان چاروں کے جذبہ جہاد کو خراج تحسین پیش کیا اور انہیں رائفلیں اور ایک مشین گن دے کر اس ہدایت کے ساتھ آگے بھیج دیا کہ وہ دشمن کے ایڈوانس کرتے ہراول دستے پر فائر کر کے اس کا راستہ روکے رکھیں۔

جوں ہی یہ چار سرکٹ جانباز اپنے ٹھکانے پر پہنچے' دشمن کی توپوں کے دہانے بھی کھل گئے۔ دشمن کی میڈیم بیٹریاں بے تحاشا گولہ باری کر رہی تھیں۔ وہ لوگ بغیر کسی نشانے کے اندھا دھند آگ برسا رہے تھے' لیکن یہ گولہ باری بالکل بے سود تھی کیونکہ جو تھیں نظری میں تھی وہ ان کی تباہ کاریوں سے مامون و محفوظ تھی۔

ایک گھنٹہ تک اوڑی کی پہاڑیوں میں بھارتی گولہ باری نے زلزلہ بپا کیے رکھا۔ وہ لوگ صرف دور مار گولہ باری پر ہی اکتفا کر رہے تھے اور پیش قدمی کے سلسلے میں خاصے محتاط دکھائی دے رہے تھے۔ یہ چاروں جوان اگر دشمن پر چار راؤنڈ فائر کرتے تھے تو اس کے جواب میں وہ چار ہزار راؤنڈ فائر کرتا تھا۔ یہ سودا جنرل کے لیے برا سستا تھا۔

وہ وقت حاصل کرنا چاہتا تھا اور دشمن کو دھوکے میں رکھ کر وقت حاصل کرتا رہا۔ اس دوران دن کا بھرپور اجالا پھیلنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دشمن کی فضائیہ بھی حرکت میں آ گئی۔ ان کے درجنوں طیارے آسمان پر نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنی زمینی افواج کی تائید میں بم گرانے اور مشین گنیں فائر کرنا شروع کر دیں۔ جہاں وہ فائر کر رہے تھے' وہاں سے

پہاڑیوں اور قبائلیوں کے خلاف کی۔ مورچوں کے اور بنکر نہیں تھے۔
جنرل اور اس کے دو سرے ساتھی اس قیامت خیز گولہ باری سے بچنے کے لیے ایک پل کے نزدیک ایک چٹانی کگار میں محفوظ رہے۔ انہیں ان کے پیچھے بہرا پنے محفوظ ٹھکانے کی نمایاں نصیب ہوئی اور پل ناکارہ ہو کر ناقابل استعمال بن گیا۔
جنرل طارق نے اپنے ساتھیوں کو اس جگہ کر وہ پل کے کنارے پر اس طرح پوزیشن دا
ای کہ وہ لوگ زمین اور فضا سے کی جانے والی گولہ باری سے مکمل محفوظ تھے۔ البتہ
ان کے نشانے کی زد پر تھا۔ جنرل اور اس کے ساتھیوں کی مدد پر آئی تھی جب ان کی نظر
کے ایک سیکشن پر پڑی جس کے سپاہی اندھا دھند گولہ باری کی آڑ میں ایڈوانس کرتے اس
طرف بڑھ رہے تھے۔
پختہ شدہ پل کے نزدیک وہ رک گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ محفوظ آڑ میں جائیں ان پر
گولیوں کا مینہ برسنے لگا اور اس ہراول سیکشن کا بمشکل ہی کوئی جوان زندہ بچ نکلنے میں
کامیاب ہو سکا۔
دشمن نے اندھا دھند جوابی گولیوں اور گولوں کا مینہ برسایا، لیکن اس نے آگے بڑھنے کی
ہمت نہ کی۔ دراصل قبائلی پٹھانوں کا طریقہ جنگ ایسا خطرناک اور جلد کن تھا کہ دشمن
دشمن اب چھپ کو بھی پھونک پھونک کر پی رہا تھا۔ بھارتی فوج کا ہر سپاہی جانتا تھا کہ اگر وہ
قبائلی پٹھانوں کے گھیرے میں آگیا تو ایک اذیت ناک موت اس کا مقدر بن کر رہ جائے گی۔
قبائلی یہاں موجود نہیں تھے، لیکن ان کی پھیلائی دہشت بہت تاک بھوتوں کی شکل میں بھارتی
اور بدقسمت فوجیوں کے دل و دماغ پر مسلط تھی۔
شام کے سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ سورج کی سرد اور کپکپاتی روشنیوں کا سفر اپنے
اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ اندھیرا پھیلنے کے ساتھ ساتھ بھارتی توپوں کی گولہ باری بھی سرد پڑنے
لگی اور رات ہوتے ہی انہوں نے فائرنگ مکمل بند کر دی۔ تاریک رات کا ہولناک سناٹا
ہر سُو چھا گیا۔ یہ لمحات جنرل طارق اور اس کے ساتھیوں کے لیے غنیمت تھے۔ وہ لوگ
پچھلے اڑتالیس گھنٹے سے مسلسل بیدار تھے۔ سکون کے کچھ لمحات ان لوگوں نے آپس میں
بانٹ کر گزارے اور صبح کا دھندلکا نمودار ہونے سے پہلے دوبارہ سرگرم عمل ہو گئے۔
انہوں نے دشمن کے ہراول پر اپنی نظریں رکھی ہوئی تھیں۔ برق رفتاری سے یہ لوگ
کبھی ایک پہاڑی پر بھاگتے دوڑتے رہے۔ کبھی وہ ایک پہاڑی سے چند راؤنڈز فائر کرتے،
کبھی دوسری سے۔ اس دوران ان کی کوشش یہی رہی کہ دشمن کو دائیں بائیں بکھر کر

پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔
جنرل طارق کے ساتھی پیچھے ہٹتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ ایڈوانس کرتے جا رہے تھے اور ایڈوانس کرنے کے لیے ضروری تھا کہ بھارتی فوجی کو ہلاک یا زخمی کر دیا جائے۔
یہ کھیل پوری چھ دن تک جاری رہی۔ اس دوران جنرل طارق اور اس کے ساتھیوں نے دشمن کو مست رفتار اپنانے پر مجبور کر دیا۔ پہلے روز وہ اپنے ہدف سے سولہ میل پیچھے تھے، پھر وہ پندرہ میل پیچھے پکوڑھی کے مقام پر ایک کمپنی سے ٹکرائے۔ اس کمپنی نے مورچہ بندیاں کر رکھی تھیں۔ ابھی تک پاکستان سے کوئی مدد نہیں آئی تھی۔

☆○☆

شیرو نے حوالدار غلام محمد کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔
"مجھے علم ہے چاچا——!" اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں۔ "لیکن کوئی بھی جذباتی قدم ہمیں لے ڈوبے گا۔ آپ لوگ میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ شہر میں تین ملٹین فوج موجود ہے۔ اردگرد کے مسلمان اگر تو زندہ نہیں بچے، اگر کوئی بدقسمتی سے بچ بھی گیا ہے تو وہ اتنا خوف زدہ ہے کہ اپنی جان بچانے کے سوا اسے کسی اور بات کا ہوش نہیں۔ ہم جموں اور سری نگر کے درمیان بھارتی فوج کے سیلاب میں پھنسے بیٹھے ہیں۔ ہوم گارڈز کو پہلے ہی لوگ شیخ عبداللہ کی فوج سمجھتے ہیں اور مقامی ہندوؤں کو علم ہے کہ ہم مسلمان بھلے لاکھ نیشنلسٹ ہونے کی دہائی دیتے رہیں، وہ ہم پر کبھی اعتبار نہیں کریں گے۔ "سونی لاج" کی ساری کہانی میرے علم میں آچکی ہے۔ بخدا مجھ میں غیرت ابھی زندہ ہے۔ آپ لوگ ذرا صبر کریں۔ ابھی ہم صرف انتظار کرو اور دیکھو" کی پالیسی پر عمل کریں گے۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"
"اوہ میرے خدایا! اس بے غیرتی سے تو موت ہی آجاتی۔" حوالدار غلام محمد نے تو بھڑی۔
"ہوش ہمیں نبی خان نے اس طرف نہ بھیجا ہوتا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے یہ ظلم ہو رہا ہے اور ہم——" ان کا تیسرا ساتھی اپنی بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو رہا۔
"خدا کے لیے—— آپ لوگ ایسی باتیں نہ کیجیے۔ ابھی وقت نہیں۔ ابھی——"

اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔

"بہرحال حتمی فیصلہ تو تمی کو کرنا ہے' لیکن میرا فرض تھا کہ تمہیں اپنے خیالات سے آگاہ کر دوں۔ یہ لوگ باقی سے تمہارے ساتھ ہی آئے ہیں اور تم انہیں باقیوں سے زیادہ بہتر سمجھتے ہو ——— میں اور وہ انہیں محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور تم انہیں ہلاک کر دینے کا خیال رکھتا کہ یہ لوگ زیادہ دیر تک چپ رہنے والے نہیں ہیں۔" حوالدار غلام محمد نے اپنے مدعا کو واضح کیا۔

"میں بھی ان ہی میں سے ہوں چاچا غلام محمد اور میری رگوں میں بھی سندھوں کا باغیرت خون دوڑ رہا ہے۔ جب بھی وقت آیا' بخدا تم مجھے سب سے آگے پاؤ گے۔" اس مرتبہ فرط جوش و جذبات سے شیرو کی آواز کانپنے لگی تھی۔

☆○☆

اشونی کمار نے اپنی آنکھیں بدستور چوکیدار پر جما رکھی تھیں۔ "جانتے ہو تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے بڑے سرد اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"درگاں کی قسم مالک!" چوکیدار نے دونوں ہاتھ باندھ دیئے ——— "وہ ہندو نہیں۔"

"لیکن تمہیں بتایا کس نے؟" اشونی کمار نے پولیس والے مخصوص لہجے میں اس سے پوچھا۔

"مائی باپ! مجھے تک تو اسی روز شک ہو گیا تھا جس روز میں نے اس سے چھوکریوں کی بات کی تھی۔ پچھلے پندرہ بیس سال سے اسی ڈاک بنگلے پر صاحب لوگوں کی سیوا کرتا رہا ہوں مالک۔" اس نے چاپلوسی اختیار کی۔

"آگے بکو۔" اشونی کمار چلایا۔

"میں نے خود نگرانی شروع کر دی تھی اس کی۔" چوکیدار سہم کر بولا۔ "اسے میں نے نماز پڑھتے دیکھا تھا' پھر حوالدار جانکی داس کو میں نے اس کے پیچھے لگا دیا۔"

"ہوں....." اشونی کمار نے بڑے لمبی "ہوں" کہہ کر دوبارہ اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے ایک ہاتھ میں پکڑی بید کی چھڑی کو بار بار دوسرے ہاتھ پر مارتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ چوکیدار کمرے کے ایک کونے میں سکڑا سمٹا کھڑا تھا۔

معاملات اس کی توقع کے بالکل برعکس پیش آ رہے تھے۔ اسے تو یہی امید تھی کہ جب یہ انکشاف اس کے سامنے یہ انکشاف کرے گا کہ پرتاب ٹھاکر ہندو نہیں' مسلمان ہے تو وہ

اپنی بات کی تائید میں ڈھیروں ثبوت پیش کرے گا اور اسے شدید حیرت کی طرح اظہار سے نوازے گا۔ لیکن اس کے برعکس اشونی کمار نے اسے الٹے سیدھے سوالات کر کے پریشان کر دیا تھا۔ بالآخر وہ ایک فیصلے پر پہنچ کر رک گیا۔ کمرے میں رکھی میز کے ایک کونے پر ٹک کر اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے چوکیدار کو مخاطب کیا۔ "دیکھو!" اس کی آواز میں کہا۔ "تم یہ بھول جاؤ کہ پرتاب ٹھاکر مسلمان ہے یا تم نے اسے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ اس بات کا کسی سے بھول کر بھی ذکر نہ کرنا۔ کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ تم میرے پاس آئے ہو ——— اور ہاں تمہاری یہاں آمد کا تو کسی کو علم نہیں ہوا؟"

"جی نہیں۔ سرکار! صرف بھوپت رائے کو پتہ ہے کہ میں آپ کی سیوا کیا کرتا ہوں۔ وہی مجھے آپ کی آمد کی اطلاع دیا کرتا ہے نا ——— اس سے بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔" چوکیدار نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"ٹھیک ہے اس سے یہی کہنا کہ تم میرے پاس "تازہ مل" کی خبر کرنے آئے ہو۔ اب جاؤ۔" اس نے اپنی جیب سے ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"دھن ولو مہاراج جی۔" چوکیدار کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ بڑی تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اچانک اشونی کمار کی گونج دار آواز نے اس کے قدم پکڑ لیے۔

"ادھر نہیں۔" اس نے مخالف سمت والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "ادھر سے۔" چوکیدار جانتا تھا کہ جس دروازے کی طرف وہ اشارہ کر رہا ہے' اس کے باہر دور دور کسی جاندار شے کا وجود ہی نہیں ہے۔

انسپکٹر اشونی کمار کو بنوٹ کے مقامی بادشاہ کی حیثیت ہوم گارڈز کے آنے سے پہلے حاصل تھی۔ مقامی ہندو لٹیرے اس کی سربراہی میں بنوٹ اور اس کے گردوا گرد سارے علاقے میں لوٹ مار مچا رہے تھے۔ اس کا حصہ ہر دوسرے تیسرے دن نقدی' سونے اور کبھی کبھی لڑکیوں کی شکل میں اس تک پہنچ جاتا تھا۔ ہوم گارڈز کی اچانک آمد سے اس کا سارا طمطراق ختم تو نہیں ہو گیا تھا' لیکن اس میں وہ پہلے کی سی تیزی باقی نہیں رہی تھی۔

جن جن علاقوں میں ہوم گارڈز آئے تھے' وہاں خوفزدہ اور بچے کھچے مسلمانوں نے اب واپس آنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات انسپکٹر اشونی کمار کے لیے خاصی تکلیف دہ تھی کہ اب مسلمان اکا دکا مقامات پر مدافعت بھی کرنے لگے تھے۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ جیسے بھی ہو' ہوم گارڈز یہاں سے چلے جائیں۔ فوج کی طرف سے مایوس ہو کر اب اس نے خود کوئی

خطرناک قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے سامنے مسلمانوں کی بھلائی کا
"غیرت" کی شکل میں موجود تھی۔ اس کے اجداد نے اسے نسل در نسل ایک
تھا کہ یہاں پہلا مسلمان سندھ کے راستے محمد بن قاسم کی شکل میں داخل ہوا
کی یلغار پر چلا آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اور اس کے اجداد اپنی متعدد
مسلمانوں کو بے غیرت بنانے لگے تھے۔

"براہ راست ان لوگوں کی غیرت پر ہاتھ ڈالا جائے۔" اس نے سوچا۔
اور اب اشوانی کمار یہی خطرناک عزائم لے کر "سونی لاج" کی طرف جا رہا تھا۔
سائے لیے ہو رہے تھے اور وہ اپنے عملے کے سارے کے سارے
کے ساتھ اس طرف رواں دواں تھا۔

☆○☆

ڈاک بنگلے کی سمت آنے والی سڑک کے ایک کنارے پر درختوں کے جھنڈ میں
کرتے سپاہی اللہ داد نے جب پولیس کی اس بھیڑ کو اس طرف آتے دیکھا تو اس کا
پیش آمدہ خطرے کے احساس سے تھنکلا اندھیرے کی برساتی چادر نے آہستہ آہستہ
دم توڑتے اجالوں کو ڈسنا شروع کر دیا تھا' لیکن ابھی اتنا اندھیرا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ
کے منظر کو اچھی طرح دیکھ ہی نہ پاتا۔

چند لمحے کشمکش کا شکار رہنے کے بعد اس نے وہاں سے ہٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔
یہاں معمول کی گشت ڈیوٹی کر رہا تھا۔ شام ہوتے ہی ان لوگوں کو ڈاک بنگلے کے گرداگرد
علاقے میں شرپسندوں کی ممکنہ کارروائیوں سے نمٹنے کے لیے پہرے پر متعین کر دیا جاتا تھا۔
اگر وہ یہیں رہتا تو ان لوگوں کی نظروں میں آ جاتا' جو اسے گوارہ نہیں تھا۔ پولیس کا
طرف آتا تو کوئی خطرناک بات نہیں تھی' لیکن اتنے ہجوم کے ساتھ انسپکٹر اشوانی کمار کی آمد
نے اسے ضرور مشکوک کر دیا تھا۔ سپاہی اللہ داد نے دیکھ لیا تھا کہ آنے والوں نے رائفلیں
بھی تھام رکھی تھیں اور کئی ایک کے کندھوں سے لٹکتی گولیوں کی پیٹیاں بھی اسے دکھائی دے
تھی تھیں۔

سپاہی اللہ داد پیچھے ہٹ کر ایک محفوظ آڑ میں بیٹھ گیا۔ پھر اس نے مزید احتیاط کی خاطر
[illegible] کا اور دوسرے ہی لمحے وہ ایک درخت کی شاخوں میں چھپا بیٹھا اندھیرے
[illegible] آنے والوں کو دیکھنے لگا۔ سونی لاج سے یہ سڑک سیدھی ڈاک بنگلے
[illegible] وہ لوگ سونی لاج والے موڑ سے اسی عمارت کی طرف گھوم گئے

سپاہی اللہ داد کو سارے معاملات کی سمجھ آ گئی۔ وہ [illegible] اس نے
سپاہی اللہ داد پہلے آواز پہچانے پر مطمئن ہو گیا تھا۔ [illegible]
سپاہی اللہ داد اور غلام محمد اسے باہری برآمدے ہی میں کرسی پر بیٹھا ہوا چھوڑ کر
کر رہے تھے جب انہوں نے سپاہی اللہ داد کو بھاگتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔

"یہ کیا ہوا؟" اس کے وہاں رکتے ہی پوچھ گچھ سے پہلے حوالدار غلام محمد نے
"بھاگا!" مسلسل اور تیز بھاگنے سے سپاہی اللہ داد کا سانس پھولا ہوا تھا۔ سو بولنے کی
ساری پولیس آ رہی ہے۔ وہ ادھر..... سونی لاج کی طرف....."

"کیا سونی لاج کی طرف؟" غلام محمد نے اس کی بات لوک کر پوچھنا چاہا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں چاچا! وہ لوگ ادھر سونی لاج کی طرف گئے ہیں۔" سپاہی اللہ داد نے
اپنی بات مکمل کر دی۔

"کیا کرنے؟" اس مرتبہ شیرو اس سے مخاطب تھا۔

اسے اپنی بات کا جواب بجائے سپاہی اللہ داد کے سونی لاج کی طرف سے آنے والے
چیخوں نے دیا۔

"تمام جوانوں کو قابو کر لو۔" شیرو نے برآمدے سے کمرے کی طرف تیزی سے بڑھتے
ہوئے کہا۔

حوالدار غلام محمد نے اپنی جیب سے سیٹی نکال کر بجانی شروع کر دی۔ جب تک شیرو اپنی
اسٹین گن اور گولیوں کا تھیلا اٹھا کر باہر آتا' ہوم گارڈز کے وہ جوان جن کے کانوں تک سیٹی
کی آواز پہنچی تھی' وہاں پہنچ چکے تھے۔

"پانچ جوان یہاں رک جاؤ' باقی دو سیکشنوں میں بٹ جاؤ۔۔۔ پانچ جوان میرے
ساتھ جائیں گے۔ باقی کو تم میرے تعاقب میں لے کر آؤ۔ نزدیک آنے کی ضرورت نہیں'
جب تک میری طرف سے اشارہ نہ ملے' کوئی جوان گولی نہیں چلائے گا۔" شیرو نے تیز
برساتی آواز میں ہدایات جاری کیں۔

پانچ جوان اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی آگے بڑھ آئے۔ "میں آگے چلوں گا' تم
لوگوں کو میرے پیچھے لانا۔ فاصلہ دس قدم۔۔۔ احتیاط سے۔۔۔ آواز پیدا نہ ہو۔۔۔
ایڈوانس جوان!" اس نے آگے نکلتے ہوئے کہا۔

"پوزیشن جوان۔۔۔ دائیں تین جوان پھیلو۔۔۔ محمد بن بائیں نکلو۔۔۔ [illegible]

گز ـــــ تیار ہو جاؤ ـــــ ایڈوانس" اپنے عقب میں اسے حوالدار غلام محمد کی آواز

دی۔

ابھی وہ لوگ پندرہ بیس گز آگے ہی بڑھے تھے جب اچانک بنگلے کر ایک کونے کی طرف سے بھاگ کر اس طرف آتی دکھائی دی۔ اس کے پیچھے سے ایک چیخیں بلند ہو رہی تھیں جیسے کوئی قصائی کسی بکری کو ذبح کر رہا ہو۔ وہ بھاگتے بھاگتے کئی مرتبہ گرتے گرتے بچی تھی۔ شیرو ٹھٹک کر رک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھ سکے' سامنے سے بھاگ کر آتی ہوئی عورت اس سے ٹکرا گئی۔ خوف اور دہشت سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"کیا بات ہے ـــــ کیا ہوا؟" شیرو نے اس کا بازو تھام کر اسے خود سے الگ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"وہ ـــــ وہ درندے دیکھ ـــــ" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ خوف اس کے گلے میں کہیں اٹک کر رہ گیا۔

"گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہارے مسلمان بھائی ہیں۔" ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اسے تسلی دی' لیکن اس کی دہشت میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ خوف اور دہشت سے پھٹی آنکھوں کے ساتھ شیرو کو دیکھتی رہی۔

"اسے دیکھ موجود جوانوں کی حفاظت میں دے آؤ۔" شیرو کی آواز میں صاعقہ کی کڑک تھی۔

سپاہی سہمی ہوئی لڑکی کو جو مرے سے ننگی ہی کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کے چنگل سے نکل کر یہاں تک آ گئی تھی' بڑی آہستگی سے بازو پکڑا اور تیز تیز قدموں سے واپس آئیسہ کی طرف جوں جوں "سوئی لائن" کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے' وہاں بپا قیامت صغریٰ ان کی سماعت کو اور تیزی سے جھنجھوڑنے لگی تھی۔

شیرو نے اسٹین گن کو پوزیشن میں کر لیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو اس نے چند قدم پیچھے ہی ٹھہرنے کا حکم دیا تھا۔ ابھی وہ چند گز دور ہی تھا جب اچانک "ہالٹ" کی آواز سن کر رک گیا۔

"کون ہو تم؟" اندھیرے میں آواز بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک طاقتور ٹارچ بھی روشن ہوئی جس کی روشنی ایک پہلو سے نکلی اور بہت قدرے بلند ہو گئی۔

"میں ہوں گارڈ آف آنریری کیپٹن۔" شیرو کی آواز سنائی دی۔ "اپنے افسر کو بلاؤ۔"

اس نے پکارنے والے کو حکم دیا۔

"جی جناب!" اس کے عقب میں تھوڑی بہت حرکت ہوئی۔ پھر کوئی شخص تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ "میں انسپکٹر اشفاق کمار ہوں۔" یہ انسپکٹر اشفاق کمار تھے۔ جو اپنے ماتحت عملے کے ساتھ یہاں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھے۔ اپنے ماتحت عملے کے ساتھ یہاں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھے۔ "شیرو کی ہدایت کو سنتے ہی بتا دیا تھا۔ "میں انسپکٹر اشفاق کمار ہوں۔" یہ انسپکٹر اشفاق کمار تھے۔ جو

پے بعد دیگرے گھنے والی دھماکوں گولیوں نے اسے اوندھا کر دیا۔ یہی منظر اس کے باقی ساتھیوں کا بھی ہوا تھا۔

فائرنگ کے پس منظر میں اونچی ابھرتی مظلوم عورتوں کی چیخیں قیامت کا سماں بپا کیے ہوئے تھیں۔ بس چند منٹ ہی میں مدافعت دم توڑ گئی۔ آخر پولیس والے مار سے گئے تھے' چار زخمی تھے اور باقی شاید بھاگ گئے تھے۔ سہمی ہوئی خوف زدہ مظلوم مسلمان لڑکیاں انہیں رحمت کے فرشتے سمجھ کر ان کے حضور فریاد کناں تھیں۔

حوالدار غلام محمد اپنی یونیفارم سمیت وہاں آ گیا تھا۔ شیرو کو وقت کا احساس بڑی شدت سے تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ اول تو اب تک آرمی کو فائرنگ کی آوازوں سے صورت حال کا اندازہ ہو چکا ہو گا' اگر نہیں تو جیسے ہی آرمی تک کوئی "مظلوم پولیس والا" پہنچا اور اس نے روئے بسورے ہوم گارڈز کے مسلمان سپاہیوں کے ہاتھوں پولیس کے قتل عام کی خبر دی تو فوج فوراً" حرکت میں آ جائے گی۔

یہ اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی' لیکن اس کے "فولادی اعصاب" میں ایسی خوبی تھی جس کو حسین خان کی عقابی نگاہوں نے دیکھ اور پرکھ لیا تھا۔

"چاچا غلام محمد! اپنے ساتھ دس جوان لے کر تمام عورتوں سمیت ٹرک میں سوار ہو جاؤ اور ناشری نالے کے پاس پہنچ کر ہمارا انتظار کرو۔ اگر ہم لوگ ایک گھنٹے تک پہنچ جائیں تو بہتر---- ورنہ تم عورتوں کو لے کر سری نگر کی طرف نکل جاؤ۔" اس نے بوڑھے غلام محمد کو کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن تم لوگ....." غلام محمد نے کچھ کہنا چاہا۔

"یہ بحث کا وقت نہیں حوالدار غلام محمد۔" اس کا لہجہ غلام محمد کے لیے اجنبی تھا۔ "باقی جوان میرے ساتھ پیدل چلیں گے۔ ہم لوگ سری نگر روڈ پر رک کر صورت حال پر نظر رکھیں گے۔ ہیڈ کوارٹر کو سری نگر میں تازہ صورت حال سے آگاہ کر دو۔ ان کی طرف سے کوئی جواب آنے تک اگر فوج نے مداخلت کی تو ہم انہیں راستے ہی میں روکنے کی کوشش کریں گے۔ حوالدار غلام محمد اگر ایک گھنٹے تک میری طرف سے کوئی پیغام نہ آئے تو تم نالے کا پل اڑا کر سری نگر کی طرف نکل جاؤ---- جلدی کرو۔" اس نے مزید کسی کی کوئی بھی بات سننے سے پہلے وہاں سے ہٹ جانا مناسب سمجھا۔

وہ ٹرک بنگلے کی طرف بھاگتے ہوئے جا رہے تھے اور شیرو اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود سہمی ہوئی مسلمان عورتوں کو تسلی دے رہا تھا کہ ان کے جیتے جی کوئی مسلمان

بلوائی کی طرف بری نگاہ نہیں اٹھ سکتی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہاں ہوم گارڈز کا وہی ٹرک لڑکھڑاتا ہوا آ رکا جس پر وہ سری نگر سے چلے تھے۔ تمام عورتوں کو اس میں سوار کرانے کے بعد وہ خود بھی پیدل ہی اس میں جا بیٹھے۔

"اللہ تمہیں بیٹا! خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے۔ ابھی تمہیں بہت ضرورت ہے۔" حوالدار غلام محمد نے جھرجھری لیتے ہوئے شیرو کے قریب آتے ہوئے کہا۔ سب سے آخر میں ٹرک میں سوار ہوتے ہوئے کہا۔

"فی امان اللہ!" پیچھے کھڑے مجاہدین نے انہیں رخصت کیا۔

ٹرک جھٹکے سے اسٹارٹ ہوا اور جلد ہی سامنے والے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

شیرو ابھی واپس اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا ہی تھا کہ اسے وائرلیس آپریٹر ہریش صورت اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"سیٹ خراب ہو گیا ہے۔" اس نے شیرو سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"تم نے کوشش کی اسے ٹھیک کرنے کی؟"

"جناب ہر طرح کی کوشش کے بعد ناکام ہو کر ہی آپ تک آیا ہوں۔"

"اوہ----!" شیرو کے منہ سے نکلا۔

وائرلیس سیٹ کے بگڑنے کے بعد اب ان کے پاس سری نگر پیغام بھیجنے کا واحد ذریعہ پوسٹ کا ٹیلی گراف آفس تھا۔ سری نگر' بانہال' کشتواڑ' بھدرواہ' ڈوڈہ غرض ہر جگہ یہاں سے ہو کر ہی تار جایا کرتی تھی۔ اس لیے اس ٹیلی گراف آفس کو نیوز ایجنسی کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

شیرو جانتا تھا اس وقت پوسٹ ماسٹر گھوڑے بیچ کر سو رہا ہو گا۔ اس کا گھر پوسٹ کے ہندو محلے میں تھا جہاں تک اول تو ہوم گارڈز کے کسی سپاہی کے پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' اگر کوئی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر وہاں پہنچ ہی جاتا تو اس بات کے مواقع بہت ہی کم تھے کہ متعصب ہندو پوسٹ ماسٹر ان کی خاطر وہ آفس کھول دے گا۔

مقامی مسلمان آبادی کا صفایا کرنے کے بعد اب شرپسندوں کو ہر وہ شے بری طرح کھٹکنے لگی تھی جس سے مسلمانی کی ذرا بھی بو آئے۔ اس صورت حال کے باوجود ایک جوان پوسٹ ماسٹر کے گھر جانے کو تیار ہو گیا۔ شیرو کے کہنے پر اس نے اپنی وردی اتار کر سویلین کپڑے پہن لیے تھے۔

ابھی وہ بمشکل چند گز دور ہی گیا تھا کہ ہوم گارڈز کا ایک جوان بڑی تیز رفتاری سے بھاگتا ہوا اس طرف آیا۔ یہ کشتی پرول پارٹی کا جوان تھا جسے شیرو نے منٹو ہیڈ کوارٹر کے لیے بوٹ کی طرف روانہ کیا تھا اور ان لوگوں سے کہا تھا کہ وہ فوجیوں کے "عارضی ہیڈ کوارٹر" سے اس طرف آنے والی سڑک پر نظر رکھیں' جیسے ہی کوئی غیر معمولی حرکت نظر آئے' اسے اطلاع دی جائے۔

"فوج اس طرف آ رہی ہے۔" اس نے دور ہی سے چلاتے ہوئے کہا۔

"تمام جوان اپنا اپنا اسلحہ اٹھا کر سری نگر روڈ کی طرف چلو۔" شیرو نے انہیں حکم دیا اور ساتھ ہی وہ بھی ڈاک بنگلے کی طرف بھاگا تاکہ وہاں موجود ایمونیشن اٹھا سکے۔

☆○☆

دونوں گہری نیند سو رہے تھے جب اچانک ہی بوستان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ خواب بھی ایسا ہی ڈراؤنا تھا۔ وہ پونچھ کا رہنے والا ایئر مین آرمی کا سابقہ نائیک تھا اور پچھلے دو ماہ سے چوری چھپے "صاعقہ" کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس کے گلیوں پر پچھلے ہی ہفتے جب بھارتی فوج شہر میں داخل ہوئی تھی' حملہ ہوا تھا۔ بریگیڈیئر پریتم سنگھ نے شہر میں داخل ہوتے ہی اعلان کیا تھا کہ شہر کے گرد و نواح میں چھپے شرپسندوں کو گرفتار کروانے والوں کو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ مفرور شرپسندوں کے گھر بار کو آگ لگا دی جائے گی اور ان کے اہل و عیال کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اپنی اس دھمکی کو فوج نے اب تک کئی مرتبہ عملی جامہ پہنانے کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔ شہر کی مسلمان آبادی بری طرح سہمی ہوئی تھی اور کیوں کہ بریگیڈیئر پریتم سنگھ چاہتا تھا کیونکہ شہر کے اندر سے ہونے والی کوئی بھی جارحانہ کارروائی اس کی فوج کے لیے موت کا پروانہ ثابت ہو سکتی تھی۔

بوستان نے خواب میں اپنے بچے اور بیوی کا جو حشر دیکھا تھا' اس نے حقیقی دنیا میں آ جانے کے بعد بھی اسے لرزا کر رکھ دیا۔ اس کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ عام زندگی میں وہ کوئی بزدل آدمی نہیں تھا۔ اگر بزدل ہوتا تو کبھی نیا خان کی نظر انتخاب اس پر نہ ٹھہرتی۔ ضرور اس میں کوئی ایسی بات تھی جس نے اسے "صاعقہ" میں شامل کیا تھا۔

لیکن وہ کمزور لمحہ ——! وہ لمحہ اسے بزدل بنا گیا۔ یہاں اس شہر میں انسان کا جو مول کی طرح بک رہے تھے۔ جس کسی پر معمولی سا بھی شبہ ہو جاتا' اسے اس کے اہل و عیال سمیت ایک لمحہ کی تاخیر لیکن فوری موت سے دوچار کر دیا جاتا تھا۔ ابھی پرسوں ہی کا واقعہ تھا جب فوج

نے پونچھ بیل سے مقامی لیڈروں کو رہا کر کے پل پر پہنچایا اور وہاں پہلے سے تیار شدہ مسجد سے وابستہ کے حوالے کر دیا تھا جنہوں نے ان کے اعضاء کاٹ کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بمشکل ایک دو خوش قسمت ایسے تھے جو دریا میں چھلانگیں لگا کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوئے تھے۔

یہ واقعہ پونچھ کے مسلمانوں کے ذہنوں پر سوار تھا اور بوستان بھی اس بزدل بن چکے بوستان کا ذہن رہ رہ کر اپنے اکلوتے بیٹے اور بیوی کی طرف پلٹتا تھا جن کے بغیر اس کی زندگی بے معنی تھی۔ اس کا ان دونوں کے علاوہ اور تھا ہی کون؟ کبھی کبھی تو وہ خود حیران ہو جاتا تھا کہ آخر ایسی "کمزوری" کے ہوتے ہوئے اس نے اتنی خطرناک زندگی کیوں اپنا لی تھی۔ اسے اپنے رویے کی کوئی سمجھ نہیں آتی تھی۔

لیکن آج —— آج بوستان کی حیثیت ایک بزدل اور سہمے ہوئے بچے سے زیادہ اور کچھ نہیں تھی۔ اس کے دل و دماغ میں ایک جنگ جاری تھی۔ دماغ کا فیصلہ یہی تھا کہ بھارتی فوج کے مرکز پر پیش ہو کر "صاعقہ" کے مقامی اڈے اور عمدو اور اس کے دونوں ساتھیوں کے عزائم سے آگاہ کر کے جان کی امان اور انعام و اکرام پا لے جب کہ دل اس فیصلے پر ملامت کرتا تھا۔

وہ ضمیر کی اذیت ناک مار —— سہ رہا تھا اور اس کا دوسرا ساتھی آنے والی قیامت سے بے خبر گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اس کے ساتھی نے کھانا تیار کیا تھا۔ رات اس نے جاگ کر ہی گزاری تھی اور اب قدرے مطمئن ہو کر لیٹ گیا تھا کہ نیند نے اسے آ لیا۔

دوپہر تک بوستان کے اندر خاصی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی' لیکن بزدل خواہ مخواہ ہی سہی اس نے بزدلی ہی کو مصلحت جان لیا تھا۔ اس کے ساتھی نے کھانا تیار کیا تھا۔ انہیں یہاں سے رات کے دوسرے پہر امیر خان اور اس کے ساتھیوں کی آمد کے بعد ہی روانہ ہونا تھا۔ بوستان نے بمشکل دو چار لقمے زہر مار کیے تھے۔ اپنے ساتھی کے استفسار پر اس نے پیٹ کی خرابی کا بہانہ کر کے بظاہر اسے مطمئن کر دیا تھا' لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کے اندر برپا ہونے والی کشمکش اس کے رویے پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے اور اس کے درمیانی عمر کے ساتھی نے اس میں پیدا ہونے والی اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا۔

"کیا بات ہے بوستان' تم کچھ مطمئن نظر نہیں آ رہے؟" بالآخر اس نے اپنا شبہ بوستان پر ظاہر کر ہی دیا۔

"کچھ نہیں —— کچھ نہیں۔ بس یونہی دراصل پچھلے دو چار دن سے مجھے پیٹ کی

تکلیف نے تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔"

"شہر سے کوئی دوائی لے آؤ۔" اس کے ساتھی نے ہمدردی ظاہر کی۔

"ایسی کوئی خاص بات بھی نہیں، پھر شہر کے ملاحظہ....." بوستان نے بات ادھوری چھوڑ دی، لیکن وہ قدرے مطمئن بھی ہو گیا کہ اس طرح یہاں سے ہٹنے کا کوئی بہانہ تو اس کے ہاتھ آ گیا ہے۔

بوستان جیس رات کو نہ جانے اور کتنا سفر کرنا ہے۔ میرے خیال سے بہتر یہی ہے کہ تم کوئی دوائی لے آؤ۔" اس کے ساتھی نے کہا۔ بوستان کو بے چین تو پا رہا تھا، لیکن اس کی پریشانی کی وجہ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اب جیسے اس کی پریشانی جان کر مطمئن ہو گیا۔ "ٹھیک ہے تم کہتے ہو تو جاتا ہوں۔" بوستان اٹھ کھڑا ہوا۔

سہ پہر کو وہ اپنے ٹھکانے سے نکلا تھا اور سورج غروب ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے پریتم سنگھ کے ہیڈکوارٹر تک پہنچا تھا۔ ہیڈکوارٹر کے باہر کھڑا وہ بڑی اذیت ناک سوچ میں گرفتار تھا۔ اپنے زندہ ضمیر کو سلانے کے لیے اسے کسی دلیل یا منطق کی کوئی ابھی میسر نہیں آئی تھی۔ اسے رہ رہ کر عجیب و غریب خیالات گھیرے ہوئے تھے، پھر بچے اور بیوی نے ساری سوچوں کو نگل لیا۔ "یہ ساری بدوجہد بے کار ہے۔۔۔۔ ایک دم بکواس۔۔۔۔ کشمیر کبھی آزاد نہیں ہو گا۔ سب لیڈر سرکار سے ملے ہوئے ہیں۔ تمام شیر مُردوں کی ہڈی منہ لگتے ہی گیدڑ بن چکے ہیں۔ پاگل ہے نبی خان۔ ہم سب پاگل ہیں۔ خواہ مخواہ خود کو موت کے منہ میں ڈال رہے ہیں۔ اپنا گھر برباد کروا رہے ہیں۔ اس فوج کو کوئی نہیں ہرا سکتا۔ کوئی نہیں۔" وہ بڑبڑاتا خیموں کی اس قطار کی طرف بڑھ رہا تھا جو ایک عمارت کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور یہی تھا بریگیڈیئر پریتم سنگھ کا ہیڈکوارٹر۔

"ہالٹ" کی زوردار آواز سن کر وہ سہم کر رک گیا۔ ایک سپاہی رائفل تانے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ "اے کدھر جائے گا؟" آنے والے نے درشت لہجے میں اسے مخاطب کیا اور بوستان کو یوں لگا جیسے وہ کسی خواب سے اچانک چونک کر بیدار ہوا ہو۔

"میں۔۔۔۔ میں بریگیڈیئر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس نے گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا۔ سپاہی کو معاملہ کوئی گڑبڑ نظر آ رہا تھا۔ "ہینڈز اپ!" اس نے بوستان کو للکارا اور اس کے ہاتھ کی مشین گن کے نالچ اوپر اٹھتے چلے گئے۔

"تو ادھر چلو سالا! ابھی پتا آتا ہے تیرے کو بریگیڈیئر صاحب سے۔" سپاہی نے اسے رائفل کی نال سے دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔

وہ بوستان کی "مسیحائی" کی طرح اس کے آگے چل رہا تھا۔ بوستان اسے کبھی کبھار کے ساتھ سے لاتا تھا۔ "سالا!" اس نے اپنے افسر کو تعظیم دیتے ہوئے کہا۔ "یہ مسلا دیگیڈیئر صاحب سے ملنا مانگتا ہے۔" لفظ اس کے لہجے سے 'لمک' رہی تھی۔

کیپٹن پیارے چند نے اپنی میز کے سامنے ہاتھ اٹھا کر کہنے پر بوستان کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی امید کی جگہ ایک بار پھر وہی کھوکھلا پن نے اپنی جگہ بنا لی۔ کیپٹن پیارے چند نے میز پر رکھی گھنٹی پر زور سے ہاتھ مارا۔ دو مسلح سپاہی اندر آ گئے۔ اس نے بوستان کی طرف اشارہ کر کے انہیں حکم دیا۔ "اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا جنہوں نے بوستان کو فوراً سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی تین رائفلوں کی نالیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

"یہ..... یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟" اس نے بے بسی سے کچھ کہنا چاہا لیکن اپنے دائیں پہلو پر لگنے والی زوردار لات نے اسے الٹا کر رکھ دیا۔

"بکو مت! کپڑے اتارو۔" بوستان کے پیچھے کھڑے حوالدار نے ہونٹ چباتے ہوئے حکم دیا۔ لیکن اس کی پسلیوں میں چبھوئے تھا، کہا۔

خوف کی ایک سرد لہر بوستان کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ اس کے لہو نے ضمیر بول پڑا تھا۔ وہ کسی خوفزدہ بچے کی طرح بزدل بن گیا۔ بوستان نے ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار دیئے، صرف ایک زیر جامہ اس کے جسم پر رہ گیا۔

کیپٹن پیارے چند کے اشارے پر وہی حوالدار آگے بڑھا۔ اس نے دوبارہ بے خبری میں رائفل کا بٹ اتنی قوت سے بوستان کے پہلو پر جمایا کہ وہ اوندھے منہ فرش پر گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ایک رائفل کی نلی اس کی پیٹھ سے آن لگی۔ ایک سپاہی نے رائفل کے ساتھ ہی ایک پاؤں اس کی کمر پر رکھ دیا۔ دوسرے نے زیر جامہ پر زور زور سے ہاتھ مار کر اس بات کی تصدیق کر دی کہ یہاں کچھ نہیں۔

حوالدار نے اس کے تمام کپڑے پہلے پاؤں کی ٹھوکروں سے پھر ہاتھ سکوڑتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے ٹٹولے۔ اس کی سب جیبیں خالی تھیں۔ حوالدار نے سر کو نفی کے انداز میں ہلاتے ہوئے جب بوستان کے پاس کچھ نہ ہونے کی تصدیق کی تو کیپٹن پیارے چند کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"اٹھ کر کپڑے پہنو اور بیٹھ جاؤ۔" اس نے کمرے کے ایک کونے میں رکھے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔

بوستان جس کی ٹانگ پر برسنے والی گولیوں نے اسے بے حال کر رکھا تھا، گھٹنوں کے بل اسٹول پر جا بیٹھا۔ تینوں سپاہی گھرنے کے مختلف کونوں میں کھڑے ہو گئے۔

"کیا نام ہے تیرا؟" کیپٹن پیارے چند اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

"بوستان!" بمشکل اس کے منہ سے نکلا۔

"کیا کام کرتے ہو؟"

"میں صاحب انڈین آرمی کا سابق نائیک ہوں۔" اسے بولنے میں بڑی قوت صرف کرنی پڑتی تھی۔

"یہ کمانڈیر صاحب سے کیوں ملنا تھا؟" وہی سنسناہٹ اس کے کانوں میں گونجی۔

"صاحب میں ایک بہت اہم اطلاع لایا ہوں۔" بوستان نے کچھ توسلہ کیا۔

"کیا؟"

"اور ایک لڑکا ہے تحریب کاروں کا۔"

ابھی اس کا جواب نامکمل ہی تھا کہ ایک زوردار تھپڑ اس کے کان پر لگا اور وہ اسٹول سمیت زمین بوس ہو گیا۔ "سالا! ہمیں ڈانٹ کرتا ہے۔" کیپٹن نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

اتنا بھرپور طمانچہ تھا کہ بوستان کے کانوں میں گونجتی سنسناہٹ پہلے سے تشدد ہو گئی۔ اسٹول سے زمین پر وہ منہ کے بل گرا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ اس نے اپنی قمیص کی آستین سے منہ پونچھا اور دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"صاحب ——— ! صاحب! خدا کی قسم میں سچ بولتا ہوں۔ صاحب!" وہ گڑگڑایا۔

"بکتا ہے سالا۔" کیپٹن کے منہ سے گالی نکلی اور اس کے سپاہی بوستان پر پل پڑے اور وہ بازوؤں کی طرح پیٹا چلاتا رہا۔ پھر کیپٹن نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے جوانوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔

اس دو تین منٹ کی مار ہی نے بوستان کی ہڈیاں چٹخا کر رکھ دی تھیں۔ وہ زمین پر گرا بے بس پٹنے کی طرح رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مہلت نصیب ہونے پر وہ ہاتھ باندھتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ "میں سچ کہتا ہوں صاحب۔ میں سچ ———" وہ ایک ہی فقرہ روتے ہوئے دہرا رہا تھا۔

آدھ گھنٹہ مسلسل مار اور گالیاں کھانے کے بعد بوستان جب اس قابل ہوا کہ انہیں اپنی "سچائی" کا یقین دلا سکے تو جہاں اس کے جسم کا بند بند ٹوٹنے لگا تھا، وہاں کوئی بھیدہ طاقت

[illegible] لے جاؤ۔" کیپٹن پیارے چند نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی اور وہ جوان اس کے بازو پکڑ کر اسے باہر لے گئے۔

[illegible] کے پیچھے ہوتے ہی کیپٹن پیارے چند اور اس کے افسران اب بوستان پر مشتعل بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور [illegible] کیپٹن پیارے چند اور اس کے افسران اب بوستان پر مشتعل بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور اس کے ساتھ "سالا" کے دشنام کھلونے پر جھپٹ مارنے جا رہے تھے۔

☆○☆

تینوں کے اعصاب رات ڈھلنے کے انتظار میں تڑخنے لگے تھے۔ سورج کی مسلسل غیر حاضری کے ملے ہوئی۔ سارا دن تو بطور ساتھ رہا لیکن شام کے افق پر بادلوں کا ہیولا نمودار ہونے لگا تھا، ڈوبتے سورج کی کپکپاتی کرنوں نے بادل کے تاریک اطراف پر ایک خوبصورت حاشیہ بنا لیا تھا۔ اب اس حاشیے پر بھی رات کی ظلمتوں کا سایہ گہرا ہونے لگا تھا۔ پانچ روشنیاں دم توڑ گئیں۔

اندھیرے کے ہیبت ناک دیو نے ان کے سامنے بنی پہاڑی کو نگل لیا تھا۔ کبھی کبھی کسی سمت سے اچانک ٹارچ یا سرچ لائٹ کی روشنی جل بجھ کر اندھیرے کے اس طلسم سے ٹکرا کر دم توڑ دیتی تھی۔

سامنے کا سارا منظر گو کہ کشمیر کے مقدر پر پھیلی رات کی ظلمت نے ہڑپ کر لیا تھا لیکن امیر خان نے ہنکر کی ایک ایک تفصیل حفظ کر رکھی تھی۔ صبح سے اب تک اس نے اس کے سوا اور کیا ہی کیا تھا۔ کبھی کبھی جب سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک پر دوڑتی کسی جیپ کی روشنی موڑ کاٹتے ہوئے ایک خاص زاویے پر آ کر جب ہنکر کو جانے والے راستے پر پڑتی تو امیر خان کی رگوں میں انگارے دوڑنے لگتے۔

"چلو سنگیو!" اس نے اپنے بائیں بیٹھے دونوں ساتھیوں سے سرگوشی کی۔

"امیر خان بڑا لمبا ساتھ رہا ہے اپنا ——— ہم نے اٹلی سے مصر تک اکٹھے مہمت کی شاہراہ پر سفر کیا ہے۔ اب مجھے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہو۔" مدو گوجر نے اس کے بازو پر لرزتا ہوا ہاتھ رکھا۔

"نہ سنگی ——— نہ!" امیر خان نے بڑی آہستگی سے اس کے ہاتھ کو الگ کیا اور اپنا مضبوط پنجہ اس کے کندھے پر جما دیا۔ تم تو جانتے ہو مجھے ——— میں اتنی جلدی مرنے والا نہیں۔" اس نے کوشش کی تھی کہ اپنے لہجے کو غیر سنجیدہ بنائے رکھے۔

جاول خاموش تھا۔ اسے کچھ نہیں سوجھ رہی تھی۔ تینوں دوست ایک دوسرے سے
بڑی بڑی بغلگیر ہوئے۔ انہوں نے ہنستے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے ہونے والی کسی
بھی دانستہ غلطی کی معافی مانگی اور "ترب راکھا" پکارتے موت کی شاہراہ پر تین سمت کو
پھوٹنے والی تین راہیں اپنا لیں۔ وہ پتھروں پر بغیر آواز پیدا کیے چل رہے تھے مگر اور
جاول خان کو امیر خان نے ان کی پوزیشنوں سے آگاہ کر دیا تھا۔

ایک مخصوص مقام پر وہ تینوں اپنی اپنی سمت ہو لیے۔ مگر اور جاول نے اس راستے کو
کور کرنا تھا جو اس بنکر تک جاتا تھا اور امیر خان نے اپنے ذہن میں اس سے الگ ایک دشوار
گزار راستہ اختیار کر کے بنکر تک پہنچنا تھا۔

بنکر کے ایک کونے سے جھانکتی فیلڈ گن کی نال سے کبھی کبھی کوئی گولہ گونج دار آواز
پیدا کرتا' اپنے پیچھے چنگاریوں کی ایک لکیر چھوڑتا مجاہدین کی پوزیشنوں پر گرتا تو ایک گونج سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر لرزنے لگتی۔ پھر اس کا ہیبت ناک
تسلسل بھی خاموشیوں کے سمندر میں غرق ہو جاتا۔

امیر خان نے اپنے جوتے اتار کر پھینک دیئے تھے۔ اس کی اسٹین گن اس کے کندھے
سے جھول رہی تھی اور پوچ میں رکھے ہینڈ گرنیڈ محض ایک لمحے کی مہلت پر اپنی مہم پر روانہ
ہونے کے لیے تیار تھے۔ امیر خان نے بنکر کے ایک پہلو پر پھوٹتے اس پیچ دار اور بظاہر
ناقابل عبور راستے کا انتخاب کیا تھا جس پر چل کر بنکر تک پہنچنا کسی بت بنے اور جھلستے صحرا
کو پاٹنے سے کم ہرگز نہ تھا۔

کسی بھی پتھر پر پڑنے والا غلط قدم' کوئی بھی کنکر نیچے گرا دیتا یا کسی بھی جھاڑی سے پیدا
ہونے والی معمولی سی آواز اس کی موت کی پیامبر بن جاتی۔ کوئی اس طرف دیکھنے کا تکلف
بھی نہ کرتا۔ محض اس کے سر پر جھانکتی مشین گن کی نالی سے ایک سرخ لکیر پھوٹتی اور وہ
موت کے بے رحم ہاتھوں میں کچھ کرنے کی حسرت ہی دل میں لیے جا پہنچتا۔

پتھروں پر تیرتا ہوا اب وہ اس ڈھیر کے نیچے بنی چٹان کے تیز دھار سرے پر پہنچ چکا تھا
جس نے اسے اس ڈھیر تک پہنچانا تھا' جس کے اوپر بنے بنکر میں موت اپنا بھیانک جبڑا کھولے
ہر آنے والے کی منتظر بیٹھی تھی۔

امیر خان نے پتھروں کے ڈھیر پر سے ایک قدم چٹان پر رکھا اور زمان و مکان کی ٹھہری
ہوئی گردشوں میں سما گیا۔ یہ چند لمحوں کا سفر اس کے اعصاب توڑے ڈال رہا تھا۔ کسی بھی
نئے پیر اٹھانے سے کوئی کنکر بھی پھسل کر آواز پیدا کر سکتا تھا۔ پھر اس کے قدم اٹھانے اور

رکھنے کا عمل ایک ساتھ وقوع پذیر ہوا۔ دھماکے کی آواز سے اس کی نسیں ٹوٹنے
لگیں۔ تنی ہوئی سنگر از کر نیچے گرے تو امیر خان کو اپنی نبضیں ساکت ہوتی ہوئی معلوم
ہوئیں۔

پھر اس نے اس لمحاتی خاک گریز پاکیفیت کی بھینٹ چڑھا کر وہ شعور کے دھاروں میں واپس
آیا اور موت کی شاہراہ پر سنبھل سنبھل کر آگے بڑھنے لگا۔ اپنی ساکت نبض کے ساتھ اس
نے چٹان کا پل صراط عبور کیا اور نیچے پر پہنچ گیا۔

نیچے کی چٹان قدرے ہموار تھی۔ امیر خان نے برف سی چھریلی چٹان پر خود کو بغیر آواز
پیدا کیے گرا دیا اور لیٹے لیٹے ایک پتھر سے ٹک کر اپنے پوچ سے گرنیڈ باہر نکالا۔ یہاں تک
پہنچنے کی جو مسافت اس نے پانی تھی' اس کا تصور کرتے ہی کرب آمیز مسکراہٹ کی ایک لہر
اس کے ہونٹوں پر منجمد ہو کر رہ گئی۔

اپنے شعور کی دنیا میں لوٹنے پر جب اس نے اپنی جسمانی کیفیت کا جائزہ لیا تو اس پر
انکشاف ہوا کہ اس کے پاؤں تو کبھی کے جسم سے الگ ہو چکے ہیں۔ پاؤں کی جگہ برف میں
منجمد گوشت کے دو بے حس لوتھڑے اس کی ٹانگوں سے چپٹے ہوئے تھے۔ کسی نہ کسی طرح
اپنے بے حس اور منجمد قدموں پر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سینے سے پتھروں کی وہ دیوار
لگی ہوئی تھی جس میں چوکور دروازے کے اندر فیلڈ گن اور مشین گنیں نصب تھیں۔ اس
نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور اسے اپنے منہ تک لے جا کر امیر خان نے گرنیڈ سے پن الگ کی
اور پنجوں کے بل اوپر کو اٹھا۔

بنکر میں موجود توپچیوں کے ہیولے اندھیرے میں ابھرے' پھیلے اور پھیل کر سمٹ گئے۔
امیر خان کا ہاتھ سر سے بلند ہوا اور گرنیڈ مورچے میں جا گرا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دوسرے
گرنیڈ کی پن نکال چکا تھا۔ پہلے دھماکے کے ساتھ ہی دوسرا گرنیڈ بنکر میں گرا۔

دھماکے کے ساتھ اڑنے والی چیزوں میں امیر خان کا اپنا وجود بھی شامل تھا۔ پوری دنیا
کانپ ہی تو دہل گیا تھا۔ امیر خان اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ اڑتا ہوا سامنے والی چٹان
سے ٹکرایا۔ پھر اس کا وجود ٹکرا کر پیچھے کو الٹا اور سر ایک بڑے پتھر سے ٹکرا گیا۔ تازہ خون
کی ایک سرخ لکیر پتھر پر سے بہہ کر ایک کونے سے قطرہ قطرہ نیچے پھیلے پتھروں پر گر کر جمنے
لگی۔

"خدایا..... کشمیر.....!" اس نے دو الفاظ ہی بمشکل ادا کیے تھے۔

شہادت کی منزل

صوبے دار کیدار ہاتھ اپنی پتلون کے ساتھ پونچھ کر رہا تھا جب اس کو دور سے دو سائے بھاگ کر اس جانب آتے دکھائی دیئے۔

——اس سے پہلے فائرنگ کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ پہلے تو اس نے یہی سمجھا کہ یہ بلوائیوں کی کارروائی ہے، لیکن جلد ہی اسے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اس کی تو ساری زندگی میدان جنگ میں گزری تھی اور بیک وقت فائر کرتی مختلف گنوں میں سے علیحدہ علیحدہ ہر ایک آواز کی شناخت کر سکتا تھا—— فائرنگ میں لائٹ مشین گن کی آواز اس امر پر دلالت کر رہی تھی کہ معاملہ کچھ اور ہے۔

"ٹارچ جلاؤ۔" اس نے ایک جوان کو حکم دیا۔

ٹارچ روشن ہوتے ہی باقی ساری پلاٹون اٹینشن ہو گئی۔ ٹارچ کی روشنی میں انہیں دو حواس باختہ پولیس والوں کے چہرے دکھائی دیئے جو دیوانہ وار منہ اٹھا کر اس طرف بھاگتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

"مہاراج جی—— مہاراج جی! غضب ہو گیا۔" فوج کو اپنے سامنے دیکھتے ہی ان میں سے ایک نے ہانپتے ہوئے دونوں ہاتھ باندھ دیئے۔ دوسرا تو دہشت کے مارے بولنے کے قابل ہی نہیں رہ گیا تھا۔

"کیا ہوا——؟ کیا بات ہے؟" صوبے دار کیدار ناتھ نے فوجی دبدبے کا مظاہرہ کیا۔

"لوھر بوم گارڈز والے مسلمانوں نے سب کو مار ڈالا—— سب کو مہاراج جی—— کسی کو زندہ نہیں چھوڑا—— انسپکٹر صاحب بھی مارے گئے—— سب مارے گئے۔" وہ ایک ہی بات دہرائے جا رہا تھا۔

"مسلوں نے..... سب کو مار دیا....."

"ان کی یہ ہمت——!"

"یہ ایسے ہی کرتے ہیں۔"

"وہاں بھدر واہ میں بھی انہوں نے کل تین ہندو پولیس والے مار دیئے تھے۔" لانس نائیک بھارت بھارت کا زہر اگلنے لگیں۔

"صاحب جی! وہ سب چھوکریوں کو بھگا کر لے گئے ——— سب کو ———" دوسرا بھی ہمت کر کے منمنایا۔

"یہ مسلے ہوئے ان کی یہ ہمت!" صوبے دار کیدار ناتھ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"ایڈوانس کرو جوانو ——— ساری پلاٹون بکھر کر میرے ساتھ چلے گی ——— اے حوالدار صاحب تم ادھر کمپنی ہیڈ کوارٹر کو خبر کرو ———!" اس نے احکامات جاری کیے۔

حوالدار تو وائرلیس پر رابطہ پیدا کرنے لگا۔ باقی جوان فوراً جنگی تربیت کے مطابق مختلف پوزیشنوں میں بٹ کر بکھر گئے۔ وہ سب ایڈوانس کرتے ہوئے ڈاک بنگلے کی طرف بڑھ گئے۔

☆○☆

شیرو بھاگم بھاگ جب اپنے کمرے میں پہنچا تو اسے ایک زبردست ذہنی جھٹکا لگا۔ وہ لڑکی جسے اس نے ایک جوان کے ساتھ بھیجا تھا ——— اس کے کمرے میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔

———افراتفری میں شیرو کے ذہن سے اس کا خیال ہی نکل گیا تھا۔

———اس کے جسم پر کپڑوں کی جگہ چیتھڑے لٹک رہے تھے، لیکن ابھی تک وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ اسے اپنی جسمانی حالت کا جائزہ لینے کا خیال ہی شاید نہیں آیا تھا۔

شیرو اس پر ایک نظر ڈال کر دھک سے رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے ہپناٹائز کر دیا ہو۔ یہ لڑکی اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی کسی اور عالم کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ شیرو ایک ٹک اسے گھورتا رہا۔ جیسے ہی لڑکی کو اس کی آمد کا احساس ہوا اور اس کی نظریں شیرو کی نظروں سے ٹکرائیں، ایک خجالت سی اسے محسوس ہوئی جیسے لڑکی نے اسے چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔

وہ دوسرے ہی لمحے عالم ہوش میں لوٹ آیا۔ وقت کی نزاکت کا احساس اس سے زیادہ اور کسے تھا۔ چارپائی کے ایک کونے پر دھرا اپنا سویلین جوڑا جو اس نے رات کو پہننے کے لیے تیار کیا تھا، اس نے اس کے سامنے پھینک دیا۔

"جلدی سے کپڑے بدل کر باہر آؤ ——— فوراً!" یہ کہہ کر وہ اپنا اسباب سمیٹنے لگا۔ دانستہ سے بھرا تھیلا اس نے کندھے کے ساتھ لٹکایا اور گن ہاتھ میں پکڑ کر باہر نکل گیا۔

دو منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد لڑکی باہر آئی۔ اس نے بھی شاید حالات کی سنگینی کو

محسوس کر لیا تھا۔ باقی جوان قطار میں باہر کھڑے تھے۔

"غلام نبی!" اس نے ایک حوالدار کو مخاطب کیا۔ "تم اپنی نفری کے ساتھ یہیں رہو۔ ہم سری محمد روڈ پاک کرتے ہیں۔ فوج کو اس طرف آتے دیکھ کر اگر باغی جوانوں نے ساتھ آتے پٹائیں تو فائرنگ کرتے ہوئے پسپا ہو جانا۔ سمجھ گئے؟"

اس نے باقی جوانوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی سہمی ہوئی انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کا ذہن ہی شاید ماؤف ہو چکا تھا۔ سپرد پڑنے والی قیدیوں نے اسے بار بار رٹا دیا تھا۔

"آؤ ——— چلو میرے ساتھ ———!" شیرو نے اس کا بازو پکڑ کر اسے آگے بڑھایا۔

"ہوں ———!" لڑکی کے منہ سے بمشکل نکلا۔

شیرو نے اسے اپنے ساتھ ہی بھگانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کی رفتار کا ساتھ تو نہ دے سکتی تھی، اس کے ساتھ کھنچی چلی آ رہی تھی۔

———لیکن بمشکل اس نے ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ وہ لڑکھڑا گئی اور اگر شیرو نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ نہ تھام رکھا ہوتا تو وہ منہ کے بل گر پڑتی۔ اس نے رک کر لڑکی کو سنبھالا۔

"چلو ——— جلدی کرو ———!" شیرو نے اسے سہارا دیتے ہوئے مخاطب کیا۔

"مجھ سے بھاگا نہیں جاتا۔" وہ سسک پڑی۔

اس کی جلتی ہوئی آنکھیں شیرو سے ٹکرائیں اور اپنا قصور چھوٹ گئیں۔ ایک مرتبہ وہ پھر اسی کیفیت کا شکار ہو گیا جس سے تھوڑی دیر پہلے ہی وہ گزر کر آیا تھا۔ اس کے لیے لڑکی سے آنکھیں ملائے رکھنا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ اچانک ہی فائرنگ کی آواز دونوں کو عالم حقیقت میں واپس لے آئی۔

شیرو جھکا اور ایک جھٹکے سے حیرت زدہ لڑکی کو کندھے پر اٹھا کر بھاگنے لگا۔ اس کے ساتھی شیرو کے وہاں پہنچنے تک سڑک کے کنارے دونوں اطراف میں پوزیشنیں سنبھالنے لگے تھے۔ لڑکی کو کندھے پر اٹھائے وہ سڑک کے کنارے لگے درختوں کے اندر ہی اندر گھستا چلا گیا۔ ایک قدرے محفوظ جگہ پہنچ کر اس نے اس بوجھ سے نجات حاصل کی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے اپنی سانسیں سنبھالتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"آسیہ!" اس کے منہ سے نکلا ہی تھا کہ اچانک شیرو نے زمین پر گرا دیا۔ گولیاں اس سے کچھ فاصلے پر درختوں کے پتے چھیدنے لگی تھیں۔

لڑکی کے بارے لڑکی کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی ہی ہولناک تھی۔
——— شیرو نے اس کا بازو پکڑا اور وہ دونوں درختوں کے اندر ہی اندر دبکتے ہوئے بھاگنے لگے۔ اسے اپنے چاروں طرف سے اپنے ساتھیوں کے بھاگنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ حملہ آور مارٹر اور مشین گن فائر کر رہے تھے اور شیرو کے ساتھیوں کے پاس رائفلیں اور اسٹین گنیں اور دو مشین گنیں بھی تھیں مگر انہیں تعینات کرنے کی انہیں کہاں مہلت ملی ہو گی؟ شیرو سوچنے لگا۔

مقابلہ دیوانے کا خواب تھا اور بس۔ اس کی اپنی اکیلی جان ہوتی تو کوئی اور بات تھی لیکن قدرت نے ایک مسلمان لڑکی کی شکل میں اس پر جو بوجھ لاد دیا تھا اس نے شیرو کو بہت زیادہ ہی حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ وہ لڑکی کا ہاتھ تھامے بدستور بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

لڑکی کی حالت اب یہ تھی کہ وہ بھاگنے کی بجائے اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ شیرو حیران تھا کہ اب تک اس سمت آنے والی ہزاروں گولیوں میں سے کوئی ان میں سے کسی ایک کو کیوں نہیں لگ گئی؟ جس شدت سے وہ لوگ فائرنگ کر رہے تھے بظاہر ان کے اب تک بچے رہنے والی کوئی بات نہیں تھی۔

ایک قدرے محفوظ جگہ پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ خود اس کا سانس بھی مسلسل بھاگ دوڑ سے دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔ لڑکی تو نیم مردہ سی وہیں ایک درخت کے سہارے بیٹھ رہی جب کہ شیرو اس سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں اسی راستے پر جمی ہوئی تھیں جس پر بھاگتے ہوئے وہ یہاں تک پہنچے تھے۔ لیکن گھنے درختوں کی وجہ سے اس کی نظریں قریب ہی الجھ کر رہ جاتیں۔

"کہاں کی رہنے والی ہو؟" اس مرتبہ لڑکی سے آنکھیں ملانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے سوال کا جواب لڑکی کی آنکھوں سے بے اختیار بہنے والے دو آنسو تھے جنہوں نے شیرو کو بھی گڑبڑا کر رکھ دیا۔ "اوہ! معاف کرنا۔ مجھے شاید یہ نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔" شیرو اس الجھن میں تھا کہ اسے کس طرح تسلی دلاسہ دے۔

"کیا نام ہے۔ آپ نے تو میری جان بچائی ہے۔ ہم لوگ جوٹ کے ساتھ ہی ایک گاؤں سے رہنے والے ہیں لیکن اب..... اب وہاں کوئی بھی نہیں رہا۔" وہ سسک پڑی۔ شیرو کا دل بیٹھ گیا۔

"یہ ہاتھ اسے دھونے سے کیا بنے گا۔ جو تمہاری کمائی ہے وہی آج ہر کشمیری مسلمان کی ہے۔ صبر کرو۔ اب تم محفوظ ہو جب تک میں تمہارے ساتھ زندہ ہوں۔"

لڑکی نے حیرت انگیز قوت برداشت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور سر جھٹک کر آنسو پونچھ لیے۔

"میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے دور نکل جانا چاہیے۔ فائرنگ کی آوازیں بند ہو گئی ہیں۔ یہ یا تو مارے گئے ہیں یا وہ فرار ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ ہمیں ڈھونڈتے ہوئے ادھر آئیں گے۔ اب اندھیرے میں ہم لوگ جنگل اور پہاڑ میں بھٹکتے ہوئے ہی اجالے میں سفر کرنا اتنا آسان نہیں۔" شیرو نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

لڑکی بغیر کوئی بات کیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کی حالت مزید چلنے کے لائق نہیں ہے۔

"مجھے تمہاری حالت کا احساس ہے آسیہ۔" شیرو نے کہا۔ "لیکن..... وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو رہا کیونکہ آسیہ چند قدم دور نکل گئی تھی۔

وہ تین فرلانگ وہ دونوں اکٹھے چلتے رہے۔ اس دوران دونوں نے ایک دوسرے کی طرف کئی کئی مرتبہ کن انکھیوں سے دیکھا اور ایک دوسرے کی چوری پکڑتے رہے لیکن اس تمام عرصے تک دونوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ چلتے چلتے اچانک ہی آسیہ رک گئی۔

"آپ کون ہیں؟" اسے شاید ہوش ہی اب آیا تھا۔ شیرو چونک پڑا۔

وہ جس سوال کی توقع بہت پہلے کر رہا تھا وہ لڑکی نے اب اس سے پوچھا تھا۔

"میں مسلمان ہوں۔ شیرو میرا نام ہے——— شیر محمد میں پونچھ سے آیا ہوں۔" اس نے اپنا مختصر تعارف جلدی جلدی کروا دیا۔

لڑکی کو شاید ابھی تک اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا یہ نہ اس نے شیرو کو سرتاپا وردی میں دیکھا تھا جو اس کے خیال سے بھارتی یا روسی فوج کی وردی ہو سکتی ہے۔ شیرو بھی اس کی ذہنی کیفیت کو جان گیا تھا۔

"ہم شیخ عبداللہ کی فوج کے سپاہی ہیں۔" اس نے لڑکی کو مطمئن کرنا چاہا۔ اسے یقین تھا کہ شیخ کا نام آسیہ کے لیے اجنبی نہیں ہو گا۔ شیرو کے جواب سے وہ قدرے مطمئن ہو گئی تھی۔ دونوں اب پھر خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔

"تمہیں اس علاقے کی کچھ خبر بھی ہے؟" اس نے چلتے چلتے ہی آسیہ سے پوچھ لیا۔

"نہیں۔ میں صرف سری نگر دو مرتبہ گئی ہوں اپنے چچا کے گھر۔ یہاں جوٹ سے کبھی باہر نکلنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

شیرو نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب کم از کم لڑکی کو مضبوط ہاتھوں تک پہنچنے کا مرحلہ تو

بخوبی لے پایا جائے گا کیونکہ اس کا پیچھا سری نگر میں موجود ہے۔ وہ تو ابھی تک یہ فیصلہ بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ اسے بچا کر لے جائے گا کہاں" اس نے ہوم گارڈز کی وردی پہن رکھی تھی جو ان دونوں کو کسی بھی وقت پکڑوا سکتی تھی۔ اردگرد کے ہندو دیہاتوں میں پہلے ہی سے کیمپ میں بدلی بنے والے مسلمان ہوم گارڈز کے خلاف زبردست نفرت پائی جاتی تھی کیونکہ جو کارنامہ شیرو اور اس کے ساتھیوں نے بونت میں انجام دیا' ایسے کئی کارنامے مسلمان ہوم گارڈز پہلے بھی مختلف مقامات پر انجام دے چکے تھے اور کئی جگہ ان کا ٹکراؤ ریاستی فوج اور ہوم گارڈز میں موجود غیر مسلموں سے ہو چکا تھا۔ فوج سے ابھی تک البتہ یہ پہلا ٹکراؤ تھا جو ان لوگوں نے کیا۔ شیرو کو رہ رہ کر ایک ہی فکر ستائے جا رہی تھی کہ جموں میں اس کے ساتھی اس کے منتظر ہوں گے۔ اس کے دل سے یہی دعا نکلتی تھی کہ خدا کرے اس کے پونچھ والے باقی ساتھی جموں تک بخیریت پہنچ جائیں۔

بونت کے تار گھر سے نکلنے والی خبر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نزدیکی علاقوں میں پھیل جاتی تھی اور شیرو جانتا تھا کہ راتوں رات ان کا "کارنامہ" بونت کے گردو نواح میں پھیل چکا ہو گا۔ دن کے اجالے میں اس کی وردی ان دونوں کے لیے موت کا پھندا ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ جلد از جلد اس مصیبت سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا' لیکن کیسے؟ یہی سوال اسے کچوکے دے رہا تھا۔

رات کا شاید دوسرا پہر تھا جب اس نے آسیہ کو لڑکھڑاتے دیکھا۔ بجلی کی سی پھرتی سے وہ آگے بڑھا اور اس نے آسیہ کو اپنے دونوں بازوؤں میں تھام لیا۔ شیرو نے محسوس کیا کہ کمزوری سے اس کا وجود لرز رہا ہے اور اس کی ٹانگوں پر کپکپاہٹ طاری ہے۔ شاید اسی وجہ سے وہ چلتے چلتے لڑکھڑا گئی تھی۔ شیرو کے سینے سے لگتے ہی آسیہ کو ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا' بالکل یوں جیسے کوئی مرغی کا چوزہ سہم کر اپنی ماں کے پروں میں چھپ جاتا ہے' لیکن اس کے اس غیر اختیاری عمل نے جو اثرات نوجوان شیرو پر مرتب کیے تھے ان کا احساس اسے نہیں ہو سکتا تھا۔ شیرو چند سیکنڈ کے لیے تو بوکھلا گیا تھا پھر اس نے اپنے سینے پر ایک گرم سا دہکتا محسوس کیا۔ وہ ان لمحات کی طوالت کا متمنی تھا' لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی اسے آسیہ کو خود سے الگ کرنا پڑا۔ اس نے بغیر کچھ کہے اپنا فوجی کوٹ اتارا اور اس کی طرف بڑھایا۔ لڑکی حیرت سے اس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔

"یہ لو، مجھے دے دو اور کوٹ پہن لو۔" اس نے آسیہ کو مخاطب کیا جس نے کسی [illegible] کے تحت اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔ کوٹ اتارنے کے بعد شیرو کو اپنی رگوں

میں خون منجمد ہوتا محسوس ہو رہا تھا' لیکن اس نے بظاہر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس نے حکمت کی اعلیٰ ظرفی اور فراخ دلی سے متاثر ہو کر اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس کی وردی لے لی۔ کوٹ پہن لیا۔ کوٹ کی لمبائی نے اس کی ٹانگوں کو بھی خاصی حد تک ڈھانپ لیا۔

☆○☆

بھارت کے ساتھ الحاق کے معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ کو بھارتی حکومت کے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن نے لکھا تھا:

"وہ خاص حالات جن کے تحت یور ہائی نس نے ہندی حکومت سے الحاق کی درخواست گزاری ہے' اسے مدنظر رکھتے ہوئے بھارتی سرکار ریاست جموں و کشمیر اور ڈومینین آف انڈیا کا الحاق منظور کرتی ہے' لیکن میں یور ہائی نس کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ مستقبل میں اگر یہ الحاق متنازعہ حیثیت اختیار کر گیا اور حکومت پاکستان یا ریاستی عوام کو اس پر اعتراض ہوا تو اس کا فیصلہ ریاست جموں و کشمیر کے عوام کی مرضی سے طے پائے گا۔ میری حکومت کی خواہش ہے کہ جونہی ہماری مسلح افواج غیر ملکی مداخلت کاروں کو نکال باہر کرتی ہیں اور امن و امان بحال ہوتا ہے' آپ کے ہمارے الحاق کے بارے میں رائے عامہ طلب کی جائے۔"

"رائے شماری" پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف سے ایسی تجویز تھی جس پر بھارت میں بڑی لے دے ہو رہی تھی۔ گو کہ مہاراجہ کی ماضی میں کبھی پنڈت جواہر لال نہرو سے شیخ عبداللہ کے ذاتی مراسم کی وجہ سے نہ بنی تھی اور وہ سردار پٹیل کے زیادہ نزدیک تھے' لیکن کشمیر سے اپنے جذباتی تعلق' قوم پرستی اور شیخ عبداللہ سے دوستی ایسے محرکات تھے جنہوں نے پٹیل کی بجائے نہرو کو کشمیر کی سیاست میں زیادہ حد تک ملوث کر دیا تھا۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے "الحاق" کا وقتی معاہدہ محض اپنی گدی اور حملہ آوروں سے کشمیر کو بچانے کے لیے کیا تھا' لیکن رائے شماری کا ترپ کا پتہ بیک وقت پاکستان اور شیخ عبداللہ کے ہاتھ میں دے کر جواہر لال نہرو نے اس کی سیاسی موت کا سامان پیدا کر دیا تھا۔ اس کی ریاستی فوج کا کمانڈر انچیف بریگیڈیئر راجندر سنگھ جنرل انتہائی نالائق ثابت ہوا تھا۔ حکومت کا گورنر گھنشام سنگھ قبائلیوں کی قید میں پہنچ چکا تھا اور حکومت اسکاؤٹ کے کمانڈر میجر براؤن نے

پاکستان کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کر دیا تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ سے بھاگ کر جموں پہنچا
چاکیہ کے پیلے اپنے دانت تیز کر چکے تھے۔ تمام کشمیر اقوام متحدہ میں پیش ہونا تھا۔ بھارتی
وفد کی قیادت ریاست جموں و کشمیر کا سابق وزیر اعلیٰ گوپال سوامی آئینگر کر رہا تھا۔ بھارتی
خصوصی کرم فرمائی سے بڑا انعام حاصل کر چکا تھا لیکن مہاراجہ دیکھ رہا تھا کہ پاکستانی وفد کے
لیڈر چوہدری ظفر اللہ کے سامنے سوائی آئینگر بانیں شائیں کر رہا ہے اور بین الاقوامی رائے
کیس پاکستان کے حق میں مضبوط ہو رہا ہے۔ نہرو کی مہربانیوں سے وفاقی حکومت کی
قائم کردہ انتظامیہ کا سربراہ اعلیٰ شیخ عبداللہ کو بنایا جا چکا تھا۔ شیخ کی شخصیت اور اس کا سیاسی قد
اتنا بلند تھا کہ مہاراجہ لاکھ ریاستی عوام کے سامنے ہر دل عزیز ہونے کے باوجود اس سے ٹکرا
کر پاش پاش ہو جاتا۔ جواہر لال نہرو نے مہاراجہ کو مات دینے کے لیے بڑی خطرناک چال چل
تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اختیارات اس کے ہاتھوں سے چھین کر شیخ کو منتقل کر رہا تھا جس کی
حیثیت کانگریس کی کٹھ پتلی سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔

۱۳ نومبر ۱۹۴۷ء کو پنڈت جواہر لال نہرو نے مہاراجہ ہری سنگھ کو لکھا تھا:

"میرے خیال کے مطابق پوری ریاست جموں کشمیر میں صرف
شیخ عبداللہ ہی ایسی شخصیت ہیں جو اندرونی معاملات ریاست میں امن و
سکون بحال کر سکتے ہیں۔ وہ متوازن ذہن کے مالک اور مقبول ترین
عوامی شخصیت ہیں۔ ہندو مسلم فسادات روکنے میں انہوں نے فقید
المثال کردار ادا کیا ہے جو ان کے حسن تدبر کی بہترین مثال ہے۔
آپ کو ممکن ہے کہ چھوٹے چھوٹے معاملات میں ان سے اختلاف
ہو، لیکن بڑے مسائل کو بہتر طریقے سے وہی حل کر سکتے ہیں۔ میں
آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ بجائے حالات مزید بگاڑنے کے آپ کسی
تیسرے واسطے کو اپنے اور شیخ عبداللہ کے درمیان لائے بغیر ان سے
معاملات طے کر لیں۔"

مہاراجہ ہری سنگھ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں تھا کہ وہ نہرو کی اس چال کو نہ سمجھ سکتا، لیکن
حالات نے اسے جس طرح باندھ کر بھارت سرکار کے آگے ڈال دیا تھا، اس کے بعد وہ بے
بس ہو چکا تھا۔ اس کے لیے اور کوئی راستہ باقی نہ بچا تھا کہ وہ نہرو کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا
جائے۔ مہاراجہ آئینی طور پر ریاستی کمانڈر انچیف تھا، لیکن نہرو کی شہ پر شیخ عبداللہ نے یہ
مطالبہ بھی مان لیا کہ بااختیار وزیر اعلیٰ ہونے کے ناطے اور امن و امان کے جلدی حصول کے

کی خاطر اس کے ہاتھ میں دی جائے۔ مہاراجہ نے اس مطالبے کو بھی مان لیا۔ وہ اپنے ایک خط میں نہرو کو لکھتا ہے:

"آخر شیخ عبداللہ نے مشورہ دیا کہ میں کہتا ہوں کہ ہندو فوج
کو بھارتی فوج کی نگرانی میں دے دیا جائے تو پاکستانی ناری دنیا کو
تاثر دے گا کہ بھارت کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ بنا رہا ہے۔ صورتحال
یہ ہے کہ ہمارا معاملہ تمام اقوام میں چل رہا ہے۔ یہ قدم ہمارے
کیس کو متاثر کرے گا اور پاکستان کے کیس کو اور طاقت ور کر
دے گا۔

دوسری اہم بات بھی میں آپ کے گوش گزار کر دوں تو بہتر ہوگا
وہ یہ کہ پاکستان کا کہنا ہے کہ جب رائے شماری ہو تو بھارتی فوج وہاں
سے نکل جائے۔ اگر ریاستی فوج کو بھارتی فوج کی تحویل میں دے دیا
گیا تو زبردست انتظامی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ میں آپ سے
صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اندرونی حالات میرے لیے یہ
مشورہ قابل قبول نہیں ہے۔"

وقتی طور پر مہاراجہ کی اشک شوئی کے لیے ان کی بات تسلیم کر لی گئی، لیکن بھارت
سرکار نے کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ بنانے کی سرگرمیاں جاری رکھیں اور شیخ عبداللہ کی طرف
سے مسلسل ایسے بیانات آنے لگے جن میں ریاستی فوج پر زبردست تنقید کی جاتی تھی۔

اس دوران مہاراجہ کے اکلوتے بیٹے یوراج کرن سنگھ کے کولہے کی تکلیف اتنی شدت
اختیار کر گئی کہ ولی عہد کو علاج کے لیے امریکہ بھیجنا پڑا۔ اب مہاراجہ بالکل اکیلا رہ گیا تھا
اور اس کے گرد اکرد بھارت نواز کشمیریوں کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ ولی عہد کی تیمارداری نے
تو اسے ذہنی طور پر بالکل مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ مہاراجہ پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی
تھی۔ ایک روز اس نے سر عام ہی عمائدین سے معذرت کر لی اور رات اکیلے گزاری۔
ساری رات اس مسئلے پر سوچ بچار کرنے کے بعد وہ حتمی فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ بھارت کے
ساتھ معاہدۂ الحاق ختم کر دیا جائے لیکن کیسے؟

یہ سوال اسے پریشان کر رہا تھا۔ اس نے "الحاق" کر کے سانپ کی بانبی میں ہاتھ دے
دیا تھا۔ اب کچھ بھی کرنا اس کے اختیار میں نہ رہا تھا۔ اس نے دسمبر کے الوائل میں اپنے
"خود ساختہ دوست" اور بھارت کے وزیر ریاست جموں و کشمیر امور، الطہ سردار پٹیل سے

بہت بڑی ہی برافروختگی اور غصے کے عالم میں لکھا تھا:

"میں کل ساری رات ایمانداری سے سوچ بچار کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بھارت کے ساتھ معاہدۂ الحاق سے دست کش ہونے کا اعلان کر دوں۔ ہمارا معاہدہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، مشروط تھا اور مجھے خطرہ ہے کہ بھارتی فوج کبھی بھی حملہ آوروں سے کشمیر کے زیر قبضہ علاقے خالی نہیں کروا سکے گی۔ اس صورت میں اگر ہم سلامتی کونسل کے فیصلے کی بھینٹ آپ کی مہربانیوں کے طفیل چڑھ گئے تو ظاہر ہے کشمیر کی قسمت کا فیصلہ پاکستان کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔ اندریں حالات میں اس معاہدۂ الحاق کو بیکار سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ عارضی طور پر پاکستانی ہمیں پرکشش مراعات پیش کریں گے، لیکن مسلمان میرے نزدیک کبھی قابل اعتبار نہیں رہے۔ مجھے غم ہے کہ حکومت پاکستان ڈوگرہ راج ختم کر دے گی اور ریاست کے تمام ہندو سکھ قتل کر دیئے جائیں گے، لیکن معاہدہ ختم ہونے کی صورت میں یہ ضرور ہو گا کہ اس طرح گو کہ میں بھارتی مسلح افواج کی خدمات سے محروم ہو جاؤں گا، لیکن مجھے یقین ہے کہ میں ریاستی افواج اور رضاکارانہ طور پر یہاں دی جانے والی افواج کی کمان اگر خود سنبھال لوں تو آپ کے کسی جرنیل سے زیادہ موثر انداز میں اور خوش اسلوبی سے حملہ آوروں سے نمٹ سکوں گا کیونکہ میں اپنے عوام کو آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ اگر موجودہ صورت حال جو آپ نے شیخ عبداللہ کو میرے سر پر مسلط کر کے پیدا کر دی ہے، میں کوئی تبدیلی نہ لائی گئی تو میں ریاست چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ اس طرح کم از کم میرے عوام مجھ سے کوئی امید تو نہ رکھ سکیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں جاتے وقت عوام کو اعتماد میں لے کر یہ ضرور بتاؤں گا کہ مجھے اپنے لوگوں کو کن حالات میں چھوڑنا پڑا۔"

مہاراجہ ہری سنگھ کا یہ خط بکل بن کر گرا اور اس نے بھارتی ایوانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ سردار پٹیل اور پنڈت نہرو کے درمیان آپس میں ٹھن گئی کیونکہ سردار پٹیل شروع ہی سے حیدرآباد دکن کی طرح ریاست پر بھی عملاً قبضے کے حق میں تھا۔ وہ نہرو کی کشمیر میں

کردہ غلط پالیسی کا سخت خلاف اور نہرو سے شکوہ صورت حال تک پہنچ چکا تھا۔ اس خط پر دونوں میں آپس میں لفظی سے دست و گریباں ہونے کی دھمکی دے دی تھی۔ بالآخر مہاراجہ ہری سنگھ نے سردار پٹیل کی ہدایت پر سردار پٹیل نے "اپنے دوست" ڈوگرہ مہاراجہ کو مطمئن کرنے اور لڑائی سے باز رکھنے کے لیے مختصر سا لکھا:

"کشمیر کے حالات اور بین الاقوامی رائے عامہ کی بھرپور عکاسی کرتی خط ہے۔ میں بے چینی سے اقوام متحدہ میں ہونے والے کسی بھی فیصلے کا منتظر ہوں۔ آپ مطمئن رہیے اور بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کا دوست آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ اور کشمیر کی شان و شوکت کو دوبارہ بحال کرنے میں ہم کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ امید ہے آپ کی پریشانی اس یقین دہانی کے بعد ختم ہو گئی ہو گی۔"

اور بے وقوف مہاراجہ چانکیہ کے چیلوں کے چکر میں آ کر خاموش ہو گیا۔

☆○☆

مسلسل دھماکوں اور پھر ایک دم زوردار دھماکے کی آواز سن کر محمود اور سنبھل خان نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کا دوست اپنا مشن مکمل کر چکا ہے۔

"مرحبا!" سنبھل کے ہونٹوں پر لرزش ہوئی۔

"سبحان اللہ کہ امیر خان اپنی مراد کو پہنچا۔" دوسری طرف بیٹھا محمود بڑبڑایا۔

پلان کے مطابق امیر خان کے بچ کر آ جانے کی صورت میں اسے کور کے فائر دینا تھا، پھر اس کے گن پر حملہ آور ہونے سے پہلے دشمن اس کی طرف سے باخبر ہو جائے تو اس کی توجہ ہٹانے کے لیے فائرنگ کرنا تھا۔ اب دونوں ہی صورتیں ختم ہو چکی تھیں اور ان کی توپ اپنے توپچیوں سمیت لوہے کے پگھلے ہوئے ڈھیر میں تبدیل ہو چکی تھی اور ان کا دوست انہیں کوئی زحمت دیئے بغیر سرخرو ہو کر خدا کے حضور پہنچ چکا تھا۔

دونوں الگ الگ ایک دوسرے کی مخالف سمت سے سنبھل سنبھل کر نیچے اتر رہے تھے۔ اچانک فضا روشنی کے پھٹتے گولوں سے روشن تر ہونے لگی۔

---بھارتی فوج کے افسران نے بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ میڈیم گن پر حملہ کرنے والا کوئی اکیلا شخص نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھی بھی یقیناً یہیں کہیں موجود ہوں گے۔ ان کی

نشانہی کے لیے اب "ویری لائٹ راؤنڈز" فائر کیے جا رہے تھے۔ سجاول نے اپنے بائیں ہاتھ کچھ فاصلے پر مدد کو پھلانگ لگا کر ایک پتھر کی اوٹ میں لڑھکتے دیکھا تھا۔ اس کے تعاقب میں پھٹنے والی گولیاں سیدھی لکیر بناتی ہوئی پتھر تک پہنچ چکی تھیں۔ بھاری کا ایک ایک راؤنڈ ان کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

سجاول دیوانہ وار اپنے نزدیکی پتھر کی اوٹ لینے کے لیے بھاگا۔ پتھر کے نزدیک پہنچتے ہی اسے اپنے دائیں پہلو میں انگارے دہکتے محسوس ہوئے۔ ایل ایم جی کی دو تین گولیاں اکٹھی اس کے جسم میں گھس گئیں۔ سجاول تلملا کر بائیں بازو کے سہارے گر پڑا' لیکن دوسرے ہی لمحے وہاں موجود پتھروں کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ہاتھ کسی برقی عمل کے تحت اپنے پوچ میں رنگ گیا تھا۔ پھر اس نے دانتوں کی مدد سے پن باہر نکالی اور بایاں ہاتھ دائیں پہلو پر جما کر دائیں ہاتھ سے دستی بم اپنے سے چند گز کے فاصلے پر آگ اگلتی اس مشین گن کی طرف اچھال دیا جس کی نالی سے شعلے نکل کر مدد کی طرف لپک رہے تھے۔ زوردار دھماکے کی آواز میں اس مشین گن کی فائرنگ کی آواز بھی شامل تھی جس نے اچانک ہی سجاول کی پشت سے سر باہر نکالا اور اس کو نگل لیا۔

مدد نے سجاول کو گرتے اور پھر لڑھکنیاں کھا کر ڈھلوان سے نیچے پھسلتے دیکھا۔ "سنگی!" وہ گلا پھاڑ کر دیوانوں کی طرح چلایا۔ "میں ابھی آیا۔"

"چارج!" اس کے گرداگرد پہاڑیاں گونج اٹھیں۔

مدد نے اپنے چاروں اطراف سے فوجیوں کو جنگی تربیت میں اس طرف بڑھتے دیکھ لیا تھا۔ بھارتی فوجیوں کے نزدیک حملہ آوروں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ لوگ اپنی گنوں سے اس سمت اندھادھند فائرنگ کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔

---مدد پر دیوانگی کا عالم طاری تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں گرنیڈ تھام رکھے تھے۔ وہ اٹھ کر اس سمت بھاگا جہاں سجاول کی لاش لڑھک کر نیچے گری تھی۔ دونوں گرنیڈ اس نے یکے بعد دیگرے اپنے سامنے ہوا میں اچھال دیئے تھے جو سامنے سے "چارج" کرتے فوجیوں کے سروں پر پھٹے۔ اس کے ساتھ ہی درجنوں گولیاں مختلف اطراف سے اس کے جسم میں گھس گئیں اور وہ عین اس جگہ منہ کے بل جا گرا جہاں سے اس کا ساتھی سجاول لڑھک کر نیچے گرا تھا۔ دونوں کے جسد خاکی ایک دوسرے سے محض دو تین فٹ کی دوری پر تھے۔

ان دو لاشوں تک دوڑ کر پہنچنے والوں میں سب سے آگے آرمی انٹیلی جنس کا میجر ورما

ہاتھ میں پستول پکڑا ہوا تھا جس کی مدد سے اب بھی وہ بائیں ہاتھ سے دونوں لاشوں پر باری باری جھکا تھا' لیکن یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ دونوں ہی زندگی کا قرض چکا چکے تھے۔

[illegible] کے چاروں سرفروش جان سے گزر گئے اور باقی ماندہ لوگوں نے اور [illegible] وحشیوں کی طرح ان کے مردہ جسموں کو ٹھوکریں مارنے لگے۔ [illegible] کی تلاشی لو۔" اس نے اپنے دائیں بائیں کھڑے مسلح جوانوں کو حکم دیا۔ "کوئی بھی [illegible] وہ مجھے دفتر میں پہنچا دو۔" وہ اپنی ٹانگ پر لگے زخم سے ٹپکتا ہوا خون دیکھ کر [illegible]

☆○☆

چوٹی کی طرف آنے والے راستے پر ایک گھر سے ملے پر بنا ہوا خاصا لمبا پل بھارتی کے ساتھیوں نے اڑا دیا تھا اور وہاں پہلے پہاڑی سلسلے میں تاب ہو کر دشمن کی آمد کے منتظر ہو گئے۔

فوجی تنظیم و تربیت کے مطابق ہراول دستوں سے پہلے دشمن کی ایک چوکس پارٹی جائزہ لینے آئی اور جیسے ہی وہ لوگ پل کے نزدیک پہنچے' جنرل کے ساتھیوں نے ان پر جہنم کا دہانہ کھول دیا---- بھارتی سورما ایک گاڑی اور تین لاشیں وہیں چھوڑ کر واپس ہو گئے۔ ان کی روانگی کے تھوڑی دیر بعد ہی ہراول دستوں کی آمد شروع ہو گئی' لیکن ان کا حشر بھی پہلے آنے والوں سے مختلف نہیں ہوا تھا۔ دشمن کی جب کوئی پیش نہ چلی تو اس نے حسب روایت اپنے سامنے والے پہاڑی سلسلے پر اندھا دھند گولا باری شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی ان کی فضائیہ بھی حرکت میں آ گئی۔

سورج غروب ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہا' پھر محاذ پر سکوت طاری ہو گیا۔ ہاں ایسا ہی سناٹا جو کسی بڑے طوفان کی آمد کا پیش خیمہ ہو۔ جنرل کے ننھی بھر سرفروشوں نے پہرے بدل بدل کر یہ رات آنکھوں میں کاٹی۔ اس دوران وہ رات بھر گاڑیوں کے شور اور توپوں کی منتقلی کی آوازیں سنتے رہے' لیکن نالے کو عبور کر کے دشمن پر شب خون مارنے کی حسرت ہی دل میں لے کر بیٹھے رہے کیوں کہ ان کی نفری نہ ہونے کے برابر تھی اور جنرل کو اپنے ساتھیوں میں سے کسی ایک کی بھی کمی گوارہ نہیں تھی کیونکہ ان میں سے کسی ایک کے بھی اپنی جگہ سے ہٹ جانے کی صورت میں بہت بڑا خلا پیدا ہو جاتا اور عین ممکن تھا کہ اس خلا کے بیچ میں سے دشمن راستہ بنا کر اس طرف آ نکلتا۔

اور پھر اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ ان کے پاس اسلحہ کی کمیابی تھی۔ اول تو ان کے

پاس برق رفتاری سے حملہ کرنے اور زیادہ نقصان پہنچانے والے ہلکے ہتھیار تھے ہی نہیں اور جو ایک دو مارٹر اور مشین گنیں تھیں انہیں جنرل طارق نے اس طرح "کیموفلاج" کیا ہوا تھا کہ ان کو وہاں سے ہٹانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

علی الصبح بھارتی فوج نے زبردست حملہ کیا۔ حملے کا زیادہ تر زور جنرل کے دائیں پہلو پر تھا۔ جنرل کے ہیلیباز پوزیشن بدل بدل کر فائرنگ کر رہے تھے۔ انہوں نے مارٹروں کا رخ بدل کر اتنی تیزی اور برق رفتاری سے فائرنگ کروائی کہ بھارتی فوج کو یہی گمان گزرنے لگا کہ مقابلے پر کم از کم تین چار بٹالین فوج آ گئی ہے۔ ابھی تک آرٹلری (توپ خانہ) کا فائر نہ ہوا تھا۔ دوپہر کے بعد دشمن نے دائیں پہلو پر جہاں اس کی دانست میں کسی کے اب تک زندہ بچ رہنے کا امکان نہیں تھا کیونکہ دشمن نے مسلسل دائیں طرف ایک مخصوص علاقے پر گولہ باری کی تھی اور اب اس کو "صاف میدان" جان کر اس سمت سے انفنٹری (پیدل فوج) کے ساتھ بلہ بول دیا۔

جنرل صبح سے اب تک انفنٹری ہی کے حملے کا منتظر تھا۔ اس کے ساتھیوں نے بڑی استقامت اور پامردی سے اب تک دشمن کی زوردار فائرنگ کے دھماکے مورچوں میں دبک کر اور کانوں میں انگلیاں لے کر سنے تھے۔ توپ خانے کی گولہ باری کے سامنے ان کی رائفلیں اور مشین گنیں بیکار تھیں اور وہ لوگ اسلحہ پھونکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

جنرل طارق ایک محفوظ آڑ میں آنکھوں سے دوربین لگائے بارود اور دھوئیں پر نظریں جمائے بیٹھا تھا جب اس نے دھوئیں اور گرد و غبار کے بادلوں میں سے "چارج۔۔۔ چارج!" پکارتے پیدل جوانوں کو اپنے دائیں طرف بڑھتے دیکھا' تو ایک پراسرار سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقص کر گئی۔ اس نے اس طرح سکھ کا سانس لیا جیسے اس کی اب تک کی محنت کا معاوضہ مل گیا ہو۔ اپنے بائیں ہاتھ بیٹھے اپنے نائب کو جنرل نے احکامات جاری کیے جو دوسرے ہی لمحے پہاڑی سلسلے میں غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی جنرل نے بھی مشین گن اور دستی بموں کا تھیلا سنبھالتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ تقریباً" بھاگتا ہوا پہاڑی سلسلے کے اندر ہی اندر ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر گیا تھا۔ اب وہ اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں پہاڑی راستے پر دشمن کے ہراول دستے پہنچنے ہی والے تھے۔

---بمشکل تین چار منٹ بعد ہی ان کی آمد ہو گئی۔ ان کی پہلی ٹکشن کو جنرل نے نکل گزر جانے دیا اور جیسے ہی دوسری کے بعد تیسری ٹکشن اس کی زد میں آئی' انتہائی تیز رفتاری سے جنرل نے ان پر چند گز کے فاصلے پر گرنیڈ پھینکے۔

[illegible] گرنیڈ وہاں سے گزرنے والی [illegible] ہلاک ہو گئے۔ [illegible] دشمن کے چار سپاہیوں کی [illegible] سے [illegible] واپس بھاگتے ہوئے [illegible] کے لیے جنرل طارق کی آستین گن کی سرخ اور [illegible] باہ [illegible] تھی۔ [illegible] دشمن میں سے بمشکل ہی کوئی سپاہی بچ کر [illegible] پہاڑیوں میں [illegible] [illegible] کی چیخ پکار میں اب پھاٹوں کے ولولہ انگیز نعرے گونجنے لگے تھے۔ اس سے [illegible] [illegible] کر دشمن کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے اور اپنے [illegible] [illegible] [illegible]

لڑی میجر ٹیلی تو اس کے تمام ساتھی وہ اب نفسیاتی مریض بنتے جا رہے تھے' وہ آخر ان کے اعصاب جواب دے جائیں گے۔

انہوں نے پل پل اپنے ٹھکانے' پوزیشنیں بدل بدل کر فائرنگ کی اور موقع ملتے ہی نقب لگا کر پہاڑی راستوں پر دشمن کے کنوائے میں ایک آدھ پیچھے رہ جانے والی یا قافلے کی پہاڑی سے اسلحہ بھی لوٹا لیتے۔ ان چھوٹی رضاکاروں کی ساتھیں روز کم سے کم تر ہوتی جاتی تھیں۔ نئے ساتھیوں کے لوٹنے پر سے بلند ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی باغ اور پونچھ کے دوا علاقوں سے بھی پسپائی آ رہی تھی کہ وہاں سے سرفروشوں کی ٹکڑیاں اس سمت چلی آ رہی ہیں۔ خود آزاد کشمیر کی بے وسیلہ حکومت بھی ان کے لیے رضاکار اور اسلحہ بھیج کر رہی تھی۔ جنرل جانتا تھا کہ بھارتی فوج کے بڑھتے ہوئے طوفان اور اسلحہ کے انبار کے سامنے ننھی منی سرفروش کوئی حیثیت نہیں رکھتے' خود باغ اور پونچھ میں بھی ان کی پوزیشن ابھی مستحکم نہیں ہوئی تھی--- لیکن اسے لڑنا تھا۔ آخری گولی اور آخری جوان تک--- اور وہ لڑا۔

جنرل کا طریق جنگ یہ تھا کہ چھپ کر دشمن پر نقب لگاتا اور تیزی کے ساتھ پوزیشن بدل بدل کر یہی عمل دہراتا چلا جاتا۔ اس کے ساتھی ایک پہاڑی سے اچانک حملہ کرتے اور چند منٹوں بعد ہی بھاگ کر دوسری پہاڑی پر پہنچ کر یہی عمل دہراتے۔ اس طرح دشمن اسی دھوکے میں رہتا کہ سامنے کی تمام پہاڑیاں حملہ آوروں سے بھری ہوئی ہیں اور اس نے تین مشین گنیں دے کر فورا دوں کو جن میں اب ساڑھے تین سو مزید پاکستانی رضاکار بھی شامل ہو چکے تھے' پہاڑیوں میں بھیجا تھا۔

لیکن وہ لوگ جو شوق جہاد اور جذبے کے عالم میں یہاں چلے آئے تھے' عملی میدان میں بالکل ناکارہ ثابت ہوئے۔ دشمن کے نزدیک جانے سے ان کی جان جاتی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے حملہ تو کیا' لیکن جب دشمن کی طرف سے جوابی فائرنگ شروع ہوئی تو وہ لوگ پوزیشن بدلنے کی بجائے دم دبا کر بھاگ اٹھے۔ دو تین مرتبہ جنرل طارق نے ان کا حوصلہ بڑھا کر انہیں آگے روانہ کیا' لیکن ہر دفعہ وہ لوگ یہی کارنامہ انجام دیتے۔ بالآخر میجر اکرم اور ان کے دو تین ساتھی ہی وہاں رہ گئے تھے۔ جنرل نے ان بزدلوں کو ضائع کرنے کے بجائے ان کا ایک اور استعمال نکالا اور انہیں پہاڑی سلسلے میں دور دور تک پھیلا دیا۔ انہیں ہدایت دی کہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھے اکا دکا فائر کرتے رہیں۔ اس طرح کم از کم دشمن "تعداد کے دھوکے" ہی کا شکار ہو جائے۔ یہ حکمت عملی کسی حد تک کامیاب رہی۔ گو کہ وہ لوگ دشمن کی فائرنگ سے محفوظ تھے' لیکن جب کبھی کسی بیدی گن کا کوئی ایک آدھ گولہ ان کے

[illegible] کوئی جہاد ان کے سروں سے [illegible] ہو گیا [illegible] ان میں سے [illegible] جنرل نے دریا کے کنارے [illegible] ساتھیوں کے ساتھ بٹھا دیا کہ وہ کم از کم وہاں سے دوسرے [illegible] دشمن سے اپنی طرف ذرا ہٹ کر ہوا کر فائرنگ کر کے اسے نقصان پہنچاتے رہیں۔ اس سے [illegible] میں تین سو گز کے فاصلے سے دشمن انہیں کسی [illegible] سے اپنی طرف [illegible] مجاہدوں" نے دشمن پر ایک گولی بھی نہ چلائی۔ انہیں [illegible] فائرنگ کی تو دشمن کا جوابی فائر بھی آئے گا۔ چنانچہ ان میں سے بھی صرف آٹھ [illegible] تمام مجاہد واپس بھاگ گئے۔ اس دوران سواتی فوج کے [illegible] واپس آ گئے۔ جنرل جو [illegible] تھا کہ ان لوگوں کو باقاعدہ فوج کے خلاف لڑنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور صرف جوش جذبہ [illegible] ان کو یہاں لے آیا تھا۔ اس نے ان کو دشمن سے براہ راست ٹکرانے کے بجائے انہیں جگوڑے مجاہدوں کے فرار کے راستوں کی ناکہ بندی کے لیے روانہ کر دیا اور انہیں ایسے پہاڑی ناکوں پر کھڑا کر دیا جہاں سے یہ لوگ واپس بھاگ رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ساڑھے تین سو مجاہدین سارے کے سارے واپس بھاگ گئے۔ جاتے ہوئے وہ اپنی رائفلیں بھی ساتھ لے گئے تھے۔ اس دوران مختلف ٹولیاں رضاکاروں کی آتی اور جاتی رہیں۔ ان میں سے ایسے "مرد مومن" تھے کہ ایک بار محاذ کا منہ دیکھنے کے فوراً بعد ہی ان کا جذبہ جہاد سرد پڑ جاتا اور وہ بھاگ جاتے۔ جنرل کی پالیسی "ضرب لگاؤ اور بھاگو" تھی جب کہ یہ لوگ "دیکھو اور بھاگو" پر عمل پیرا تھے۔

مجاہدین آتے اور جاتے رہے۔ ان کی آمد لاریوں کے ذریعے ہوتی تھی اور وہ فرار ہونے کے لیے پہاڑیوں کے اندر خفیہ راستے استعمال کرتے تھے۔ اس سے جنرل کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ دشمن غلط فہمی کا شکار رہا۔ دشمن کے جاسوس اسے یہی اطلاع دیتے کہ مجاہدین آتے اور پہاڑی سلسلے میں پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی روانگی ان جاسوسوں کی نظر سے چونکہ اوجھل رہتی تھی' اس لیے وہ اسے نہ دیکھ سکتے تھے اور بھارتی ہائی کمان کی بوکھلاہٹ میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ تاہم ایک فائدہ ضرور حاصل ہوا کہ ان آنے والوں میں سے ایسا عنصر ابھرنے لگا کہ جو لوگ محض جذباتیت کے زیر اثر نام نہاد جذبہ جہاد کے بجائے سنجیدگی سے اس جنگ آزادی کو جاری رکھنا چاہتے تھے' انہی باعمل لوگوں میں وہ ۷۵ مجاہدین شامل تھے کو کشمیر کی پہلی مظفر آباد بٹالین بنے اور سابق ریاست کشمیر کا لیفٹیننٹ قدرت اللہ ان کا پہلا بٹالین کمانڈر منتخب ہوا۔

اس دوران پٹھانوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ انہوں واپس بھاگ کر جو بہادری دکھائی تھی اس نے ان کی شاندار عسکری روایات پر سیاہی پھیر کر رکھ دی ہے۔ وہ لوگ اپنے فرار پر شرمندہ تھے اور کفارہ ادا کرنے کے لیے جلد از جلد محاذ پر واپس جانا چاہتے تھے۔ ان کی پیش کش جب جنرل طارق تک پہنچی تو اس نے انتہائی سوچ بچار اور اپنے ساتھیوں سے مشورے کرنے کے بعد صرف تین سو محسودی قبائلی کو ان کے سردار گلاب خان کی سربراہی میں واپس آنے کی اجازت دی۔

جنرل "ٹنڈی دل" کی آمد اور اس کے تیور دیکھ چکا تھا اور اب وہ اتنے ہی "مجاہدین" چاہتا تھا جنہیں باآسانی کنٹرول کیا جا سکے۔ پٹھانوں کو شکایت صرف یہ تھی کہ آخر پاکستانی فوج کیوں جنگ میں حصہ نہیں لیتی اور یہی ان کی ناراضی اور فرار کا سبب تھا۔ جب جنرل طارق نے گلاب خان کے سامنے ساری صورت حال رکھی اور اسے معاملات کی نزاکت کا احساس دلایا تو حقیقت پسند اور عظیم کردار کے مالک گلاب خان نے اس کی مرضی پر صاد کیا اور اس کے زیر کمان اپنے ساتھیوں سمیت لڑنے پر تیار ہو گیا۔

جنرل پٹھانوں کی جنگی استعداد سے واقف تھا اور اسے بخوبی علم تھا کہ اب تک مفتوحہ علاقہ انہی لوگوں کی قربانیوں کا باعث ہے۔ اس نے اگلے روز ان لوگوں کو یہ مشن سونپا کہ وہ دشمن کی پوسٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جنوب کی طرف اوڑی سے پونچھ کو جانے والی سڑک پر پندرہ میل دور نکل جائیں۔ جنرل نے پونچھ کی طرف کمک لے جانے والے بھارتی فوج کے دستوں کی روانگی کے راستے گلاب خان کو دکھا کر ایک مخصوص مقام کی نشان دہی کرتے ہوئے حکم دیا کہ یہاں وہ لوگ بھارتی کمک پر گھات لگائیں۔

گلاب خان اور اس کے جیالوں نے دوسرے ہی دن بھارتی کنوائے کو دبوچ لیا۔ یہ لوگ پہاڑیوں میں گھات لگانے کی خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ وہ فرشتہ اجل بن کر دشمن پر ٹوٹے۔ اس کے ۳۶ بڑے ٹرک جلا کر راکھ کر دیئے' سینکڑوں فوجیوں کو تہ تیغ کیا اور ہتھیاروں کی بڑی تعداد' بے تار ایمونیشن' وائرلیس سیٹ' فوجی گرم کپڑے' فیلڈ ٹیلی فون اور چھ تین انچ مارٹر گنیں اٹھا کر دوبارہ ۱۵ میل کا فاصلہ طے کر کے بحفاظت جنرل اور اس کے ساتھیوں سے آ ملے۔ ان کی اس فتح مندانہ مراجعت نے محاذ پر موجود جوانوں میں برقی رو دوڑا دی۔ سارا محاذ "اللہ اکبر" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی پٹھانوں کی للکار گونج اٹھی "دا کافروں پسے استو والا گا" (کافروں کا تعاقب کرو)' "کافرا دبا" (کافروں کو مار

دو)۔ جنرل طارق نے پیش قدمی کا پائلٹ قبائلی انداز اختیار کیا تھا۔ وہ دشمن سے ٹکراؤ سے پہلے ہی اس کے حوصلے پست کر دیتا تھا۔ اس کے حملہ کو جیتے ہوئے آگے دو ہفتے گزر چکے تھے اور پہاڑوں نے دشمن کی دہشت طاری کر دی۔ وہ لوگ خوفزدگی اور پسپائی کے عالم میں اپنی قیمتی توپیں' ٹرک اور بکتر بند گاڑیاں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ان کے تعاقب میں ان کا ہراول دستے والے پٹھانوں نے پونچھ کا بازار سر نہ پڑنے دیا اور جنرل طارق دشمن کو رگیدتا ہوا مقررہ وقت سے پہلے ہی دفاعی فصیل پر دستک دینے لگا۔

☆○☆

دسمبر ۱۹۷۱ء کا آغاز:

قریباً چار ہفتے پہلے یہ محاذ ڈیکلیئر ہو چکا تھا اور بھارتی سورما پونچھ اور پونچھ تک پیش قدمی کر گئے تھے۔ جنرل نے انہیں پونچھ سے کاٹا' چکوٹھی سے پیچھے دھکیلا اور اوڑی کو میدان کارزار منتخب کر لیا۔ بھارتی فوج پر اس قدر دہشت طاری تھی کہ چکوٹھی اور اوڑی کے درمیان کا سارا علاقہ خالی کر کے وہ لوگ شمر کی سمت جانے والا پل توڑتے ہوئے شمر میں جا بیٹھنے پر مجبور ہو گئے۔

قسمت کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ چند روز پہلے جنرل کشمیر کو بچانے کے لیے پل توڑ رہا تھا اور اب اس کا مدمقابل اپنی جان بچانے کے لیے یہی عمل دہرا رہا تھا۔ تین سو پٹھان جیالوں کی آمد نے محاذ کا نقشہ دنوں میں بدل کر رکھ دیا تھا۔

جنرل مطمئن ہو کر چکوٹھی لوٹ آیا۔ اس نے اپنی توجہ اب مقامی باشندوں کو مسلح کرنے اور ٹریننگ دینے پر مرکوز کر دی۔ اس کام میں کئی ہفتے درکار تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ اس دوران بھارتی محاذ خالی دیکھ کر واپس نہ آ جائیں۔ دشمن کو "مصروف اور خونریز" رکھنا بھی ضروری تھا۔ جنرل نے مزید پٹھان مجاہدین کو محاذ پر بلا لیا۔ انہیں اپنی کمان میں لے کر جنرل نے پونچھ کی طرف ان احکامات کے ساتھ روانہ کیا:

"پونچھ روڈ کو دشمن کنوائے کا مرگھٹ بنا ڈالو۔"

"پونچھ کے محاصرے کو مضبوط کرتے ہوئے شہر پر شب خون مارو۔"

مقامی رضاکاروں کی ٹریننگ پر کچھ ساتھیوں کو مامور کر کے جنرل پٹھانوں کے ایک گروپ کے ساتھ اوڑی کی طرف نکل گیا۔ اس کی منزل "ہجوہلن" تھی۔ سڑک چھوڑ کر سات ہزار فٹ بلند سلسلہ ہائے کوہ کو مسخر کرتا اور منزلوں پر منزلیں مارتا' بدر و حنین کا یہ مسافر اپنے

سرفروشوں کے ساتھ تین تین فٹ برف پر پیدل سفر کرتا دو دن بعد گوہلان دشمن کے سر پر اچانک جا پہنچا۔ طارق کی اچانک آمد نے دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچا دی۔ صبح ہوتے ہی دشمن کے تین اسکواڈرن اس پر حملہ آور ہوئے۔ دشمن کے ایئرکرافٹ پر سے باندھ کر لائے اور ان پر اپنی مشین گنیں اور بم خالی کر کے چلے جاتے۔ دوبارہ پھر لوٹتے اور یہی عمل دوپہر تک دہراتے رہے۔

"گوہلان" کی اونچی نیچی سرزمین' چٹانوں اور درختوں سے بھری پہاڑیوں نے اپنی گود مجاہدین پر وا کر دی تھی۔ وہ اس میں سما گئے اور یہ معجزہ ہی تھا کہ کسی ایک چٹان کو بھی کراس زخم نہ آیا۔

دوسری طرف "آکاش وانی" گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہی تھی کہ تین سو قبائلی حملہ آوروں کو ان کی "وایو سینا" (ہوائی فوج) نے مار ڈالا ہے۔

شام ڈھلنے سے قریباً" آدھ گھنٹہ پہلے قبائلی مجاہدین نے جنرل طارق کے زیر کمان شمال مغرب اور جنوب میں پوزیشنیں سنبھال لیں۔ جنرل نے ایک پارٹی کو ہراول کے طور ریکی کرنے کے لیے آگے بھیجا تاکہ وہ لوگ عقب میں جا کر سری نگر سے اوڑی کو آنے والی سڑک بند کر دیں۔ خود ایک گروپ کے ساتھ اوڑی شہر کی فصیل کے قریب ہو کر بیٹھ رہے تاکہ موقع پاتے ہی اپنے گروپ کے ساتھ اوڑی میں داخل ہو جائیں۔

مرکزی حملہ اگلے روز بارہ بجے ان لوگوں نے اوڑی پر کرنا تھا۔ جنرل کی پلاننگ بڑی شاندار تھی۔ اس نے فوج کے بارہ رضاکاروں کے سپرد دو چھ ۳" کی مارٹر گنیں نصب کر رکھی تھیں اور ڈھائی سو گولے انہیں سونپے تھے کہ وہ لوگ ٹھیک دن کے بارہ بجے ان کا اشارہ ملنے پر اوڑی کیمپ کے عین وسط میں اچانک گولہ باری شروع کر دیں۔

جنرل طارق نے یہ مارٹر گنیں ایسی محفوظ اور ایسے زاویئے سے لگا رکھی تھیں کہ وہ اپنی جگہ سے ڈھائی ہزار گز دور تک کے ٹارگٹ کو ہٹ کر سکتی تھیں۔ خود وہ گنوں سے قریباً" ہزار گز دور ایک ایسے مقام پر بیٹھ گئے جہاں سے دشمن کا ہر کیمپ بخوبی نظر آ رہا تھا۔

پلان کے مطابق بارہ بجے ان مارٹروں کی اچانک گولہ باری کے بعد قبائلیوں نے رائفلوں کا منہ کھولنا اور دشمن پر گھات لگانا تھا' پھر کھلا حملہ کرنا تھا۔ جن لوگوں نے قبائلیوں کے "ملم جتے" کا نظارہ کیا ہے' ان کے رونگٹے اب بھی اس حملے کے تصور ہی سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس حملے میں قبائلیوں کی حالت بپھرے ہوئے چیتوں کے ریوڑ کی سی ہوتی ہے' وہ [illegible] سے اٹھتے ہیں اور خنجروں' تلواروں' بندوقوں سے دشمن کو چیرنا پھاڑنا شروع

کر دیتے ہیں۔ اس حملے کے تصور ہی سے کئی بتلات سے انگریز ان کے آگے دم دبا کر بھاگ جایا کرتا تھا۔

جنرل طارق کی نظریں بڑی بے چینی سے دشمن کے کیمپ پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہاں ہونے والی معمولی سے معمولی نقل و حرکت بھی اس کی نظر میں تھی۔ خدا خدا کر کے دن کے بارہ بجے اور جنرل نے مارٹروں کو فائر کرنے کا اشارہ کیا۔ اس کے فوراً مارٹروں کے فائر سے ہونے والے دھماکوں کی آواز پر گئے تھے اور ہمیں کیمپ کے اندر موت کا رقص دیکھنے کو بے چین تھیں' لیکن اعصاب شکن انتظار کی طوالت بدستور ہی چلی گئی۔ "مجاہد نمبر ون" نے اپنا پرانا گھناؤنا کھیل کھیلا۔ انہوں نے جنرل کو پتہ ہی نہ چلنے دیا اور مارٹر گنیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہ بڑے ہی جان لیوا مراحل تھے۔ قبائلی مجاہدین بے چینی سے مارٹروں کے فائر کا انتظار کر رہے تھے تاکہ اس کی آڑ میں حملہ کریں اور اپنے دل کے ارمان نکالیں۔ جب دس منٹ تک اس طرف سے کوئی فائر نہ آیا تو جنرل معاملے کی سنگینی جان گیا۔ اس نے بجائے انتظار کرنے کے قبائلی مجاہدین کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔

انہوں نے مسلسل پچاس گھنٹے بھارتی فوج کی ناک میں دم کیے رکھا۔ اس دوران جنرل کی سخت ہدایات کے تحت انہوں نے کیمپ پر تو ہاتھ نہ ڈالا کیونکہ جنرل انہیں یہاں حرام موت مروانے نہیں لایا تھا' البتہ بھارتی فوج کی پٹرول پر انہوں نے کئی مرتبہ گھات لگائی۔ ان لوگوں کے پاس دو دن کا راشن اور گولہ بارود ہی تو تھا' اس سے زیادہ وہ اپنے ساتھ کچھ نہیں لا سکتے تھے۔

تیسرے روز اوڑی کا بریگیڈ کمانڈر گھبرا کر وائرلیس پر سری نگر سے درخواست کر رہا تھا کہ اسے کمک روانہ کی جائے ورنہ وہ دو گھنٹے بعد اوڑی سے پسپائی اختیار کر لے گا۔ جب اوڑی کا بریگیڈ کمانڈر دو گھنٹے کی لڑائی کے بعد پسپائی اختیار کرنے کے لیے صف بندی کر رہا تھا' جنرل طارق اور ان کے ساتھی انتہائی یاسیت کے عالم میں اپنی بے سروسامانی کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کا راشن ختم ہو چکا تھا۔ بہ مشکل اتنے راؤنڈ بچتے تھے کہ وہ لوگ گوہلان سے اپنی جانیں بچا کر نکل جائیں۔ برف باری کی شدت نے اب طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی' خون رگوں میں منجمد ہوا جاتا تھا۔

دشمن کے آٹھ سو سپاہیوں کو موت کی نیند سلا کر اپنے تیرہ ساتھیوں کی قربانی دے کر جنرل طارق اور اس کے ساتھی شہیدوں کی لاشیں اٹھا کر واپسی کا سفر اختیار کر رہے تھے۔ دسمبر کے آخری ایام تھے۔ برف باری کی شدت میں ہر روز اضافہ ہو رہا تھا۔ گوہلان میں

بولڈین کا مسلہ نوٹ کیا۔ جنرل نے اپنے قدم اوڑی کی دفاعی فصیل کے باہر جما لیے اور وہ لوگ موسم' اپنوں اور غیروں کا عذاب جھیلنے کے لیے مستقبل کی تیاریاں کرنے لگے۔

☆○☆

ہاشری نالے کے دوسرے کنارے پر حوالدار غلام محمد اپنے ساتھیوں کے ساتھ بڑی بے چینی سے شیرو کی آمد کا منتظر تھا۔۔۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا جا رہا تھا اور ان کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔

۔۔۔۔اس نے اغوا شدہ مسلمان لڑکیوں سے بھرا ہوا ٹرک حوالدار غلام محمد کو سونپ کر اس پر بہت بڑی ذمے داری ڈال دی تھی۔

رات کے پچھلے پہر تک حوالدار غلام محمد نے ان لوگوں کا انتظار کیا۔ اس نے شام ڈھلے ہی ایک مخبر کو اس طرف روانہ کر دیا تھا تاکہ وہ صورت حال کا خود جائزہ لے کر آئے۔ مخبر جو ان کا ایک ہوم گارڈز تھا رات تقریباً" آٹھ بجے واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ وہاں ہوم گارڈز اور فوج کے درمیان زبردست جنگ جاری ہے۔

حوالدار معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ اسے ہر صورت میں ان مظلوم مسلم زادیوں کو کسی محفوظ مقام تک پہنچانا تھا۔ اسے رہ رہ کر اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ شیرو اکیلا رہ گیا ہے۔ اس کے ساتھی ہوم گارڈز کسی طرح بھی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے' لیکن ایک اطمینان اسے بہرحال تھا کہ وہ بھی ایک انتہائی ضروری فرض ادا کر رہا ہے۔

ہاشری نالے کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر اس نے حسرت بھری نظر بنوٹ کی سمت ڈالی۔ کبھی کبھی دھماکوں کی آواز اس کی سماعت سے بھی ٹکرانے لگتی تھی۔۔۔۔ یہ مارٹر کے گولے کی آواز تھی۔ ہلکے اسلحے کی آواز یہاں تک نہیں آ سکتی تھی۔

"گاڑی اسٹارٹ کرو۔" اس نے ایک ہوم گارڈ کو اشارہ کیا۔

اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ سری نگر کی طرف روانہ ہو گئے۔ حوالدار غلام محمد دل ہی دل میں دعا مانگتا جا رہا تھا کہ سری نگر تک کا سفر بخیر و خوبی کٹ جائے۔ اسے اپنی یا ہوم گارڈز کی فکر نہیں تھی۔ فکر تھی تو ان مسلمان مظلوم لڑکیوں کی جنہیں قدرت نے اس کی حفاظت میں دے دیا تھا۔

۔ ۔ ۔

قاہر بھی ایک ہاتھوں کی تھرتھراہٹ اس پر طاری تھی۔ اسی بدشکل ۔۔۔ قدم اس نے
ہوئی تھی کہ اس کا پاؤں کسی شے سے ٹکرایا اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھی۔ اس نے
سے اپنی پنج کا کھ گھونا تھا' پھر شیرو اس کے نقاب میں اندر آ گیا۔

۔۔۔ وی نے معاملے کی سنگینی کا احساس کر لیا اور یہ جان لیا تھا کہ یہاں سے اکیلے وہ
اپنی بھی شور ان دونوں کی جان لے لے گا۔ شیرو نے ماچس کی دوسری تیلی بھی جلا لی تھی
ان کے سامنے ایک کونے میں چارپائی پر ایک لڑکی کا جسم کھلا ہوا تھا جس میں سے کپڑے
نکل کر باہر گرے تھے۔ ایک طرف ایک لالٹین اوندھے منہ گری ہوئی تھی۔ شیرو سب سے
پہلے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے لالٹین کو سیدھا کیا جس کا شیشہ کئی جگہ سے تڑخ گیا
تھا۔ ہلا کر دیکھا تو شیرو کی جان میں جان آئی۔ اس میں تیل موجود تھا۔ اس نے سب سے
پہلے اسی کو روشن کیا اور تو بڑھا کر وہ آسیہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"اٹھو! ادھر بیٹھ جاؤ۔" اس نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ "گھبراؤ نہیں۔" آسیہ نے
کسی سحر زدہ معمول کی طرح اس کا حکم مانا تھا۔

زنک میں رکھے ہوئے کپڑے مالک کے صاحب حیثیت ہونے کا احساس دلاتے تھے۔
شیرو نے چادر اپنے جسم سے الگ کر دی اور اپنی وردی پر لگے ہوم گارڈز کے نشانات نوچ ڈالے۔ اس نے وردی کے اوپر وہاں موجود ایک لمبی سی قمیص اوڑھ کر اس پر
گرم جرسی پہن لی۔۔۔ اب کسی کو اس پر ہوم گارڈ ہونے کا شک نہیں گزر سکتا تھا۔ ایک
جرسی اور جرابیں زنک سے نکال کر اس نے آسیہ کی طرف بھی بڑھا دیں۔ جرابیں اپنے
پاؤں میں پہنتے ہوئے جب اس کی نظریں اچانک شیرو سے ٹکرائیں تو شیرو کا دل بھر آیا۔
لالٹین کی مدھم روشنی میں اس نے پہلی مرتبہ اس کے شباب کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ لڑکی کسی
کھاتے پیتے گھرانے کی نظر آ رہی تھی۔ اس کے کپڑے بھی اسی امر کی دلالت کرتے تھے اور
شیرو کی سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی کہ اس کی بربادی کی وجہ بھی اس کے باپ کی دولتمندی
ہی ہو گی کیونکہ اول تو مسلمان اور پھر بلدار' کبھی بھی ہندو لیڈروں سے محفوظ نہیں رہ سکتا
تھا۔

"مجھے بہت افسوس ہے' لیکن میں بہت مجبور ہوں۔ کاش تمہارے لیے گرم کپڑوں کا
بندوبست کر سکتا۔" شیرو خواہ مخواہ ندامت سی محسوس کر رہا تھا۔

"مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔" لڑکی کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں' لیکن اس
نے کمال ضبط سے آنسو پی لیے۔

صدمے سے شیرو کو اپنی انگلیوں کی ہڈیوں میں خارش محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ ہوس
کی ماری ہوئی بدبودار اندھیرا کر سکتا تھا۔ اس کے صبر کے ٹانکے ٹوٹ گئے تھے۔ اس نے اپنی جیب
سے ماچس نکالی اور تیلی جلا کر اس نے اپنے چہرے کے قریب کر لی۔ اس کا چہرہ شعلے کی
روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے حسن پر مرتے کوئی اپنی دنیا تک لٹا سکتا تھا۔ اس نے اپنی
آنکھوں سے ان لوگوں کو مسلمان بچیوں کی عزت بچانے کے لیے اپنا آپ وار دیتے دیکھا تھا۔ اس
لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ہوٹ کے جنم زار سے ان کی عصمتیں بچانے والے انسان نہیں فرشتے ہوں گے۔

شیرو اچانک کچھ سوچ کر اپنی جگہ سے آگے بڑھا۔ اس نے جھونپڑی کا دروازہ کھولا اور
اور باہر نکل آیا۔ نجانے کیوں اسے یہاں عجیب سی گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔
باہر آ کر اس نے دو چار لمبے لمبے سانس لیے اور چاروں اطراف گھوم پھر کر جائزہ لینے
لگا۔ پھر وہ مطمئن ہو کر لوٹا۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد شیرو کی واپسی بھی ہو گئی۔ وہ اسے کسی اور ہی عالم کی مخلوق
دکھائی دے رہا تھا۔ "ایسے عظیم انسان بھی اس دنیا میں ہوتے ہیں۔" اس نے سوچا اور شیرو
کی طرف دیکھتی رہی جو اس کی موجودگی سے بے پروا ایک کونے میں دھرے مٹکے میں سے
پانی نکال کر ہاتھ منہ دھو رہا تھا۔ فارغ ہو کر اس نے تنقیدی نظروں سے جھونپڑی کی دیوار کا
جائزہ لیا۔ دیواروں کے اندر باہر مٹی کا لیپ کیا گیا تھا۔ قدرے مطمئن ہو کر اس نے لکڑی کا
بنچ درمیان میں رکھا اور اس کے اوپر وہاں موجود باقی کپڑے پھیلنے لگا۔

"تھوڑی دیر بعد صبح ہو جائے گی۔ اگر تم ضرورت سمجھو تو منہ ہاتھ دھو لو۔ ہمارا زیادہ
دیر تک ٹھہرنا میرے خیال سے مناسب نہیں۔" اس نے آسیہ کو مخاطب کیا اور بغیر اس کا
جواب سنے "ابھی آیا" کہہ کر پھر باہر نکل گیا۔

آسیہ کو اب اس کی کسی حرکت پر حیرانی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی واپسی بمشکل تین چار
منٹ بعد ہی ہو گئی۔ شیرو کے دونوں ہاتھوں میں سیب نظر آ رہے تھے۔

"میں نے سوچا روانگی سے پہلے ناشتہ ہی کر لیں۔" اس کی بات پر ایک پھیکی سی
مسکراہٹ خواہ مخواہ لڑکی کے ہونٹوں پر آ گئی۔

"برا مت مانو اس طرف تو آ جاؤ۔" اس نے آسیہ کو دروازے کی طرف آنے کا اشارہ
کیا۔

پھر سیب اس کے ہاتھوں میں تھما کر اس نے چارپائی ایک کونے میں کھڑی کر دی اور

زمین پر ٹک کر ایک کپڑے کو آگ لگا دی۔ وہ تین منٹ تک وہ تین سے آنکھیں سینکتا رہا۔ کپڑا جلنے کے بعد وہ پلٹا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ لکڑی کا بکس جلنے لگا تھا۔ بکس کے جلنے کی بو پوری گپھا میں موجود گھٹن میں بکس کے جلنے سے خاصی کمی ہو گئی تھی۔ آسیہ کو آگ کی تپش سے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دوبارہ زندہ ہو رہی ہے۔

آگ کے گرد گھومتے ہو کر اس نے شیرو کے بے پناہ اسرار پر منہ ہاتھ دھویا اور وہ سیب کھائے تھے۔ نہ جانے اسے کیوں یقین ہونے لگا تھا کہ یہ شخص اس کو کبھی مرنے نہیں دے گا اور زندگی کی ساری روٹھی ہوئی خوشیاں دوبارہ لوٹ آئیں گی۔

"یہاں بوٹ میں تمہارے علاوہ اور کون کون تھا؟" شیرو نے نہ چاہتے ہوئے بھی خاموشی کے طلسم کو توڑا۔

"میں، بابا اور بے بے۔ میرے دونوں بھائی سری نگر میں ہیں اپنے چچا کے پاس۔ ہمارا وہاں خشک میوے کا کاروبار ہے۔ ہم بھی اگلے روز سری نگر جانے والے تھے کہ اچانک یہ قیامت آ گئی۔ ہندوؤں نے میرے والدین کو مار ڈالا اور مجھے پولیس والے وہاں ـــــ "سونی لاج" میں لے گئے تھے۔"

ـــــاس مرتبہ اس نے اپنے آنسوؤں کو روکا نہیں تھا۔

شیرو بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ اپنا بوجھ کسی طرح ہلکا کر لے۔ اسے اس لڑکی کے بے پناہ صبر و ضبط سے اب خوف سا آنے لگا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اگر آسیہ کے اندر موجود غبار نہ چھٹا تو کہیں وہ اچانک ہی نہ پھٹ پڑے اور اس کی جان لے لے۔

"اوہ معافی چاہتی ہوں۔ مجھے اس طرح آپ کے سامنے رونا نہیں چاہیے تھا۔" وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

"نہیں آسیہ!" شیرو کی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ "اچھا ہے آدمی اپنے دکھ درد پر رو لے۔ یہ اندر اندر کی گھٹن بسا اوقات بڑی جان لیوا ہو جاتی ہے۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ خلا میں گھورنے لگا تھا۔

آگ پر نظریں جمائے کھڑے ہوئے شیرو پر اس لمحے آسیہ کو بڑا رحم آیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے شیرو تو اس سے بھی زیادہ مظلوم ہے۔ اس سے بھی زیادہ ہمدردی کا مستحق۔

نہ جانے اس کے اس فقرے میں ایسی کیا بات تھی جو آسیہ کو کھا گئی۔

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" اس نے آخر پوچھ ہی لیا۔

"پونچھ۔" شیرو نے جواب دیا اور آسیہ نے بڑی حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ پونچھ سے یہاں....." اس نے فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

"میں قدرت کے نام ہیں۔ میں نے تو کبھی زندگی میں اونگی کرنے کا تصور ہی نہیں کیا تھا۔"

پھر آسیہ کافی دیر تک اس کے گھر بار کی بھی خبر لیتی رہی۔ اس نے پوچھ گچھ کرتے ہوئے اس سے سوال کر ہی ڈالا۔ "آپ نے شادی بھی تو نہیں کی۔ کیا وجہ ہے؟"

شیرو اس کا معصوم جان گیا تھا۔ مسکرا کر "ابھی ہو رہا ہے بڑی تیزی سے اور" میں نے ابھی شادی نہیں کی۔ میری ماں نے ابھی ایسا سوچا ہی نہیں۔ میری صرف ماں ہی ہے۔ اور بے بے ہے اور زبراں۔ خدا جانے وہ لوگ کس حال میں ہوں گے؟ کتنے پونچھ سے آتے ہوئے قریباً ایک مہینہ ہو گیا ہے۔"

"اوہ! آپ کو پونچھ میں انہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہاں تو حالات بہت ہی خراب ہیں۔ سنا ہے لوگ مہاراجہ کی فوج سے لڑ رہے ہیں۔"

"صرف مہاراجہ کی فوج کہاں۔ اب تو سارے بھارت کی فوج بھی وہاں پہنچ چکی ہو گی۔" شیرو نے آہ بھری۔

"پونچھ کے لوگ بہت بہادر ہیں۔ وہ کبھی نہیں ہاریں گے۔" آسیہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

پونچھ کے مجاہدوں کی کہانیاں کشمیر کے گھر گھر میں پہنچ چکی تھیں اور آسیہ سے زیادہ اور کس کو ان کی خبر ہو گی کیونکہ اس کا باپ خود سیاسی آدمی تھا اور سارے کشمیر کیا سارے ہندوستان کی خبر رکھتا تھا۔

"آپ بہت بہادر لوگ ہیں۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ "آپ نے بہت اچھا کیا جو لڑائی جاری رکھی، لیکن یہ ہوم گارڈز تو فراڈ ہیں۔ شیر کشمیر کا سیاسی فراڈ۔"

شیرو چونکا۔ لڑکی خاصی عقل مند تھی، لیکن آسیہ کو یوں لگا جیسے اس نے یہ کہہ کر غلطی کی ہو کیونکہ شیرو بھی تو ہوم گارڈز ہی تھا۔

"آپ میری بات کا برا مت مانئے۔ شاید صدمے نے میری یہ حالت کر دی ہے۔ آپ کو علم نہیں کہ میرا بابا بھی گاندھی کا زبردست پیروکار تھا اور کانگریس کے مقامی حلقوں میں ان کا بڑا احترام تھا۔ ملک آزاد ہونے پر ہمارے گھر پر کانگریس اور بھارت کا ترنگا لہرایا گیا تھا۔ جب جن سنگھ والوں نے ہمارے گھر پر حملہ کیا تو بھی ہمارے گھر پر ترنگا لہرا رہا تھا، لیکن انہوں نے میرے ماں باپ کو صرف مسلمان ہونے کے جرم میں مار ڈالا۔ میں کانگریس کی

بڑا احترام کرتی تھی لیکن اب مجھے سارے ہندوؤں سے نفرت ہو گئی ہے ـــــ شدید نفرت
یہ لوگ کبھی ہم پر اعتماد نہیں کریں گے۔ بنوٹ میں ساری جاٹی مہاراجہ کے اشارے پر کس
میں ڈالی گئی۔ اس نے مظفر آباد سے آئے ہوئے سکھوں کو کہا تھا کہ مسلمانوں کو مار ڈالو' اگر
وہ لوگ جن سنگھ کی مدد نہ کرتے تو ہمیں آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے ـــــ" وہ جنون میں نہ
جانے کیا کیا کہتی رہی' پھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہمیں چلنا چاہیے' صبح ہونے والی ہے۔" شیرو نے اس کے خاموش ہونے پر گردن
جھکائے جھکائے کہا۔

ان کے سامنے دھری آگ اب ٹھنڈی پڑنے لگی تھی' لیکن رات بھر وہ سردی کے جس
عذاب میں مبتلا رہے اس کی لذت اب خاصی کم پڑ چکی تھی۔ شیرو نے آستین گن کو اس
طرح اپنے کپڑوں میں چھپا لیا تھا کہ اب وہ اس کے جسم کا حصہ بن گئی تھی' دونوں باہر نکل
آئے۔

"میری اطلاعات کے مطابق ابھی مسلمانوں کے کچھ گاؤں بچے ہوئے ہیں' لیکن ہمیں ان
سے مدد کی توقع نہیں' ہمیں صرف سری نگر پہنچ کر ہی امان مل سکتی ہے۔ اردگرد کے تمام
علاقے میں جن سنگھ کے غنڈوں نے ہندو فوج کی مدد سے اسلحہ تقسیم کر رکھا ہے اور وہ بے
دریغ مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ ہوم گارڈز بھی ان کی کوئی خاص مدد نہیں کر سکتے'
بے چارے مجبور ہیں۔ ہم نے بھی جو کچھ کیا' اس کی سزا ہمیں بھگتنی پڑے گی' لیکن تم گھبرانا
نہیں۔ میں صرف ہوم گارڈ ہی نہیں' کشمیری مسلمان بھی ہوں اور میرے اجداد نے مجھے اپنی
غیرت بچانے کے لیے مرنے کا ڈھنگ سکھایا ہے۔ میرے جیتے جی کوئی میلی نظر سے تمہاری
سمت دیکھ نہیں سکے گا۔" شیرو کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے آسیہ کو بالکل
اطمینان دلا دیا۔

پو پھٹنے لگی تھی اور انہیں قریبی دیہات کے آثار واضح دکھائی دے رہے تھے۔ شیرو نے
گاؤں کی طرف جانے والا راستہ چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اپنایا تھا جو لمبا ضرور تھا لیکن محفوظ
تھا۔ وہ لوگ دیہات سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے۔ سورج نے اب پہاڑوں کی اوٹ سے
ڈرتے ڈرتے سر باہر نکالنا شروع کیا تھا۔ اس کی سہمی ہوئی خوفزدہ کرنیں زمین پر پھیلی کہرے
کی چادر پر کانپ رہی تھیں اور دونوں کو اسی روشنی میں گاؤں کے مکانوں پر جھانکتے کیسری
رنگ کے ترشے بخوبی دکھائی دے رہے تھے جو ان کے یہاں سے بچ کر گزر جانے کے عقل
مندانہ فیصلے پر دلالت کرتے تھے۔

☆○☆

بارہمولہ کو مجاہدین نے اپنی استعداد کوشش کے بعد بقیہ کشمیر سے کاٹ دیا تھا۔
ـــــ اور کشمیر کے اندر بریگیڈیئر پریم سنگھ کی فوج مسلسل محاصرے کی حالت میں
تھی۔ پریم سنگھ کی فوج اور اندر موجود آبادی کو سپلائی صرف باہر ہی سے جا سکتی تھی' لیکن
بذل طارق نے نومبر کے مہینے میں اوڑی' بارہمولہ روڈ کو بند کر دیا تھا اور متبادل راستہ (سری نگر
زیچ) جس پر صرف مچھر ہی سفر کر سکتے تھے' کھمرگ کی پہاڑیوں سے ہو کر اوڑی کی طرف
آتا تھا جو برف باری کی وجہ سے قریباً قریباً ناقابل عبور ہو چکا تھا۔

بارہمولہ کو آنے والے راستے بند ہونے کی وجہ سے اب بھارتی فوج کی امیدیں صرف ایئر
فضائیہ سے وابستہ تھیں' لیکن یہاں طیاروں کے لینڈ کرنے کے لیے جو مختصر سا گراؤنڈ تھا وہ
مجاہدین کی فائرنگ کی زد میں تھا اور ان کی فائرنگ سے بچ کر جو اکا دکا جہاز یہاں اترتے تھے' وہ
امدادی ضروریات کا سامان ہی لا سکتے تھے' پھر مجاہدین نے مزید جانفشانی دکھائی تو طیاروں کی
لینڈنگ بھی ناممکن بنا دی۔ اس صورت حال نے فوج کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

عین ان لمحات میں سیکٹر کمانڈر کرنل صادق خان کو ایک ایسا حکم ملا جس نے خود انہیں بھی
کر رکھ دیا۔ جی۔ ایچ۔ کیو سے پیغام آیا تھا کہ عارضی فائر بندی ہو گئی ہے۔

کرنل صادق نے اس کی وجہ پوچھی تو انہیں بتایا گیا کہ بھارتی حکومت نے زخمیوں'
بیماروں اور لاشوں کو نکالنے کی مہلت مانگی ہے۔

کرنل صادق اس دلیل پر تلملا کر رہ گئے۔ انہوں نے اس "عارضی فائر بندی" کے پس
پردہ برہمنی ذہنیت سے اپنی ہائی کمان کو آگاہ کرنا چاہا تو کسی نے ان کی بات پر کان نہ دھرے
اور ان کے خدشات صحیح ثابت ہوئے۔

زخمیوں' بیماروں کو نکالنے اور یہاں موجود سویلین آبادی کو انخلا مہیا کرنے کی آڑ میں
بھارتی فوج نے نہ صرف بے پناہ ایمونیشن اور سامان رسد ہی شہر میں پہنچایا بلکہ اطراف کی
پہاڑیوں میں بھی کمال عیاری سے اپنی بیڑیاں مستحکم کر دیں اور جب صورت حال کی نزاکت کا
احساس خداوندان سیاست و سیادت کو ہوا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔

جنرل طارق ان تمام باتوں سے لاتعلق اوڑی کے برف زاروں میں دشمن پر کاری ضرب
لگانے کے منصوبے بنا رہا تھا جب اسے یہ اطلاع ملی کہ بغیر چھٹی لیے نوکری سے غیر حاضر
رہنے پر اس کو تین ماہ کی "کمانڈ تنخواہ" سے محروم کرتے ہوئے اس کی ترقی بھی بند کر دی
گئی ہے اور اس سے دو جونیئر افسران کو ترقی دی جا رہی ہے۔ اندریں حالات جنرل نے

HBC

محسوس کیا کہ اب اس کا محاذ پر رہنا کیس کشمیر کی جنگ آزادی کو نقصان نہ پہنچانے کی وجہ صرف اور صرف اس کی ذات تھی اور وہ سارے کشمیر کو اپنی ذاتی جاگیر نہیں سمجھ سکتا تھا۔

لاہور میں وزیراعظم کے ساتھ کانفرنس کے دوران جنرل طارق کو تین دن تک جنگ بندی رکھنے کے اختلافات سے تھے۔ اس نے تین دن تک بڑی سے بڑی جنگی اور سپرد ٹکر کے ساتھ ایوں اور پرایوں کے حملے برداشت کیے تھے۔ اوڑی سیکٹر پر تو تین دن تک وہ پاکستانی فوج کے ٹینکوں کا مقابلہ کرتا رہا تھا۔ باقی تمام محاذوں پر بھی جہاد طاری تھا۔ پاکستان کے کشمیر پر حق کا دعویٰ اقوام متحدہ میں زیر بحث تھا اور عالمی رائے عامہ خاصی حد تک پاکستان کے حق میں ہموار ہو چکی تھی۔

اس دوران آزاد کشمیر کا باقی ماندہ حصہ بھی قائم ہو چکا تھا۔ "لبریشن کمیٹی" نے سیاسی ادارے کی حیثیت اختیار کر لی تھی جہاں انتظامی امور کے بجائے سیاسی امور زیادہ زیر بحث رہتے تھے۔ ہر کوئی دوسرے پر الزام لگانے اور اپنی پوزیشن صاف کرنے کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ عہدوں کی بندر بانٹ کے لیے ہوتیوں میں دال بٹ رہی تھی۔ یہ تھے وہ سنگین حالات جن میں جنرل طارق نے اس گندی سیاست سے نکلنے کا فیصلہ کیا اور حکومت سے درخواست کی کہ اسے کشمیر کی کمانڈ سے فارغ کر دیا جائے۔

☆○☆

نوروالی کو حسن کی آمد کی اطلاع شرفو کے قریب ہی بیٹھے ہوئے ملی تھی۔ وہ لوگ وہاں ایک اہم فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ پونچھ میں بھارتی فوج کی مضبوط پوزیشن اور دوسرے محاذوں پر ابھی تک پاکستانی فوج کے پس و پیش نے انہیں اپنی خواتین اور بچوں کے مستقبل کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

——نوروالی کی جہاندیدہ نظروں نے حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد ہی یہ نتیجہ مرتب کر لیا تھا کہ عورتوں اور بچوں کو سرحد پار پاکستان بھیج دیا جائے اور وہ اگر پاکستان نہ بھی پہنچیں تو کم از کم کشمیر کے آزاد کردہ علاقے میں چلے جائیں۔

اس کے ساتھیوں نے بڑے ٹھنڈے دل سے بوڑھے نوروالی کی باتیں سنیں اور خاصی بحث کے بعد وہ لوگ عورتوں' بچوں' ضعیف اور زخمی مردوں کو سرحد پار بھیجنے پر رضامند ہوئے تھے۔ جوانوں کا ایک دستہ بھی انہوں نے اس قافلے کی حفاظت کے لیے تیار کیا تھا کیونکہ گزیوں کی شکل میں اس سے پہلے پونچھ سے نکلنے والے مسلمان قافلوں پر جو قیامت مقامی غیر مسلم آبادی اور فوج کے ہاتھوں ٹوٹی تھی' اس سے وہ لوگ بخوبی آگاہ تھے۔

[illegible] کے لیے یہ خبر ناقابل برداشت تھی۔ [illegible] نوروالی کے [illegible] سے جانے کا فیصلہ کیا تو [illegible] اس نے [illegible] کہ وہ [illegible] کرے۔ وہ [illegible] جائے اور اس طرح کم از کم وہ اس [illegible] سے تو نجات حاصل کر لے گا جو [illegible] کی وجہ سے اس پر طاری کر رکھی تھی اسے [illegible] لیکن زہراں کی [illegible] کی صحیح طریقے سے [illegible] کے بعد اس نے [illegible] میں اشرف خاں نے زہراں کو دیکھ کر سرافشاں شروع کر دی تھیں [illegible] خاں وہ بنیادی طور پر سیدھا سادا طالب علم تھا اور جنگ آزادی میں شمولیت سے [illegible] کی ساری صلاحیتیں صرف ذکرہ سامراج کے خلاف جنگ کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھیں لیکن زہراں۔۔۔۔؟

زہراں کی اچانک آمد نے اسے کہیں کا نہیں رہنے دیا تھا۔ اس کے اندر ایک آتش فشاں [illegible] شروع ہو چکی تھی جس نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ خواہ مخواہ خود کو مجرم گردانے لگا تھا اور یہ احساس جرم اب شدید سے شدید تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

نوروالی کے اس فیصلے نے اس کی مشکل خاصی آسان کر دی تھی لیکن زہراں کے انکار نے اسے پھر سوچوں کے گرداب میں لا کر پھینک دیا تھا۔

پہاڑی کا موڑ مڑتے ہوئے وہ یہی دعائیں مانگ رہا تھا کہ زہراں اپنا فیصلہ بدل دے۔

اچانک کسی آواز کی بازگشت نے اس کے قدم تھام لیے۔ پہاڑی کے دوسرے کونے سے کسی نے اس کا نام لے کر اسے پکارا تھا۔ آواز ایک گونج پیدا کرتے ہوئے اس تک پہنچی تھی۔

"خدا خیر کرے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور واپس چلا گیا۔

پہاڑی موڑ مڑتے ہی جس شخص پر اس کی نظر پڑی' اسے دیکھتے ہی شرفو کی دھڑکنوں میں شدت پیدا ہو گئی۔

"فرزند تم!" اس نے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

"شرفو!" فرزند اس کی بانہوں میں سمٹ گیا۔ "میں تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں لایا شرفو' مجھے معاف کر دینا۔" فرزند نے اس کے گرد اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے شرفو کی پیٹھ کو تھپتھپایا۔

نوروالی بھی اس اثناء میں وہاں چپ چاپ آ کر کھڑا ہو گیا۔ فرزند کی کسی سوالی بات اور

نورولی کی سرگوشی نے شرفو کو جیسے جگا دیا تھا' لیکن اس حالت میں بھی وہ چوکنا تھا۔ کچھ کہنے کو چاہا تھا۔

"کیا بات ہے فرزند؟" اس نے بیٹے سے پوچھا جس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

فرزند نے بھی کہنا چاہا' لیکن اچانک جیسے کسی طاقت نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی۔ سامنے کے موڑ سے اچانک زہریلی دھواں نمودار ہوئی تھی۔ شاید یہ خبر اس تک پہنچ چکی تھی۔ وہ چپ چاپ نورولی کے زویک آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

"تم اکیلی منظور تھا بیٹی کہ شیرو ہم سے الگ ہو جائے۔ شاید خدا کو بھی یہ قربانی منظور نہیں۔ بخدا وہ سرشتوں میں سرشتہ تھا کہ عظیم فرض کی ادائیگی میں اس نے شہادت پائی اور ہمیں اکیلا چھوڑ گیا۔" نورولی کی آواز بھرا گئی۔

"صبر—— میری بچی صبر کرو۔ یہ کمزور نہیں کرتے میری بچی۔" نورولی کا گلا رندھ گیا۔

فرزند نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا اور شرفو کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا' وہی بات جو اس نے سوچی تھی۔

"اف خدایا! یہ کیا ہو گیا؟" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کے اندر جیسے کچھ ٹوٹنے لگے تھے۔ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا' پھر اسے اپنے گالوں پر گرم آنسوؤں کے قطرے گرنے کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہ غبار جس نے اس کا دم گھونٹنا شروع کر دیا تھا' اس کے پیٹ سے حلق کی طرف سفر کرنے لگا۔ شرفو نے انتہائی ضبط سے کام لیا' لیکن اس ریلے کی طغیانی کے سامنے اس کی ایک نہ چلی اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"شرفو!" فرزند نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "اگر تم ہی ہمت ہار گئے تو زہراں....."

اور اس نے سوچا واقعی اب اسے زہراں کا سہارا بننا تھا۔ حالات نے جس بری طرح اس لڑکی کو رگیدا تھا' اس کے بعد شرفو کے سوا اس کا رہا ہی کون تھا۔

"مجھے ساری کہانی سناؤ فرزند۔" شرفو نے حیرت انگیز ضبط کا مظاہرہ کیا' پھر وہ زہراں سے مخاطب ہوا۔ "تو زہراں تم بھی سن لو۔ فرزند اس کے ساتھ بنوٹ میں تھا۔ وہیں ہمارا شیر شہادت کے منصب پر سرفراز ہوا ہے۔ چپ ہو جاؤ زہراں۔ ان آنسوؤں کو یوں مت بہاؤ۔ ہمیں ہمت کرنا ہے۔ اپنے پیاروں کا ماتم کرنے سے پہلے ابھی ہمیں بہت لمبی زندگی

[illegible] ہمیں [illegible] کرنی ہو گی۔ ہزاروں اس لمحے میں کھن اپنے [illegible] سے [illegible] ہمیں قربانیوں مانگ رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ عظیم قومیں ہیں۔ ہمیں [illegible] زندگی ان دونوں کو بلائے گی۔

☆○☆

ہمیں شیرو کے ساتھ گھٹے کرنے میں جیتے ہی فرزند نے انہیں سری نگر سے بنوٹ [illegible] کی کہانی سنانا شروع کر دی۔ ہم اکٹھے فارغ کرتے ہوئے پہنچے تھے۔ میں یہ سمجھ تو [illegible] کیا ہمیں [illegible] کہانی سنانے کے لیے زندہ بچا ہوں۔ کتنا بدقسمت ہوں میں۔ شاہ ہی [illegible] اور بچا ہوں۔ ساتھیوں کے جو مورچہ [illegible] غلام محمد کے ساتھ سری نگر کی طرف نکل گئے۔ نورولی! بخدا میں بزدل نہیں ہوں' لیکن یہ بے مقصد کی بے وقعت موتیں اب میری برداشت سے باہر ہیں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "میں نے وہ وہ منظر دیکھے ہیں کہ لب سیرا ایمان ہی انسانیت سے اٹھنے لگا ہے۔ نورولی! چٹان بھاگ رہے ہیں۔ ہندو فوج آگے بڑھ رہی ہے۔ ادھر پاکستان سے کوئی فوج ہماری مدد کو نہیں آ رہی۔ ہم اتنے موسن نہیں کہ آسمان سے فرشتے ہماری مدد کو اتریں گے۔"

——اس کے آخری فقرے کی تلخ اتنی گہری تھی کہ بوڑھا نورولی تلملا اٹھا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" اس نے بڑی ہمت سے کام لے کر اپنے لہجے پر کنٹرول کیا تھا۔

"نورولی!" فرزند کی آواز خاصی بلند ہو گئی تھی۔ "کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے [illegible] کا خطرہ ٹلا نہیں کرتا۔ خدا کے لیے حالات کو سمجھو۔ ہم اس بے سروسامانی کی حالت میں آخر کب تک لڑ سکتے ہیں—— کب تک؟ اور ہم آخر لڑ کس کی امید پر رہے ہیں؟ دشمن اپنی پوزیشن مستحکم کرتے ہی ایک ایک کو سسکا سسکا کر مار ڈالے گا۔ جتنی جلدی ممکن ہو' یہاں سے نکل جاؤ۔" اس نے اپنی بات مکمل کر کے نظریں جھکا لیں۔ شاید اس میں کسی سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہیں تھا۔

وہاں موجود چاروں میں سے ہر کوئی دوسرے سے نظریں چرا رہا تھا جیسے وہ چاروں ایک دوسرے کے چور ہوں۔ تینوں مرد خود کو شیرو کی موت کا ذمے دار سمجھ رہے تھے۔ ان سب پر سکوت طاری تھا' پھر نورولی نے ہی ہمت کی۔

"فرزند! میں تمہاری بات سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں جلد یا بدیر یہ حصار بالآخر ٹوٹ جائے گا' لیکن ہم کو لڑنا ہے۔ آخر دم تک—— آخری آدمی تک۔"

——ہم ہراول دستے کے سپاہی ہیں اور اگر ہم ہی ہمت ہار گئے تو وادیٔ کشمیر سے [illegible]

چپہ پر پہلی سے صورتحال اور بھی گھمبیر ہو جائے گی۔ وہ لوگ صرف ہم سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ پنگاری ہم نے سلگائی تھی۔۔۔۔ ہم پر بھی کے لوگوں نے اور اس آگ کا ایندھن بھی انہیں ہم ہی کو بننا ہو گا۔"

اس کی بات ابھی بمشکل مکمل ہی ہوئی تھی کہ دروازے کے باہر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ اشرف خان نے بڑی پھرتی سے اپنا ریوالور نکال لیا۔ فرزند واکثل پکڑ کر اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازے سے چپک گیا۔ نورولی خود آگے بڑھا۔ اس نے زہراں کو شرفو کے پیچھے کھڑے ہونے کو کہا۔

"کون ہے؟" اس نے باہر نکل کر للکارا۔

"میں ہوں چاچا نورولی۔" ایک مجلد کی آواز آئی۔

"آ جاؤ۔" اس نے آواز پہچان کر آنے والے کو اجازت دی۔ "تم یہاں کیسے فضل داد؟" نورولی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

اس اثناء میں باقی تینوں بھی مطمئن ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

"میں بڑی مشکل سے ان لوگوں کو دھوکا دے کر یہاں تک آیا ہوں چاچا نورولی۔" فضل داد کی گھبراہٹ نمایاں تھی۔

"کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟" نورولی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"چاچا حوالدار صاحب شہید ہو گئے۔" اس نے شرفو کی طرف بڑی ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

"انا للہ و انا الیہ راجعون۔" نورولی کے منہ سے نکلا۔

"کیا؟" شرفو نے فضل داد کو آگے بڑھ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

"ہاں شرفو بھائی۔ تمہارے والد شہید ہو گئے۔ میرا بھائی کرم داد بھی ان کے ساتھ شہید ہوا ہے۔ بریگیڈیئر پریتم سنگھ کے سپاہیوں نے ان دونوں کو گھیرا ڈال کر زندہ گرفتار کر لیا تھا' پھر ایک درخت سے لٹکا کر دونوں کو پھانسی دے دی۔ ظالموں نے ہمیں لاشیں بھی نہیں دیکھنے دیں۔"

فضل داد بولتا جا رہا تھا اور شرفو کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ اس کے منہ کا ذائقہ اچانک کڑوا ہو گیا تھا' حلق سوکھنے لگا تھا اور ایک مرتبہ پھر وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ اسی کیفیت کا شکار ہو چلا تھا جس سے وہ ابھی تھوڑی دیر

پہلے ہی نکلا تھا۔ باپ کی موت کی خبر سننے کے بعد ہوا تھا۔۔۔ ایک بار پھر اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ وہ بھی نہ رہا تھا۔ اس نے اپنا سر اٹھا کر اچانک جب نورولی کی طرف دیکھا تو اسے لگا کہ اس کا چہرہ بھی آنسوؤں سے تر ہے۔ اس نے اپنا ریوالور نکالا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں ان کتوں کو مار ڈالوں گا۔" وہ دیوانگی کے سے عالم میں دروازے کی طرف بڑھا۔ بجلی کی سی پھرتی سے فرزند نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ہی نورولی بھی اس کی مدد کو آگے بڑھے۔ زہراں ایک کونے میں سمٹ کر پہلی بار خوف سے چیخنے لگی تھی۔

"چھوڑ دو مجھے چاچا۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں ان کو۔۔۔ میں ان کو مار ڈالوں گا۔" شرفو چیخ رہا تھا۔ "انہوں نے شیرو کو بھی مار ڈالا۔ میرے باپ کو بھی مار ڈالا۔" شرفو کی آواز رندھ گئی تھی۔ وہ تینوں کے بس سے باہر جا رہا تھا۔ تینوں نے اپنی گرفت اس پر مضبوط کر دی۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز بڑبڑاہٹ میں تبدیل ہونے لگی۔ بالآخر اس پر غشی طاری ہو گئی۔

نورولی نے اسے اپنے بازوؤں کے سہارے زمین پر لٹا دیا۔ زہراں تڑپ کر آگے بڑھی۔

"شرفو!" اس کے منہ سے نکلا اور وہ دوبارہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

نورولی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے پرے ہٹ جانے کو کہا۔ "بیٹی اگر ہم میں سے کوئی بھی رویا تو یہ پاگل ہو جائے گا۔ اسے حوصلہ دو۔۔۔ حوصلہ دو اسے۔" اس نے اپنی قمیص کی آستین سے داڑھی پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا۔ کتنا کٹھن فیصلہ تھا نورولی کی تنہا کا۔ باقی دونوں نے بھی دہرایا۔

"پانی لاؤ۔" اس نے زہراں کو اشارہ کیا جس نے کمال ضبط سے اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹا تھا۔

دس منٹ بعد جب شرفو کو ہوش آیا تو سب سے پہلے اس کی نظر زہراں پر پڑی جس نے اسے ہوش میں آتے دیکھ کر اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ شرفو نے باری باری گردن گھما کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے اطراف اکٹھوں بیٹھے ہوئے چہروں پر نظر ڈالی' چند لمحے وہ دم سادھے چپ چاپ بیٹھا رہا' پھر اٹھ کر اچانک کھڑا ہو گیا۔ فرزند تیزی سے باہری دروازے کی طرف لپکا۔ باقی دونوں کے ساتھ زہراں بھی خوف

کمزی ہوئی' لیکن شرفو اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ وہ ہاتھ باندھے "نگی ہاند" سے بھی بھی نظریں اٹھا کر نوروالی کو گھور تا رہا۔

"چاچا" ایک کربناک آواز اس کے گلے سے بلند ہوئی اور وہ نوٹی ہوئی اٹلی کی طرح نوروالی کے بازوؤں میں گر کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ فضل داد اور فرزند سے اسے دوسری طرف موڑ لیے اور زہراں پھر سسکنے لگی۔

☆○☆

تین دن تک نوروالی نے انھیں مسلسل اپنی نگرانی میں رکھا تھا۔ یہ تین دن پونچھ کے مسلمانوں کے لیے قیامت سے ہرگز کم نہ تھے۔ مسلمانوں کا قتل عام روزانہ کا معمول بن چکا تھا۔ نوروالی کو شرفو اور زہراں کے متعلقین کی قربانیوں کا شدت سے احساس تھا۔ وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا کہ ان دونوں کو محفوظ مستقبل کی ضمانت دے لیکن کس طرح؟ یہ سوال اسے پریشان کیے ہوئے تھا۔ تیسرے دن مسلسل سوچ بچار اور برادری کے ان سرکردہ لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد جو ابھی پونچھ میں تھے' نوروالی ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

اور اس روز وہ اسی ارادے سے شرفو کے پاس آیا تھا کہ اسے بلوا نخواستہ اپنے فیصلے سے بھی آگاہ کرے اور پونچھ سے ہجرت پر بھی تیار کرے۔ شرفو اسے "پنڈ گلہ" کے باہری ل گیا۔ وہ اپنی رائفل کھول کر اسے صاف کر رہا تھا جب نوروالی اس کے سر پر جا پہنچا۔

"سلام چاچا۔" اس نے نوروالی کو دیکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"جیتے رہو۔" نوروالی نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا۔ اس دوران شرفو نے رائفل دوبارہ بند کر لی تھی۔

"میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں بیٹا۔ گو کہ ایسی باتیں خاص مواقع پر ہی کی جاتی ہیں' لیکن حالات جس نہج پر جا رہے ہیں وہاں میں کسی بات کو ادھوری چھوڑنے یا کل پر ٹالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"کہو چاچا تم کوئی فیصلہ تو نہیں ہو۔" شرفو نے خلا میں کسی کھوئی ہوئی شے کو ڈھونڈتے ہوئے کہا۔

نوروالی نے پہلے تو اسے اس کی ذمہ داریوں اور مستقبل کے خدشات کا احساس دلایا' پھر ... ی ... ن سے آگاہ کرنے کے بعد بالآخر ہمت کر کے کہا۔ "میں برادری کے ... سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ تم دونوں کا نکاح کر کے ... پونچھ سے ... جانے کی طرف بھیج دیا جائے۔۔۔۔ زہراں نی الحال میرے گھر

رہے گی اور تم اسے بابا کے ساتھ۔ پھر ان حالات کے تھم جانے پر تم دونوں اپنی ازدواجی زندگی شروع کر دینا۔"

۔۔۔۔اپنی بات مکمل کر کے اس نے اوپر بیٹھی شرفو کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کو جاننے کے لیے اس کی طرف دیکھا تو اس کی ساری توجہ اسی کی طرف مبذول پائی۔

"میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں چاچا' لیکن اول تو اس معاملے میں میری رضامندی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ پھر آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہم ایک مقصد کے لیے گھر سے نکلے ہیں' باپ اور بھائی نے اپنی جانیں قربان کیں' میں اس مقصد کے حصول تک میدان کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ مجھے بھی ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر چاچا' جان کے تحفظ کے روز ان کے سامنے شرمسار نہیں ہونا چاہتا۔"

"دیکھو بیٹے۔" نوروالی نے اس کے جواب سے قدرے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں خدانخواستہ میدان جہاد سے بھاگنے کی ترغیب نہیں دوں گا' یہ بات ہماری غیرت کے خلاف ہے' لیکن بعض ذمے داریاں اتنی اہم ہوتی ہیں کہ دوسرے تمام اہم معاملات کو ان پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ میں صرف تمہارے لیے میدان جہاد نہیں چھوڑ رہا ہوں۔ تم یہاں سے جا کر آزاد کشمیر کی باقاعدہ فوج کے ساتھ لڑائی میں شامل ہو جانا' پھر تمہیں اپنی تعلیم کا بھی خیال کرنا چاہیے۔ حوالدار مرحوم کی شدید خواہش تھی کہ تم اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے فوج میں جاؤ' پھر تم خود ہی بتاؤ آخر زہراں کو ہم اکیلا کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ خصوصاً ان حالات میں! شرفو یہ مت بھولو وہ تمہارے مرحوم دوست کی امانت ہے جو یہاں سے رخصت ہوتے وقت اس کی ذمے داری تمہیں سونپ گیا تھا۔۔۔۔۔"

کافی دیر کی بحث کے بعد بالآخر نوروالی کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی' لیکن شرفو نے اس سے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا۔ "چاچا! مجھے اس بات کی خوشی بھی ہے کہ زہراں نے بغیر کسی دباؤ کے اس فیصلے کو قبول کیا ہے' ورنہ یہ بات یاد رکھنا کہ تم دو زندگیوں میں جو پہلے ہی نیم مردہ ہیں' زہر گھول دو گے۔"

"تم مطمئن رہو شرفو۔ مجھے خدا کے سامنے بھی اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہونا ہے۔" اور وہ واپس آ گیا۔

☆○☆

زہراں نے نوروالی کی بیوی کی ساری بات بڑی توجہ سے سنی تھی۔

۔۔۔۔صدمات نے اسے نڈھال ضرور کر دیا تھا' لیکن اب وہ زندہ حقیقت پسند ہو

HBC

کئی تھی۔ حالات اس کے سامنے تھے اور مستقبل کے خدشات کا وہ اپنے حساب سے جائزہ لے رہا تھا۔ زہراں کو اپنے سینے سے لگانے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زہراں جانتی تھی کہ کھلے بڑی تیزی سے اسے لگنے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زہراں جانتی تھی کہ اس کی حیثیت خزاں کے اس پتے جیسی ہے جو ڈالی سے الگ ہو کر گر پڑا ہو۔ اسے زندگی کے طویل صحرا کو پانے کے لیے ایک مضبوط سہارا درکار تھا ورنہ ہوا کا کوئی بھی تیز جھونکا اسے اپنے ساتھ اڑا کر کہیں بھی لے جائے گا۔

شرفو اس کے مرحوم شوہر کا جگری یار تھا اور دونوں میں کئی قدریں مشترک تھیں۔ شیرو نے روانگی کے وقت اسے زہراں کی حفاظت کی ذمہ داری سونپ کر اس پر مکمل اعتماد کا اظہار ہی نہیں کیا تھا بلکہ اسے ہر معاملے میں اپنا دست راست بھی جانا تھا' پھر شرفو بھی تو اکیلا ہی رہ گیا تھا۔ اسے بھی تو کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ شیرو اور اس کے گھر والوں کی غیر موجودگی میں خصوصاً" اس کے باپ اور شیرو کی ماں کی شہادت کے بعد اس نے جس طرح زہراں کی ذمے داری اٹھائی تھی اور اس کے دکھ درد بانٹے تھے' وہ کچھ اسی کا حصہ تھا۔ مستقبل کے تحفظ کا احساس ہی اس کے لیے نعمت خداوندی تھا۔ اس نے جواب میں "چاچی جی" کہہ کر گردن جھکالی اور چاچی اس کا مدعا جان گئی۔

"اللہ تمہیں خوش رکھے بیٹی۔" وہ اٹھ گئی۔

اسی رات ایک سادہ سی تقریب میں دونوں کا نکاح ہو گیا۔ برادری کے قریباً" سب ہی لوگوں نے نوردلی کے اس فیصلے کو سراہا تھا اور دونوں کی کامیاب زندگی کے لیے دعا کی تھی۔ نوردلی نے زہراں کو ساری برادری کے سامنے اپنی بیٹی بنانے کا اعلان کیا تھا اور بتایا تھا کہ حالات سدھرنے پر خود زہراں کو اپنے ہاتھوں رخصت کرے گا۔

دوسرے روز ایک قافلہ پونچھ سے پاکستان کی طرف ہجرت کر رہا تھا۔ اس قافلے کی حفاظت کے لیے مٹھی بھر جوان مرد بھی اپنی رائفلیں لیے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ قریباً" ہر سدھن عورت کے پاس اپنی حفاظت کے لیے چاقو یا کلہاڑی موجود تھی۔ شہر سے باہر جانے والے "محفوظ راستے" تک نوردلی اور اس کے جانباز بھی ان کے ساتھ آئے تھے۔ یہاں رہ جانے والے قریباً" سب ہی جوان مردوں نے اپنے اہل خانہ کو رخصت کر دیا تھا۔

یہ رخصت ہونے والے بدقسمت یہی گمان کرتے تھے کہ کچھ عرصے بعد ہی جب ان کے مسلمان پاکستانی بھائی مقامی مجاہدین کی مدد کو آ جائیں گے اور ان کے اجداد کی قربانیوں کا صلہ پاتے ہوئے پونچھ کو دشمن کے خونی پنجے سے نکال کر ان کے حوالے کر دیں گے' تب وہ سب یہاں فاتحانہ انداز میں داخل ہوں گے اور آزاد فضاؤں میں قیام کریں گے۔

سنے بدقسمت لوگ تھے وہ۔۔۔۔!

☆○☆

یونٹ سے سری نگر تک کا سفر شیرو کے لیے بڑی مراد کا سفر ثابت ہوا تھا۔ موسموں اور مسافتوں کا عذاب جھیلتا وہ تنہا سے ہمراہ تک پہنچا تھا۔ پھر پہلے وہ دن کو چھپے رہتے' رات کو سفر کرتے' پہاڑوں اور پل سے سہارے زندہ رہے تھے۔

آسیہ کو اس سفر ہی میں اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا کہ وہ محض ہمدردی میں نہیں شیرو کی ذات میں اسے اپنا "تحفظ" نظر آ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ محض ہمدردی نہیں وہ ضرور کر گزرے گا اور پہنچتے ہی اسے اس کے بھائیوں تک ضرور پہنچا دے گا۔ محض اس بات کی شکل میں اس نے اپنا مستقبل بھی دیکھ لیا تھا۔

اس دوران دونوں نے جی بھر کے ایک دوسرے سے باتیں کی تھیں۔ اپنے گھر کی' اپنے باغوں کی' کشمیر' مجاہدین کی' پونچھ اور سری نگر کی باتیں۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ وہ کھل کر شیرو سے اظہار محبت کر دے۔ وہ ایسی ہی دلیر لڑکی تھی۔ اس نے احسان اور آزادانہ سیاسی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس ماحول نے اس میں سے بلا وجہ کی جھجک کو کہ نکال دی تھی' لیکن وہ شیرو سے کبھی اس موضوع پر بات نہ کر سکی۔

شیرو نے بھی اس سے زمانے بھر کی باتیں کی تھیں' لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی کبھی اس سے زہراں کے متعلق کوئی بات نہ کر سکا۔ اصل میں وہ زہراں کی یادوں میں کبھی کسی کی شرکت گوارہ نہیں کرتا تھا۔ اس نے زہراں کی یادوں کو صرف اپنا سرمایہ حیات بنا رکھا تھا۔ کئی دفعہ اس کا جی چاہا کہ وہ کم از کم آسیہ کو یہی بتا دے کہ وہاں زہراں نام کی ایک لڑکی اس کا انتظار کر رہی ہے جسے وہ کبھی بھلا نہ سکا۔ کبھی خود سے الگ نہ کر سکا۔ میدان کارزار میں جب کبھی اسے فرصت کے چند لمحات میسر آئے' زہراں چھم سے اس کے نہاں خانہ دل سے باہر نکل آئی' لیکن وہ آسیہ سے کبھی اس مسئلے پر بات ہی نہ کر سکا۔ ہر دفعہ اس کا رواجی حجاب آڑے آیا۔

آسیہ کے بھائیوں نے اس کو پوجا کی حد تک تعظیم دی تھی۔ انہوں نے شیرو کی منت کی کہ وہ ان سے احساس تشکر کے طور پر کچھ قبول کر لے' لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ لوگ اسے روکنے اور اس کی مہمانداری پر بضد تھے' لیکن شیرو کو تو اڑ کر پونچھ پہنچنے کی پڑی تھی۔

"میں آپ کی واپسی کی منتظر رہوں گی۔" آخر آپہ نے اس سے کہہ ہی ڈالا اور نبی
نے جب اس بات کی گہرائی کو پایا تو ٹھٹھک کر رہ گیا۔

"میں جس منزل کا مسافر ہوں آپہ اس پر جانے والے کم ہی لوٹ کر آیا کرتے ہیں۔"
بڑی مشکل اس نے کہا اور آپہ کا جواب سنے بغیر ہی "خدا حافظ" کہہ کر باہر آ گیا۔

آپہ کا بڑا بھائی اس کے ساتھ بڑی دور تک آیا تھا۔ "شیرو بھائی! اس گھر کے دروازے
تم پر ہمیشہ کے لیے کھلے ہیں۔ اگر کبھی سہولت ملے تو ضرور آنا۔" اس نے دم رخصت اس
سے کہا تھا۔

شیرو اس سے الگ ہو کر سید حاجی خان سے آ کر ملا تھا جس تک ملاقات کی سب خبریں
اس کی آمد سے پہلے ہی پہنچ چکی تھیں۔ دونوں رات گئے تک تیکری کی اسی دکان کے پیچھے
بنے تہہ خانے میں بیٹھے رہے۔ شیرو نے اسے ہوٹ کے ایک ایک لمحے کی کہانی سنا دی
تھی۔ پونچھ کے عام حالات کی خبر تو نبی خان کو تھی' لیکن وہ بھی اس سے بے خبر تھا کہ شیرو
کے گھر والوں پر کیا قیامت ٹوٹی ہے۔

"تم فوراً پونچھ پہنچو' وہاں ہمارے تمام شاہین جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ اپنے گھر
والوں کو آزاد علاقے کی طرف روانہ کر کے لوٹ آنا۔ اب ہمیں سری نگر کو مرکز بنانا ہے۔"
نبی خان نے اسے رخصت کر دیا۔

رات کے دوسرے پہر دو سائے ایک مکان سے برآمد ہوئے۔ یہ شیرو اور نبی خان تھے۔
نبی خان اسے سری نگر کے باہر تک چھوڑنے جا رہا تھا۔ ایک محفوظ مقام پر وہ اس سے
علیحدہ ہو گیا۔

"فی امان اللہ!" شیرو نے اس سے بغل گیر ہو کر الگ ہوتے ہوئے کہا۔

"فی امان اللہ!" نبی خان بولا۔

وہ کافی دیر تک وہاں کھڑا شیرو کو اندھیرے کی چادر میں غائب ہوتے دیکھتا رہا' پھر لوٹ
آیا۔

انجانی منزل کا مسافر

سورج اس کے عقب کی پہاڑیوں میں ڈوب رہا تھا جب وہ پونچھ سے [illegible] داخل ہوا۔ اس نے اپنا چہرہ اس طرح عمامہ میں لپیٹ رکھا تھا کہ [illegible] تک بھی نہ کرے اور وہ دیکھنے والی نگاہوں سے پوشیدہ بھی نہ رہے۔

---شہر کے گرداگرد پھیلی ہاروی سرگوں سے بچتے بچاتے اس نے [illegible] محفوظ راستہ اپنایا تھا۔ اس نے شہر کے باہری سورج کے غروب ہونے کا نظارہ کیا تھا۔

وہ ایک پہاڑی نالے کی اوٹ میں سامنے پونچھ پر نگریں جمائے بیٹھا تھا۔ پونچھ--- جو اس کی ہی نہیں کشمیر کے تمام حریت پسندوں کی آخری امید گاہ تھی۔ ہمارے [illegible] جانے والی جدوجہد آزادی کا دارومدار پونچھ پر ہی تھا جہاں مجاہدین نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی لیکن--- ہر طلوع ہونے والی صبح ان کے لیے دشمن کی نفری میں اضافے اور [illegible] قافلہ بندیوں کی خبر لے کر آتی تھی۔

شیرو کی سوچوں کا محور زہراں تھی اور اس کی ماں---!

---اسے اس بات پر شرمندگی تھی کہ وہ جس مشن کے لیے گیا تھا' اسے مکمل نہیں کر سکا اور حالات نے اسے راستے ہی سے لوٹ جانے پر مجبور کر دیا' لیکن اس کا ضمیر بہرحال مطمئن تھا کہ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اس سلسلے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی--- وہ اپنے فرائض میں کوتاہی کے گناہگار نہیں ہوئے تھے' پھر بھی نہ جانے کیوں ایک بے نام سی خلش اسے ستا رہی تھی۔

اس کے بعد اس کی ماں اور زہراں پر کیا گزری تھی؟ اس کی خبر اسے بھی نہ ہو سکی۔ اسے تو یہ علم بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ اس وقت کہاں ہوں گے۔ اس نے صرف شرفو کراسنگ میں لیا تھا اور اب وہ شرفو ہی کے ایک لمحکانے کی طرف جا رہا تھا۔ اسے علم ہو چکا تھا کہ اپنوں کے ہاتھوں پونچھ میں ان کی بازی پٹ گئی ہے اور دشمن کے قدم روز بروز مضبوط ہو رہے ہیں۔ یہ بات شیرو کے لیے اگرچہ چونکا دینے والی تھی' لیکن فی الوقت اس خبر نے

جاتے ہوئے بھی اسے ایمان لانا پڑا اور اب وہ پرچھ کے باہر ایک بھاری پر بیٹھا اپنی آنکھوں سے بدلے ہوئے حالات دیکھ رہا تھا۔

"کیا گزری ہو گی میرے گھر والوں پر؟" یہی سوچ اسے گھلائے جا رہی تھی۔

اور اس کی سوچوں کا تانا بانا آخر فائر کے زوردار دھماکے کی آواز سے ٹوٹا۔ ہوم گارڈ کے ساتھ کچھ عرصہ گزارنے کے بعد وہ کم از کم اس قابل ضرور ہو گیا تھا کہ فائر کی شدت کا صحیح اندازہ کر سکے ـــــ یہی کی آواز اور اس کے بعد کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے دھماکے نے انکشاف کر دیا تھا کہ یہ میڈیم گن کا فائر ہے۔ یہ انکشاف ہی اس کے لیے کسی زوردار دھماکے سے کم نہیں تھا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ "کتنی جلدی اور اچانک یہ تبدیلی آ گئی تھی۔"

وہ اپنے سائے سے بھی ہوشیار بڑے بچے تلے قدموں سے نیچے اتر آیا کیونکہ اس زوردار فائر کے بعد ہلکے اسلحے کی مسلسل فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔

ـــــ ایسی آنکھ مچولی وہاں اکثر ساری ساری رات جاری رہا کرتی تھی۔ فریقین اپنے اپنے کیمپ میں سے ایک دوسرے پر گولہ باری کرتے رہتے تھے۔ مجاہدین کے پاس ہلکا اسلحہ تھا اور وہ لوگ چھپ کر اکا دکا بھارتی فوجی پٹرول پر گھات لگایا کرتے تھے جب کہ ذرا سا شک گزرنے پر بھارتی فوج ان کے ٹھکانوں پر اندھا دھند گولہ باری کرنے لگتی تھی اور یہ سلسلہ صبح تک جاری رہتا تھا۔

شیرو کو اب یہ بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھیوں نے اپنے ٹھکانے وہیں رکھے ہوں گے یا بدل لیے ہیں۔

ـــــ اس کا رخ پونچھ کے اس گھنے جنگل کی طرف تھا جہاں اس کی دانست میں ابھی تک اس کے ساتھیوں کو ضرور موجود ہونا چاہیے تھا۔ نبی خان نے اسے بتایا تھا کہ حسین خان اپنے دستے کے ساتھ جموں کی طرف نکل گیا تھا اور بنوٹ میں اس سے الگ ہو جانے والے اس کے ساتھی مقلوم عورتوں کے ساتھ بہ حفاظت سری نگر پہنچ گئے تھے۔ انہی کی زبانی نبی خان کو بنوٹ والے حادثے کی اطلاع ملی تھی ـــــ گھیرے میں آ جانے والے ہوم گارڈز میں سے صرف شیرو ہی اسے مل سکا تھا۔

جنگل میں داخل ہوتے وقت شیرو سوچ رہا تھا کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک اس جنگل میں دور دور تک کسی ڈوگرہ سپاہی کو پھٹکنے کی جرات نہیں ہوتی تھی اور آج وہ ڈر ڈر کر اور چھپ چھپ کر اپنے ساتھیوں کے پاس جا رہا تھا۔ اس جنگل کا کونہ کونہ اگرچہ اس کا دیکھا بھالا

تھا لیکن نہ جانے کیوں اسے اس وقت یہ سب کچھ غیر مانوس سا محسوس ہو رہا تھا۔

بھاری سلسلے میں بظاہر وہ بڑا ہلکا ہو کر چل رہا تھا لیکن ایک دوسرا شخص اس سے زیادہ ہوش مند تھا جو اچانک ہی اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"ہالٹ" ایک چیختار اس کے پہلو میں گونجی۔

شیرو نے مڑ کر دیکھنا چاہا لیکن اس رائفل کی نلکی ہی اس سے ہو اس کی گردن سے آ تلی تھی۔ اسے واپس مڑنے پر مجبور کر دیا۔

"زیادہ چالاکی نہ دکھانا۔ ہاتھ اوپر اٹھائے رکھو۔ کون ہو تم؟"

"شیرو۔" اس کے منہ سے بہ مشکل اپنا نام نکلا ہی تھا کہ اسے اپنے منہ سے نکلے ہوئے اور حیرت زدہ لہجے میں "شیرو؟" کی تکرار سنائی دی۔

وہ غیر ارادی طور پر آواز کی طرف گھوما۔ اس کے سامنے فرزند کھڑا تھا ـــــ اس کا ساتھی جو بنوٹ سے اس کے ساتھ ہی بھاگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شیرو کا ہاتھ اپنے منہ کی طرف اٹھا اور اس نے اپنے چہرے پر لپٹے کپڑے کو کرا دیا۔

"فرزند! تم..... تم زندہ ہو؟ اوہ میرے خدایا!" شیرو کو تو جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا' لیکن وہ فرزند کے دل و دماغ پر ٹوٹنے والی قیامت سے بے خبر رہا۔

"شیرو!" فرزند نے بمشکل اپنے بند گلے کو کھولا۔ اس کے ساتھ ہی وہ آگے بڑھا اور بے تابانہ اس سے لپٹ گیا۔ "میرے خدایا مجھ سے انجانے میں کیا ظلم ہو گیا؟" وہ چیخا۔

"کیا بات ہے فرزند؟ کیا ہوا؟" شیرو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ادھر آ جاؤ۔" فرزند نے ایک سمت اس کی راہنمائی کی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح شیرو پر ٹوٹنے والی ان قیامتوں سے اسے آگاہ کرے جن کا شکار شیرو یکے بعد دیگرے ہو چکا تھا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس کا تو سب کچھ لٹ چکا ہے ـــــ سبھی کچھ۔ لے دے کے ایک زہراں رہ گئی تھی جو فرزند کے بہانے حالات کی بھینٹ چڑھ گئی۔

ـــــ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر قدرت نے شیرو کو روحانی عذاب کے ایک طویل سلسلے سے نکالنے کے لیے چن ہی لیا تھا تو وہ اس کھیل کا مہرہ کیوں بنا؟

وہ سوچ رہا تھا کہ خود میں اتنی ہمت کیسے لائے کہ اسے کچھ بتا سکے اور شیرو حیرت زدہ سا اس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ دونوں قدرے محفوظ ایک گوشے میں آن کر ٹھہر گئے۔ یہاں مجاہدین کی ایک عارضی قیام گاہ شیرو کو درختوں کے جھنڈ میں بنی جھونپڑی کی شکل میں

نظر آ رہی تھی جو اس وقت بالکل خالی تھی۔ بس ایک کونے میں ایک لالٹین اور مٹی کا بالٹ سے بھرا ہوا کنستر رکھا تھا اور دوسرے کونے میں زمین پر گھاس پھونس سے بنی ایک چٹائی بچھی تھی۔

"بیٹھ جاؤ شیرو!"

وہ خود شیرو کے سامنے چٹائی پر بیٹھ گیا اور اپنی تمام تر قوتیں مجتمع کر کے اس نے شیرو کو ایک ایک کر کے ان تمام واقعات سے آگاہ کر دیا۔ اسے امید تھی کہ شیرو یہ سب کچھ سن کر دھاڑیں مار مار کر روئے گا اور بالآخر پاگل ہو جائے گا' لیکن وہ حیران رہ گیا کہ صبر و ضبط کا مجسمہ اس کے سامنے پتھر کے بت کی طرح خاموش بیٹھا رہا۔

—— آنسوؤں پر تو اس کا اختیار نہیں تھا' لیکن اس نے کمال ہمت سے اپنے اندر ہی اندر اٹھنے والی سسکیوں اور آہوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

"میں تمہارا مجرم ہوں شیرو بھائی۔" اس نے رندھے ہوئے گلے سے شیرو کو مخاطب کیا۔

"نہیں فرزند! قدرت کو شاید یہی منظور تھا کہ میں ماں اور چچا کے بعد اپنی مکیتر کو بھی نہ پا سکوں۔ تم بھی بچے تھے فرزند۔ واقعی وہاں سے کسی کے بچ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ قدرت کو شاید اسی طرح زہراں کی بہتری منظور تھی' پھر شرفو کوئی غیر تو نہیں' آخر میرا دوست ہے —— میرا بھائی!" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے لیے اپنے آنسو ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"شیرو بخدا! تم انسان نہیں۔ دنیا کے کسی انسان میں اتنا حوصلہ نہیں ہو سکتا۔ میں ان پہاڑوں کے حوصلے پر حیران ہوا کرتا تھا کہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں پر ہونے والے ایسے مظالم کو یہ صدیوں سے دیکھتے آ رہے ہیں اور ان کا سینہ شق نہیں ہوتا لیکن تم..... تم تو ان سے بھی بازی لے گئے شیرو۔" وہ سسک پڑا۔

شیرو نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے اپنے کندھے پر رکھی چادر سے اپنے آنسو پونچھے اور جب دوبارہ منہ پھیرا تو فرزند بھی خود پر قابو پا چکا تھا۔

دونوں کو اندر گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ دونوں جھونپڑی سے باہر آئے۔ ان کے سروں پر بوڑھا اور سرد آسمان اپنے دامن میں ٹھٹھرے ہوئے ستاروں کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ دور میدان راتوں کے بیمار چاند کی زرد کرنیں کپکپاتی ہوئی کشمیر کی منجمد فضاؤں سے ٹھوکریں کھا رہی تھیں۔

دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ بالآخر شیرو نے ہی ہمت کر کے

بات کی۔ "فرزند! وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ ہمیں خیال سے صبح ہونے والی ہے۔ جانے سے کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہیں۔ تم مجھ پر ایک آخری احسان کرو۔"

"کہیے شیرو بھائی!" فرزند نے اپنے گلے میں اٹکے غبار کو نگلتے ہوئے کمال ضبط سے کہا۔

"دیکھو فرزند! شیرو نے اپنے گلے میں اٹکے غبار کو نگلتے ہوئے کمال ضبط سے کہا۔ ہمارے سوا اور کسی کو میری یہاں موجودگی میں آمد کی خبر نہیں۔ میں ابھی یہاں سے واپس چلا جاؤں گا۔ تم بھی یہی سمجھنا کہ تم نے مجھے دیکھا ہی نہیں —— بس یہی جاننا کہ شیرو واقعی مر چکا ہے۔"

"شیرو ——!" فرزند نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں فرزند بھائی! اب مجھ میں زندہ رہنے والی بات بھی آخر کیا رہ گئی ہے۔ میرا اب رہا ہی کیا ہے اس دنیا میں۔ بس ایک اپنی جان ہے۔ وہ تو میں نے کبھی کی کشمیر کے لیے وقف کر دی تھی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اگر اب شرفو یا زہراں کو میرے زندہ ہونے کی اطلاع مل گئی تو ان کے دلوں پر کیا گزرے گی؟"

"شیرو خدا کے لیے مجھے کسی اور امتحان میں نہ ڈالو۔ میں تو پہلے ہی اپنے ضمیر کے ہاتھوں جانے کتنی سزا ساری عمر کے لیے بھگتتا رہوں گا۔ اوہ میرے خدایا! مجھ سے بڑا ظلم ہو گیا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو رہا۔

میں یہ کیا ظلم ہو گیا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو رہا۔

"فرزند!" شیرو نے بڑے تحمل سے کہا۔ "اگر تم نے حقائق کا سامنا نہ کیا اور کسی جذباتی پن کا شکار ہو گئے تو تم ان دونوں کی زندگیوں میں زہر گھول دو گے۔ اگر ان کا نکاح نہ ہو گیا ہوتا تو میں اڑ کر پاکستان پہنچ جاتا لیکن اب..... اب یہ ظلم ہو گیا۔ ان دونوں معصوموں نے آخر کیا گناہ کیا ہے؟ اور پھر قدرت نے اگر کسی بہانے زہراں کو خوشی کے چند لمحات دے ہی دیئے ہیں تو ہمیں کیا حق حاصل ہے اس سے یہ خوشیاں چھیننے کا اور یوں بھی فرزند —— میرے بھائی! تم بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ بخدا مجھے اس بات کا قطعاً کوئی گلہ نہیں۔ شرفو سے بہتر خاوند زہراں کو اس روئے زمین پر شاید کوئی اور نہ مل سکے۔ وہ..... وہ اسے سب کچھ دے سکتا ہے —— سب کچھ۔"

فرزند نے سر جھکا لیا۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں رہ گئی تھی کہ صبر و وفا کے اس پتلے سے آنکھیں ملا کر بات ہی کر سکے۔ اس نے بادل نخواستہ شیرو کی اس بات پر صاد کیا کہ وہ اس کی زندگی کے راز کو راز ہی رہنے دے گا۔

وہ شیرو کو پھونکنے کے لیے پہاڑی سلسلے کے آخری کونے تک آیا۔ دونوں بہت جذباتی انداز میں بغل گیر ہوئے اور دم رخصت کو فرزند کے آنسو بے اختیار اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔ لیکن شیرو نے انتہائی صبر سے خود کو نارمل رکھا۔

چاند کی دم توڑتی روشنی میں جب وہ انجانی منزل کے مسافر کو رخصت کر رہا تھا تو نجانے فرزند کو کیوں اپنی یہ ساری جدوجہد بے سود نظر آ رہی تھی۔ کوئی طاقت، کوئی بھروسہ، کوئی ہستی اس کے ہاتھوں میں بار بار سرگوشی کر رہی تھی کہ ——— اب وہ پرچھ کو کبھی دشمن کے چنگل سے رہائی نہیں دلا سکیں گے۔

———بھاری قدموں اور بوجھل دل کے ساتھ وہ واپس ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت دیر تک اندھیرے کی اس چادر میں کھوئے ہوئے شیرو کو ڈھونڈتی رہی تھیں جو اس کے سامنے انسانی عظمتوں کے نئے باب کھول کر اس سے رخصت ہو گیا تھا۔

☆○☆

شیرو جب اس مقام تک پہنچا جہاں فرزند نے اس کی ماں کی قبر کی نشاندہی کی تھی تو اسے اچانک اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ اب تک اس کے اندر پیدا ہونے والی جس قوت نے اسے حوصلہ دے کر مکمل مرد بنائے رکھا تھا، وہ جیسے اس کے جسم سے یک دم باہر نکل گئی۔ اور جب تک پتھروں کے اس ڈھیر تک پہنچا جسے مٹی کے اوپر کسی نے قبر کی طرح چنا ہوا تھا تو وہ ایک معصوم بچے کا مکمل روپ دھار چکا تھا۔

بے اختیار وہ پہلے قبر کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ آگے کی سمت پھیلے اور وہ قبر سے لپٹ کر بچوں ہی کی طرح سسکیاں لینے لگا۔

———ضبط کے تمام بندھن کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ چکے تھے۔

———روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی، پھر آہستہ آہستہ جیسے اسے صبر آ گیا۔ اس کے اندر اٹھنے والے طوفان نے آنکھوں کے راستے نکاس کی راہ ڈھونڈ کر اسے بڑے لمبے کرب سے نجات دلا دی تھی۔ وہ پھانس جو فرزند سے ملاقات کے بعد سے اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی تھی، اب نکل چکی تھی۔ اسے اپنا وجود خاصا ہلکا محسوس ہونے لگا تھا۔

اس کے عقب میں سورج کی نکھرتی ہوئی کپکپاتی کرنوں نے ڈرتے ڈرتے پونچھ کے پہاڑوں اور مزید ہزاروں کو بوسے دینے شروع کر دیئے تھے۔ شاید وہ ان سربلندوں کو اس طرح عقیدت پیش کر رہی تھیں جنہوں نے اپنا تن، من، دھن سبھی کچھ کشمیر کی آزادی

۔۔ ۔ ۔

بھارتی فوج سے ٹکرانے کا خطرہ ناگزیر حالات ہی میں مول لیں اور صرف دفاع ہی پر اکتفا کریں۔

اپریل کے آخر ہی میں کوہاٹ چھاؤنی میں موجود جنرل طارق کو حکم ملا کہ وہ راولپنڈی پہنچے جہاں سے مئی کے وسط میں ڈویژن کمانڈر نے ان کے بریگیڈ کا کچھ حصہ جنرل ہی کی کمانڈ میں محاذ کی طرف بھیج دیا۔

بھارتی فوج کا مرکزی ہیڈکوارٹر اب سری نگر بن چکا تھا اور ان کے ذیلی ہیڈکوارٹروں کی پوزیشنیں دیکھ کر جنرل طارق نے اندازہ لگایا تھا کہ دشمن کا بڑا حملہ بارہ مولا اوڑی روڈ کی طرف مظفر آباد کی سمت ان کے سیکٹر پر ہو گا۔

——دشمن کے ممکنہ حملے والی جگہ اوڑی کے سامنے سڑک کے دونوں اطراف جنرل طارق نے ایک بٹالین پاک فوج' کچھ دستے فرنٹیئر فورس کے' کچھ اسکاؤٹ جن کی تعداد بمشکل ایک سو تھی اور آزاد کشمیر کے کچھ دستے لگا دیئے۔ یہ باقاعدہ بٹالین نہیں تھی بلکہ رضاکارانہ طور پر جنگ میں حصہ لینے والے بلا تنخواہ فوجیوں پر مشتمل تھی جن کے پاس ہلکا اسلحہ اور رائفلیں تھیں۔

شمال کی طرف نیڑال سے آگے کرشن گنگا وادی بھی اسی سیکٹر کا حصہ شمار ہوتی تھی جسے پہاڑی سلسلے نے کاٹ کر بالکل الگ کر رکھا تھا جہاں ایک کمپنی پاکستانی باقاعدہ افواج کی رکھی گئی تھی۔ اس سے کچھ پیچھے جنرل طارق کے بریگیڈ کی تین کمپنیاں مظفر آباد' کوہالہ اور بارہ میں پوزیشن لیے بیٹھی تھیں جن سے صرف مقامی دفاع مقصود تھا۔ ان کے ایڈوانس کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

——بریگیڈ کی آدھی بٹالین مری میں' باقی پونچھ کے بالمقابل مورچہ بند تھی جس کی کمان جنرل کے پاس نہیں تھی اسے بریگیڈ ہیڈکوارٹر مری میں رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔

جنرل طارق کی جہاندیدہ نگاہوں نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ اوڑی کے بالمقابل ان کی نظری دشمن کا حملہ روکنے کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ جنرل نے تجویز پیش کی کہ بجائے رک کر دشمن کا حملہ روکنے کے پیش قدمی کرتے ہوئے دشمن پر پہلوؤں سے گھاتیں لگائی جائیں۔ اس طرح وہ پریشان ہو کر سڑک سے ہٹ کر بکھر کر چلے گا۔ جنرل کی تجویز منظور ہو گئی اور اس نے توپخانوں نے قریباً پچاس میل لمبی سڑک کو کوہالہ سے بارہ کے خاتمے تک مقامی [illegible] کی مدد سے آمدورفت کے قابل بنا دیا۔

[illegible] جنرل کو حکم ملا کہ بریگیڈ کی کمان کسی اور کے حوالے کر کے نیڑال کے راستے

نیلی پہاڑی ملاقے کی طرف اڑ جائے۔ جہاں جنرل کو پانچ ہزار قبائلیوں کے ساتھ سری نگر کی سمت آگے بڑھ کر شب خون مارنے تھے۔

——اس کارروائی کا مقصد یہی تھا کہ دشمن کی توجہ مظفر آباد سے ہٹا کر شمال کی طرف کر دی جائے۔ اس طرح اس کی لڑی بٹ جائے گی اور حملے کی قوت میں بھی کمی آ جائے گی۔ قبائلیوں کو جمع کرنے میں کم از کم پندرہ دن لگتے۔ بس کے بعد نیڑال سے آگے پہاڑیوں میں جنرل کو اختیار تھا۔ یہ تجویز تو اچھی تھی لیکن وہ سے عمل میں آئی تھی۔ ۲۱ مئی کو جنرل نے رپورٹ دی کہ قبائلیوں کی آمد تک اتنیں اس "نازک محاذ" پر رہنے دیا جائے کیونکہ دشمن کسی بھی وقت حملہ کر سکتا ہے اور ایسا ہی ہوا۔ اس رپورٹ کی روانگی کے بمشکل ایک گھنٹہ بعد بھارتی فوج نے زبردست حملہ کر دیا۔ دشمن نے اپنے حملے کا زور دریائے جہلم کے دونوں پہلوؤں اور شمال میں نیڑال کی سمت رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جنرل طارق کو یہ پریشان کن اطلاعات بھی ملنے لگیں کہ ہمارے ہراول دستے منظم انداز میں پسپائی اختیار کر رہے ہیں' لیکن بعض مقامات پر دشمن کو زبردست زک اٹھانی پڑی تھی۔ جہاں تک نیڑال کے شمالی علاقے کا تعلق تھا' جنرل کے لیے وہاں کچھ بھی کرنا ممکن نہیں تھا۔ موجودہ کمپنی کو پیچھے ہٹ آنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سڑک کے کناروں والے محاذ کو مضبوط کرنے کے لیے جنرل نے مری میں موجود کمپنی کو اس طرف روانہ کر دیا۔ اسے امید تھی کہ اگر ان لوگوں کو پسپا بھی ہونا پڑا تو وہ چکوٹھی میں آ کر دفاعی پوزیشن اختیار کر لیں گے جہاں دشمن کو روکنے کا کام زیادہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔

۲۰ مئی کی شام بٹالین کمانڈر کا پیغام ملا کہ اس کے دستے دشمن کی ہلکی توپوں کی شدید گولہ باری اور فضائیہ کے حملوں کی زد میں ہیں اور وہ لوگ مسلسل پسپا ہو رہے ہیں۔ دشمن اوڑی اور چکوٹھی کے درمیان پہنچ چکا ہے۔

یہاں آزاد کشمیر کے دستوں پر حملہ ہوا اور وہ بھاگ اٹھے۔ اب ایک وسیع و عریض علاقے کی حفاظت کی ذمہ داری پاکستانی فوج کی مختصر سی جمعیت کے کندھوں پر آ پڑی تھی۔ جنرل نے بریگیڈ ہیڈکوارٹر سے نکل کر محاذ پر پہنچنے کا فیصلہ کر لیا اور اسی شام وہ اپنے دو اسٹاف افسروں کی معیت میں مظفر آباد پہنچ گیا جہاں شہریوں کے بھاگتے ہوئے تانگوں کے پیچھے پیچھے فرنٹیئر سکاؤٹس کی دو پلاٹون بھی سر پر پاؤں رکھے بھاگے چلی آ رہی تھیں۔ جنرل نے ان لوگوں کو روک لیا تھا۔ وہ محاذ پر واپس جانے سے انکاری تھے۔ پٹھانوں نے رائفلوں کی زد میں ان سے اسلحہ رکھوا لیا۔ جنرل کے حکم پر ان کے دو افسروں کو حراست میں لے لیا

کیا۔ اس کے ساتھ ہی جنرل کے ساتھیوں نے ان کی لاشوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ دونوں افسروں کو جنرل کے حکم پر رات میں لے کر ہیڈ پر پہنچایا گیا۔ چکوٹھی پہنچ کر جنرل کو اطمینان ہو گیا کہ یہاں موجود پاک فوج کے بریگیڈ کمانڈر' افسروں اور جوانوں کا مورال بہت بلند تھا اور وہ واقعی دشمن کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن چکے تھے۔

وہ کمپنی جسے جنرل نے دریا پار جانے کا حکم دیا تھا' اسی خدشے کے پیش نظر دریا کے کنارے کھڑی رہی کہ دشمن دوسری طرف آ چکا ہے۔ جنرل کے ساتھیوں نے ریکی کر کے اس خدشے کو غلط قرار دیا اور اس کی خصوصی نگرانی میں اس کمپنی کو دریا پار پہنچا کر مورچہ بند کیا گیا۔ جنرل طارق خود بھی چکوٹھی پہنچا جسے اب دفاعی قلعے میں تبدیل کرنے کا پروگرام طے پا چکا تھا۔ اس کا بریگیڈ انٹیلی جنس آفیسر اس دوران آزاد کشمیر کے جی۔ایچ۔کیو سے خاصی معلومات فراہم کر چکا تھا۔

☆○☆

اندلو و شمار نے جنرل کو آگاہی دی کہ اس علاقے میں موجود دشمن کی نفری ۱۲ پلٹنوں پر مشتمل ہے جن کے پاس ۱۲ بھاری مشین گنیں' ۲۴ توپیں' ۱۲ نیٹک شکن توپیں اور ۹ بکتر بند گاڑیاں ہیں جب کہ ان کی ایئر فورس اپنی تمام تر قوت کے ساتھ ان کے سروں پر موجود ہے۔ اس فوج کو روکنے کے لیے جنرل طارق کے پاس اس علاقے میں ساڑھے تین پلٹنیں اور صرف ۴ بھاری مشین گنیں تھیں۔

ان حالات میں مختصر جمعیت کے ساتھ دشمن کے منہ لگنا جوانوں کو حرام موت مارنے کے مترادف ہوتا۔ اگر جنرل دفاعی پوزیشن بھی اختیار کرتا تو بھی غنیم اپنی طاقت کے بل پر ان کی پوزیشنوں کو جلد یا بدیر روند کر آگے نکل جاتا۔ لہٰذا اس نے اپنی جنگی حکمت عملی بدلی اور طے پایا کہ دشمن کے پہلوؤں کو پہاڑی کے اندر دور تک حملے کر کے اس طرح بکھیر دیا جائے کہ اسے اپنی قوت ایک جگہ مرکوز کرنے کے مواقع میسر نہ آئیں۔

بھارتی فوج پر پٹھانوں کی دہشت طاری تھی اور جنرل جانتا تھا کہ دشمن قبائلیوں کے حملوں سے اپنی عین فورس کو بچانے کے لیے پہلوؤں کو پھیلا دے گا۔ ابھی تک زیادہ تعداد میں قبائلی پٹھان جنرل کو میسر نہیں تھے' اس لیے اس نے پٹھانوں کا کام بھی پاکستانی فوج کے جوانوں سے ہی لیا تھا۔

جس نے ایک بٹالین کو دریا کے کنارے چکوٹھی پر رکھا اور دوسری کو دریا کے پار "ب" ڈویژن کی چوکی کے بائیں طرف بلند پہاڑی پر پہنچا دیا۔ اس کے ساتھ ہی قبائلیوں اور پاک فوج کے

جوانوں کے ملے جلے دستے ترتیب دے کر دشمن کے پہلوؤں پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کر دیئے۔

اس سے یہ فائدہ تو کم از کم شروع میں حاصل ہوا کہ دشمن کے پہلوؤں پر حملوں کی خبر سنتے ہی دشمن کی فائر پاور اور اس کی ٹینک شکن توپوں کا رخ ادھر ہو گیا۔ لیکن اس کی بکتر بند گاڑیاں آہستہ آہستہ چکوٹھی اور "ب" ڈویژن کی طرف پیچھے ہٹنے لگیں۔ مقابلہ ہمارے لیے مشکل ہوتا گیا۔ مئی کے آخر تک دشمن انہیں دھکیلتا ہوا خاصی دور تک لے آیا تھا اور اب وہ ان کے سامنے تازہ حملے کے لیے پر تول رہا تھا۔

——اسی اثناء میں چکوٹھی کے محاذ کا پیمانہ مار پارٹیوں' دشمن کو ہلکی سی ٹکر دے کر پیچھے چلی گئیں اور وہ ان کے تعاقب میں بے مقصد پہاڑیوں پر دور تک نکل جاتا۔ صورت حال خاصی اطمینان بخش تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ دشمن ہمارے پہلوؤں پر دور تک نکل جانے کی کوشش کرتا' چپکے سے' لیکن ہر دفعہ منہ کی کھائی اور پیچھے ہٹ گیا۔

اب دوری پر جنرل نے اپنے دستوں کو چکوٹھی اس طرح ترتیب دیا تھا کہ دشمن نے اس طرف سے کھلا حملہ کرنے کی جرات ہی نہ کی۔

کافی عرصے تک ان کے درمیان آنکھ مچولی جاری رہی۔

——اس دوران جنرل کے برق رفتار دستے دشمن پر قہر بن کر ٹوٹتے رہے۔ انہوں نے اسے مختلف پہلوؤں سے اس قدر نقصان پہنچایا کہ دشمن کا مرکز کمزور ہوتے ہوتے بالآخر بکھر کر رہ گیا اور وہ ایڈوانس کرنے کے بجائے رک کر اپنی نفری کو ایک مرکز پر سمیٹنے لگا۔

شمالی محاذ پر دشمن نے ٹیتوال سیکٹر میں چار پلٹنوں کے ایک بریگیڈ سے پیش قدمی کی۔ اس علاقے کی کمان بریگیڈیئر افتخار احمد کو سونپی گئی تھی جو کافی عرصے تک صرف ایک رائفل بردار کمپنی کے ساتھ دشمن کے لیے باعث عذاب بنے رہے۔

اس دوران جنرل طارق کے بریگیڈ کو مزید ایک پلٹن اور ۲ فیلڈ گنوں کی کمک پہنچ گئی۔ جون کے آخر تک دشمن اپنے قریباً" بارہ سو جوان ہلاک اور زخمی کروا کر اپنے زخم چاٹنے پر مجبور ہو چکا تھا۔

ڈی۔پی مینن اپنی کتاب Integration of Indian State میں لکھتا ہے:

"آٹھ صدیوں سے محمود غزنوی کے دور سے ہندوستان شمال مغرب کی سمت سے مسلسل حملوں کی زد میں رہا ہے۔ اکیلے محمود غزنوی نے ۱۷ حملے کیے۔ اب مملکت پاکستان کے وجود میں آنے کے محض دس ہفتے بعد ہم پر شمال مغرب سے قبائلی حملہ کروا دیا گیا۔

جب میں نے بھارت سے کشمیر کے الحاق کی سفارش کی تو میرے ذہن نشین یہی خدشہ تھا کہ تاریخ کہیں خود کو دہرانے نہ لگے اور یہ طوفان ایک مرتبہ پھر سری نگر کو روندتا ہوا بھارت میں داخل ہو جائے۔ آج سری نگر تو کل دہلی کی باری بھی آ سکتی ہے۔ ہر قوم اپنی تاریخ اور دیومالا بھول جائے' چلتی ہے اس کا مقدر بن جاتی ہے۔"

مینن نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے' وہ بنیاد تھے اس جنگی حکمت عملی کے جو بھارتی فوج نے کشمیر میں اپنائی۔ وہ لوگ قبائلیوں سے اتنے خوفزدہ تھے کہ انہیں کشمیر ہی میں روک دینا چاہتے تھے تاکہ یہ سیلاب اپنا رخ بدل کر کہیں سارے بھارت ہی کو نہ نگل جائے۔

اوڑی محاذ سے آگے بھارتی فوج اپنی طاقت کے بل بوتے پر مزید آگے بڑھ سکتی تھی' لیکن وہ جانتی تھی کہ اس سے آگے کا علاقہ قبائلیوں کی بہترین شکار گاہ تھا۔ وہ اب قبائلیوں کی بھینٹ چڑھنے پر تیار نہ تھے۔

☆○☆

بھارتی افواج کے زوردار حملوں کا دم خم تو ٹوٹ چکا تھا' لیکن ابھی اوڑی کا محاذ خاموش نہیں ہوا تھا۔ وہاں جنگ مسلسل ہو رہی تھی۔ خصوصاً" ایئر فورس کے جہازوں نے تو تباہی کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ وہ سورج کی روشنی پھیلتے ہی اپنے حملوں کا آغاز کر دیتے اور شام ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔

ایک روز جنرل طارق کو حکم ملا کہ آگے بڑھ کر پانڈو کی پہاڑی پر قبضہ کر لیں۔

"پانڈو" نو ہزار فٹ بلند ایک پہاڑی تھی جو اپنے دامن میں بسے گاؤں کے نام کی نسبت سے جانی جاتی تھی۔ جنرل کے زیر قبضہ بب ڈوری کی پہاڑی کے بالکل سامنے یہ سلسلہ ہائے کوہ نظر آتا تھا جس کے دائیں جانب تین ہزار فٹ نیچے دریائے جہلم بہہ رہا تھا اور دریا کے پار نظر آنے والی سڑک پہاڑوں کے مختلف پہلوؤں کو کاٹتی ہوئی گزرتی تھی۔ اس سے تھوڑا آگے آٹھ ہزار فٹ بلند ایک اور پہاڑی سلسلہ تھا۔

بب ڈوری کی بائیں طرف واقع "تانگائیک" قریباً" دس ہزار فٹ بلند اور بب ڈوری کے بائیں اوپر جھکا ہوا نظر آتا تھا۔ اس سے آگے "روسی کوتا" ساڑھے گیارہ ہزار فٹ بلند اور اس کے سامنے دس ہزار فٹ کی اونچائی پر "بلند سنگ" تھا۔ اس طرح دریا کے متوازی یہ سلسلہ ہائے کوہ پھیلتا چلا گیا تھا جس کے دامن میں "پانڈو" واقع تھا۔

اسی پانڈو پہاڑی کی ایک ڈھلان پر نیم کے پہاڑی توپ خانے کا ایک سیکشن دریا کے ... پر مورچہ بند تھا جس نے پچھلے قریباً" ایک مہینے سے چکوٹھی اور اس کے

سڑک کی پانچ میل لمبائی کو مسلسل اپنی زد میں لیا ہوا تھا۔ انہوں نے پانچ میل علاقے کے چپے چپے کو "مارک" کیا ہوا تھا اور وہاں اس تواتر سے گولہ باری کر رہے تھے کہ اس علاقے سے کسی پاکستانی جوان کے لیے سر اٹھانا بھی مشکل تھا۔

چونکہ یہ سیکشن بلندی پر مورچہ زن تھا اس لیے اس کی نگاہوں سے رات کے اندھیرے میں بھی بچ نکلنا مشکل تھا۔ ذرا سا غلط ہوتے ہی وہ لوگ "روشنی راونڈ" داغ رہے تھے اور اس روشنی میں نقل و حرکت کرتی کسی بھی شے پر گولوں کا مینہ برسا رہے تھے۔ اس کمپنی کو ختم کرنے کے لیے ان پر اٹیک کرنا ناممکن تھا۔ نہ تو ان پر پیادوں سے حملہ ہو سکتا تھا۔ صرف ایک ہی صورت تھی کہ کسی بھی طرح پانڈو پہاڑی پر قبضہ کر لیا جائے جس کے بعد ہی یہ سیکشن ہمارے قابو آ سکتا تھا۔

پانڈو پر قبضہ کرنے کے لیے "بب اوری" سے اڑھائی ہزار فٹ بلندی تک چڑھنا پڑتا تھا جہاں سے دریا کا کنارہ شروع ہوتا تھا۔ اس علاقے میں ہیلی کاپٹر اور پیراٹروپر تو کارآمد تھے لیکن چٹانیں اور برساتی نالے بڑی اچھی اوٹ فراہم کرتے تھے۔ بب اوری کے سامنے وادی سیدھی پہاڑی سے ذرا دور تین بلند چوٹیاں حملہ آوروں کا راستہ روکنے کے لیے سینہ تانے کھڑی تھیں جن کی بلندی چھ ہزار فٹ سے سات ہزار فٹ تک تھی اور یہ چوٹیاں درختوں سے بڑے شاندار طریقے سے قدرت نے "کیموفلاج" کر رکھی تھیں۔

بائیں طرف ایک چوٹی سے قریباً" ڈیڑھ دو میل لمبا ایک راستہ پانڈو تک جاتا تھا' لیکن یہ راستہ گھنے درختوں سے گھرا ہوا' انتہائی دشوار گزار اور ناقابل عبور تھا۔ اس راستے سے ایڈوانس کرنا بے حد مشکل تھا کیونکہ دشمن نے اردگرد کے تمام درختوں میں توپیں نصب کی ہوئی تھیں اور اس کی محفوظ اور مضبوط مورچہ بندیاں اس راستے سے اونچائی پر اسے گھیرے میں لیے ہوئے تھیں۔

ان حالات میں تمام جنگی فوائد بھارتیوں کو حاصل تھے کیونکہ ان کی ہر پوزیشن پر صرف سامنے سے اور وہ بھی ان سے انتہائی کم بلندی سے حملہ کیا جا سکتا تھا جو موت سے کھیلنے کے مترادف تھا۔

یہ اس قدر مضبوط مورچہ تھا کہ ہماری فوج نے اسے خفیہ طور پر "دہلی" کا نام دے رکھا تھا۔ گویا پانڈو کی تسخیر دہلی کی فتح سے ہرگز کم نہ تھی جب کہ بھارتی فوج نے اپنی ان مورچہ بندیوں کو "کراچی" کا کوڈ نام دے رکھا تھا۔

دشمن کی نفری یہاں پاکستانی افواج کے مقابلے میں کم از کم سات گنا زیادہ تھی۔ جنرل

طارق نے اندازہ کر لیا تھا کہ فتح کا دارومدار کسی ایسی چال چلنے پر ہے کہ دشمن اپنی تمام فوج کو ان کے مقابلے میں اس جگہ نہ لا سکے۔ چنانچہ کافی سوچ بچار اور ریکی کے بعد بالآخر ایک ایسا مقام چن ہی لیا اور وہ تھا پانڈو کا گاؤں —— یہ گاؤں ایک طرح سے اس علاقے میں مورچہ بند فوج کے ہیڈکوارٹر کی حیثیت رکھتا تھا۔

چکوٹھی اور بب ڈوری میں جنرل نے ایسی پوزیشن میں اپنے جوانوں کو مورچہ بند کیا تھا کہ ان پر ایک ایک حملہ ہی ممکن تھا اور ایک بٹالین کے لیے کم از کم ایک بریگیڈ کو حملہ کرنا پڑتا۔ دو بریگیڈ سے کم اس علاقے میں جنرل کی اختیار کردہ پوزیشنوں پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس دوران جنرل نے انتہائی ہوشیاری اور جنگی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے ایسی چالیں چلیں کہ دشمن کو بوکھلا کر رکھ دیا۔

اس نے پٹھانوں کی مدد سے دشمن کے پہلوؤں پر مسلسل نقب لگائے رکھی اور اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی پوزیشنوں کو پھیلاتا چلا جائے۔ دشمن نے اپنی پھیلی ہوئی ہر پوزیشن پر کم از کم دو کمپنیاں لگا دی تھیں' جن کے درمیان فاصلہ تھا اور پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ ایک دوسرے کی مدد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔

☆○☆

پانڈو چوکیوں میں دشمن کی ایک بٹالین فوج تھی۔ جس پر حملہ کرنے کے لیے جنگی اصولوں کے مطابق کم از کم تین بٹالین فوج درکار تھی جب کہ جنرل کے پاس حملہ کرنے کے لیے بہ مشکل آدھی بٹالین تھی جسے بالآخر پٹھانوں اور کشمیری مجاہدین کی مدد سے ایک بٹالین تک پہنچا دیا گیا۔

——اور اس ایک بٹالین نے اپنے سامنے موجود سات ہزار فٹ بلند تہہ در تہہ پہاڑی سلسلے کو عبور کر کے پانڈو تک پہنچنا تھا جب کہ ان کے راستے میں دو بھارتی کمپنیاں' جن کی مدد کے لیے توپ خانے کی بیٹریاں موجود تھیں' مورچہ بند تھیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگر پاک فوج کا تصادم ان کمپنیوں سے ہو جاتا تو حملہ آور فوج کا کافی حصہ یقیناً یہیں ختم ہو جاتا اور پانڈو پر حملہ کرنے کی قوت بمشکل ایک چوتھائی ہی رہ جاتی۔

جنرل طارق کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ کوئی ایسا راستہ مل جائے جس سے گزر کر وہ رات میں کوئی جھڑپ مول لیے بغیر پانڈو تک پہنچ جائیں۔

جنرل طارق نے چند قبائلی سرفروشوں کو "ریکی" کے لیے بھیجا اور بالآخر وہ لوگ ایک

ایسا راستہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے جس سے گزر کر وہ پانڈو گاؤں سے مشرق کی سمت سات میل کے فاصلے سے گزرتے ہوئے چھ ہزار فٹ بلند پہاڑی عبور کر سکتے تھے۔

——اس دوران وہ اتنا تھک جاتے کہ ان کے لیے فوراً حملہ کرنے سے پہلے دو چار گھنٹے آرام کرنا بے حد ضروری تھا۔

یہ آپریشن ۳۶ گھنٹوں پر محیط تھا اور ان لوگوں کو ایک رات اور اگلا سارا دن دشمن کے بالکل سامنے اور اس کے اگلے مورچوں کے عقب میں اس کی نظروں سے بہر صورت اوجھل رہنا تھا۔ ذرا سا شک گزرنے پر دشمن ان لوگوں کو ہوائی طیاروں کے ذریعے ان کے سر پر سے ہٹ کر بے بس اور مجبوس پرندوں کی طرح گھیر کر مار سکتا تھا۔

ان تمام خطرات کے باوجود جنرل نے اپنی سی کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا—— دو ہزار قلیوں کی مدد سے جنرل اپنا توپ خانہ ہارگٹ کے بالکل سامنے لے آیا۔ ان لوگوں نے دریا کے آر پار لوہے کا مضبوط رسہ باندھ لیا جس کی مدد سے بیک وقت دو آدمی اور تین سو پونڈ وزن لایا اور لے جایا جا سکتا تھا۔

پٹھانوں کے تین لشکر جن میں سے ہر ایک کی نفری سو پر مشتمل تھی' ترتیب دیئے گئے۔ ان میں سے دو کے ذمے دشمن پر مسلسل حملے کرنا اور تیسرے کے ذمے بھاگتے دشمن کا تعاقب کرنا تھا۔

۱۷ جولائی ۱۹۴۸ء کو غازیان صف شکن اپنے سروں سے کفن باندھے تقسیم پر تیار کر رہے تھے۔

——اگلے روز عبداللہ کے سپاہی ندی عبور کر کے دشمن کے علاقے میں دور اندر تک گھس گئے۔ آسمان نے ان کی عظمتوں کو سرجھکا کر اور ان کی مدد کے لیے گھنگھور گھٹائیں برسنے لگیں جس سے ان کی آواز دشمن تک نہ پہنچ سکی۔ یہ بٹالین ایڈوانس کرتی ہوئی راستے میں بڑی کامیابی سے ٹیلی فون کے تار بچھاتی چلی جا رہی تھی۔

بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں ان کا کمانڈر ان سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ رات گئے بٹالین کوئی جھڑپ مول لیے بغیر دشمن کے اگلے مورچوں کے عقب میں ایک میل اندر ایڈوانس کر گئی۔ صبح ہونے لگی تھی۔ وہ لوگ منصوبے کے مطابق روپوش ہو گئے اور اب انہیں اگلی رات کا منتظر ہونا تھا۔

☆○☆

دشمن کا خیال اپنی طرف مرکوز رکھنے کے لیے قبائلی پٹھان اور کشمیری مجاہدین اس کے بلندیوں سے پے در پے مسلسل کاری ضربیں لگا رہے تھے جب کہ جنرل نے اپنا توپ خانہ بالکل خاموش رکھا ہوا تھا تاکہ دشمن کو کسی بڑے حملے کا گمان نہ گزرے۔

اگلی رات پھر حملہ آور فوج کا مطمئن سفر جاری رہا' سوائے ایک واقعے کے ——— وہ یہ کہ ان کا ایک کشمیری مجاہد جو گائیڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا' دشمن کی گشتی پارٹی کے ہتھے چڑھ گیا۔

دشمن اس جوان مرد کو اپنے ہیڈ کوارٹر میں لے گئے۔ اس پر انہوں نے جہاں بھر کے ستم توڑے کہ کسی طرح وہ یہاں موجود کسی "غیر معمولی کارروائی" کا اقرار کر لے' لیکن آفرین ہے اس مرد غازی پر کہ دشمن اس کے لب نہ کھلوا سکا۔ الا یہ کہ وہ مرتبہ شہادت سے سرفراز ہو گیا۔

یہ رات بھی بخیر و عافیت گزر گئی۔

حملہ آور بٹالین یہاں سے دو کالموں میں بٹ گئی۔ ان دونوں کالموں کو اب مزید پانچ ہزار فٹ بلند ایک پہاڑی سلسلہ عبور کرنا تھا ——— یہ پہاڑیاں نوکیلی تھیں جن کی چٹانیں عمودی اور راستہ ناہموار تھا۔ بارش نے جگہ جگہ پھسلن پیدا کر دی تھی اور جہاں اب پاؤں بمشکل زمین پر ٹکتا تھا۔

بہرحال اگلے روز جنرل کو خوش خبری ملی کہ دائیں کالم نے پانچ میں نو ہزار تین سو فٹ بلند ایک چوٹی پر قبضہ جما لیا ہے۔ یہ چوٹی پانچ کے بالکل سر پر کھڑی تھی۔ دشمن کو جب خبر ہوئی تو اس نے بلٹ میں حملہ کیا' لیکن اب میدان اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس اثنا میں دوسرا کالم پانچ سے قریباً پانچ سو گز دور پہنچ چکا تھا۔ اس کالم کو خلاف توقع بہت زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اچانک دشمن کی ایک پارٹی کی زد میں آ گیا' جو پیچھے جا رہی تھی۔

بارہ بجے دشمن نے اس تھکی ہاری فوج پر جس کا رابطہ بھی ہیڈ کوارٹر سے کٹ چکا تھا' اچانک حملہ کر دیا۔ اگرچہ کمانڈر اور کمانڈ اختر ہو چکی تھی' لیکن ان سرپھندوں نے دشمن کا منہ پھیر دیا ——— ان کی کافی تعداد شہید اور زخمی ہو چکی تھی۔ ان حالات میں بھی انہوں نے ۲ بجے سہ پہر اور ۸ بجے شام کے مطابق پہاڑ پر قبضہ کر لیا۔

رات ——— اب دیر ہو چکی تھی۔ دشمن کا توپ خانہ کی پوزیشن لے چکا تھا۔ یہ جیالے ——— اکثر حملے کر گئے اور بچے کھچے زخمی و خستہ حالت میں کسی نہ کسی

طرح پسپائی اختیار کر کے اگلے روز صبح ہونے تک اپنے اڈے پر واپس پہنچ گئے۔

——— ان کی واپسی سے چھاپہ ماروں نے یہ سمجھا کہ دشمن حملہ کرنے کے لیے واپس اپنے مرکز کی طرف آ گئے۔

☆○☆

صورت حال انتہائی سنگین نوعیت اختیار کر چکی تھی۔ جنرل کی اصل قوت دشمن کے علاقے میں نو ہزار تین سو فٹ کی بلندی پر تھی۔ دشمن کا توپ خانہ اور اس کی نفاست اندھا دھند گولہ باری کر رہی تھی۔ پیچھے جانے کے راستے مسدود تھے کیونکہ جنرل طارق اور ان کے ساتھی [illegible] لیکن آفرین ہے ان جیالوں پر' کیا مجال کہ ان کے پائے ثبات میں لغزش آئی ہو۔

——— ان کی جواں ہمتی نے جنرل طارق کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی [illegible] بلائے طاق رکھ کر ان کی مدد کو پہنچے۔ ان تک پہنچنے کے لیے [illegible] لیکن اسی رات جنرل نے اپنے تمام ریزرو دستوں کو اس [illegible] اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چلا دیا۔

"رات آٹھ بجے کے بعد ایڈوانس شروع کرو اور اپنے کیمپ میں [illegible] سے جا ملو۔ میں کل صبح پانچ پر آخری اور فیصلہ کن حملہ کروں گا ——— آخری جوان۔" اس نے اپنی فوج کو آخری حکم [illegible]

اس کے ساتھ ہی جنرل نے تینوں قبائلی لشکروں کو [illegible] اندر سے پھوڑ دینے کے اعتماد کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اس مرتبہ یہ تینوں گروہ اور جذبے کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔

ان کے تابڑ توڑ حملوں نے دشمن کا دیوالہ نکال دیا۔ [illegible] نوٹے۔ پہاڑی علاقے میں فرنٹ کے باہر ان سے نبٹنا [illegible] نے جہاں دشمن کا کوئی سیکشن دیکھا اس پر ٹوٹ پڑے۔ [illegible] دشمن کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

وہ آندھی کی طرح حملہ آور ہوتے اور [illegible] کی تین کمپنیوں کا صفایا کر دیا۔ [illegible] موجود بھرتی شدہ فوج پر ٹوٹ پڑے [illegible] دیئے۔

——اس دوران مددگار فوج چوٹی پر چڑھ کر دشمن کے عقب میں جا چکی۔ یہ لڑائی کا پانچواں روز تھا۔ دشمن نے قبائلیوں کے شب خون کو ہی بڑا حملہ جان لیا اور انہیں پسپا کر کے قدرے مطمئن ہو گیا جب کہ قبائلی وہاں سے بھاگے نہیں' انہوں نے صرف "شکار گاہ" بدل لی تھی۔ وہ اب ٹیکریوں میں بٹ کر دشمن کے پہلو چاٹنے لگے تھے۔

"دلی (پانڈو) پر عقبوں سے حملہ کر دو۔"

جنرل طارق کا نعرۂ مستانہ گونجا اور "اللہ اکبر" کے فلک شگاف نعرے بلند کرتے غازیان صف شکن دشمن پر ٹوٹ پڑے۔

دشمن ابھی تک صورت حال کو سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس پر "بڑا حملہ" آ گیا۔ اب تک جنرل نے اسے اس بری طرح الجھائے رکھا تھا کہ دشمن کچھ کرنے کی پوزیشن ہی اختیار نہ کر سکا تھا۔ اس کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا کہ وہ فی الوقت اپنی فتح کو سینے اور مورچوں میں دبکا رہے۔ اس دوران رات ہو گئی۔ نو ہزار فٹ کی بلندی پر رات کو خاصی سردی تھی۔ جوانوں نے سردی کی شدت سے نجات حاصل کرنے کے لیے جگہ جگہ الاؤ روشن کر لیے کیونکہ وہ پانڈو کی بلندیوں پر ہر طرف پھیل گئے تھے۔ اس لیے بادی النظر میں یہی دکھائی دے رہا تھا کہ پانڈو ہر طرف سے گھیرے میں آ چکا ہے۔ دشمن گھبرا گیا۔ اس نے یہی سمجھا کہ پاکستان کی تازہ دم فوج یہاں موجود جوانوں کی مدد کو آ گئی ہے۔ صبح ہونے تک ان کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ رات بھر قبائلی چھاپہ مار الگ ان کی جان کو آئے رہے۔ انہوں نے ساری رات دشمن کو سیخی کا ناچ نچائے رکھا۔

علی الصبح پاکستانی فوج کے حملے سے پہلے ہی دشمن کے بھاری توپ خانے نے آگ اگلنا شروع کر دی' لیکن یہ داؤ بظاہر انہوں نے اپنی جان بچانے کے لیے کھیلا تھا۔ ان کی فوج اس بھاری بمباری کی آڑ میں دم دبا کر بھاگ اٹھی۔

جب جنرل طارق کے جیالے پانڈو پہنچے تو وہاں ایک بھی بھارتی فوجی موجود نہیں تھا۔ وہ ڈوگرہ جنگ کو محفوظ پناہ گاہ سمجھ کر اس طرف نکل گئے تھے' لیکن ان بوکھلائی ہوئی بھیڑوں پر قبائلی پٹھان چیتوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ انہوں نے جنگل کو جانے والے راستوں کو پہلے ہی گھیر لیا تھا۔

جنگل بھگوڑوں کی شکار گاہ بن گیا جہاں ان کی کئی کمپنیاں قبائلیوں کے خنجروں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

☆○☆

قافلہ راستے کی صعوبتیں برداشت کرتا کسی نہ کسی طرح آزاد کشمیر سے ہوتا ہوا مظفر آباد تک کا سفر بڑا جان لیوا قافلہ تھا۔ لوگ (لٹنے والے) بے سروسامانی کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے تھے۔ ٹرکوں کے مسافروں میں بیشتر تعداد زخمی اور مجروح مجاہدین کی تھی جو پونچھ کی لڑائی میں زخمی ہوئے تھے۔ ان کے لیے مرہم پٹی یا فرسٹ ایڈ کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا۔ اول تو مجاہدین میں کوئی ڈاکٹر ہی نہیں تھا اور اگر کوئی میڈیکل کا شد بد رکھنے والا میسر بھی تھا تو اسے دوائیں دستیاب نہیں تھیں۔ زخموں کے لیے بھی دیسی طریقہ علاج تجویز کیے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے اکثر کے زخم بگڑنے لگے' بالآخر ان زخموں نے ان کی جان لے لی۔

اس کی نظر جب ان معصوم بچوں پر پڑتی جن کے باپ اس جنگ میں شہید ہو چکے تھے اور جو اب ننگے پاؤں' رسیوں سے بنی ہوئی جوتیاں پہنے یا اپنے پیروں پر چیتھڑے لپیٹے سردی سے کپکپاتے ان کے ساتھ سفر کرتے ہوئے آ رہے تھے تو شدت غم سے اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا۔

اس نے ان بدقسمت بیواؤں کو بھی دیکھا جو بمشکل چند ہفتوں یا پھر چند مہینوں کے لیے سہاگنیں بنیں' جنہوں نے ابھی ازدواجی زندگی کا آغاز ہی کیا تھا کہ بیوہ ہو گئیں۔ وہ شریف زادیاں بھی اس کے ہمراہ تھیں جن کی ایک جھلک بھی کبھی کسی کو نظر نہ آئی تھی' لیکن جو آج ننگے سر کھلے بالوں اور پھٹے گریبان کے ساتھ بین کرتی ہوئی ان کے ہمراہ چلی آ رہی تھیں۔

اس کی نظریں ان بدبخت کشمیر کی بیٹیوں پر بھی تھی جو چند کی تابش سے بچا لی گئی تھیں' لیکن انسانوں کے بھیس میں موجود بھیڑیوں کے ہتھے چڑھ کر بازاروں کی زینت بن چکی تھیں۔

بڑے دلخراش نظارے کیے تھے اس نے۔

بڑے جگر پاش منظر دیکھے تھے اس کی آنکھوں نے۔

ان واقعات کا اس پر ایک ہی اثر ہوا کہ اس کا غم اب انفرادی سے اجتماعی ہو گیا۔ وہ سارے راستے اس آگ میں جلتا آیا تھا کہ اس دشمن سے کیسے ان تمام زیادتیوں کا انتقام لے جو ان کی بربادی کا باعث بنا تھا۔ اس کے سینے میں الاؤ دہک رہا تھا اور شدید جانتا تھا کہ اس دہکتے الاؤ کو ٹھنڈا کر سکتا ہے تو دشمن کا بہتا ہوا خون —— صرف اس کا خون' ورنہ تو یہ آگ کسی روز اسے بھسم کر ڈالے گی۔

زہراں کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ وہ تمام راستے شیرو' اپنے باپ اور رشتے داروں کی موت کا ماتم کرتی آئی تھی—— کبھی کبھی قدرت کی ستم ظریفی پر حیران بھی رہ جاتی کہ آج وہ شرفو کی بیوی بن کر جا رہی ہے۔ اس نے قافلے میں شامل ہونے سے پہلے تک اپنے آپ کو کشمیر کی سب سے مظلوم لڑکی جانا تھا کہ جس کا پورا کنبہ آزادی کی بھینٹ چڑھ چکا تھا' لیکن جب اس کے ہمراہ آنے والی عورتوں کی کہانیاں اس کے علم میں آئیں تو اسے اپنے دکھ ان کے سامنے بالکل ہیچ نظر آنے لگے۔ وہ اس لحاظ سے ان مظلومین میں شاید خوش قسمت ترین لڑکی تھی کہ اپنے ساتھ وہ شرفو کی شکل میں مضبوط سہارا لے کر جا رہی تھی—— شاید قدرت کو اس کے بزرگوں کی قربانیوں پر رحم آ گیا تھا کہ انھوں نے شرفو کی شکل میں زہراں کو قدرے محفوظ مستقبل کی ضمانت بہم پہنچا دی تھی جب کہ اس کی ہمراہیوں کو تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ ان کا کل کیا ہے؟

وہ سب بے چاریاں تو ایک دیوانگی کی سی کیفیت میں غم کے ہاتھوں بے حال' بے بس پتھر کے انسانوں کی طرح قدم بقدم گرتی پڑتی' ڈگمگاتی چلی جا رہی تھیں۔ انہیں اپنی منزل کا' اپنے راستے کا احساس تھا نہ علم۔ کون جانے ان الم نصیبوں میں سے کتنی ایسی تھیں جنہیں گھر دیکھنا بھی نصیب ہوا یا وہ صرف انسانی ہوس کی بھینٹ چڑھ کر بازار کا بکاؤ مال ہی بن کر رہ گئیں۔

☆○☆

آزاد کشمیر افواج کے جی۔ایچ۔کیو میں شرفو کو کئی آشنا چہرے' مانوس نگاہیں نظر آئیں لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اب وہ مجاہدوں کے نہیں' سیاست دانوں کے نرغے میں گھر چکا ہے۔ وہ لوگ پونچھ میں تھے تو اپنی جانوں سے گزر جانے کو سعادت جانتے تھے' لیکن یہاں آئے تو سیاست کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ان کی کمانڈ مجاہدوں سے چھن کر انگلی کو لہو لگا کر سورما کہلانے والوں کے ہاتھ میں آ گئی—— خون دینے والے گوشہ عزلت میں جا گرے اور دودھ پینے والے مجنوں اقتدار کی دیوی کے قدموں سے لپٹ گئے—— یہاں سب اپنی اپنی لڑائی لڑ رہے تھے۔

راشن کی لڑائی——!

کپڑوں کی لڑائی——!

زمینوں اور بلڈنگ کی لڑائی——!

عہدوں اور اقتدار کی لڑائی——!

وہ خارش زدہ کتوں کی طرح ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتے۔ اقتدار کے غلیظ نشے نے انھیں اندھا کر دیا تھا۔ انھیں اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ان کی آنکھوں پر ہوس کی ایسی پٹی بندھی تھی کہ سامنے کے اندھے کی طرح انھیں ہر طرف ہوا ہی ہوا دکھائی دیتی تھی۔ وہ ضدی بچوں کی طرح چیخنا چیخنا شروع کر دیتے اور دشمن کی مراد بر آتی۔

اس کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اسے کم عمری میں ہی آزاد کشمیر فوج نے اس کے خاندان کی قربانیوں کے پیش نظر خواجہ دار کا عہدہ دیتے ہوئے اور بہتر مستقبل کے لیے اسے ملک سے باہر جانے کے احکامات مل گئے۔

——اسے یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے کم از کم یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے' اپنے ہاتھوں سے' اپنی قوم کے لٹنے کا منظر تو نہیں دیکھے گا۔

محاذ پر روانہ ہونے سے پہلے وہ زہراں کے پاس آیا—— زہراں اور وہ دونوں خواجہ کے گھر والوں کے ساتھ ہی قیام پذیر تھے۔ مکان میں داخل ہوتے ہی پہلا کمرہ اشرف کا تھا جب کہ آخری کمرے میں زہراں رہتی تھی۔ وہ دن میں ایک دو مرتبہ ایک دوسرے کے سامنے آتے اور بہت کچھ کہنے کی خواہش رکھنے کے باوجود کچھ نہ کہہ پاتے۔ بس ایک دو روایتی سے جملوں کا ان کے درمیان تبادلہ ہوتا اور اچانک ہی زہراں کو کوئی کام یاد آ جاتا اور وہ "اچھا جی چلتی ہوں" کہہ کر اشرف خان کو سوچوں کے منجدھار میں اکیلا چھوڑ کر چلی جاتی۔

آج جب زہراں اس کے لیے بشارت لے کر آئی تو شرفو کے ذہن کی الجھنیں اس کے چہرے پر بھی نمایاں ہونے لگیں۔ زہراں اس کی بیوی تھی جس کا سہارا کنبہ ماں ہی میں کٹ چکا تھا۔ لے دے کے بس وہی تو اس کا سہارا رہ گیا تھا اور اب وہی اس سے محاذ پر جانے کو کہنے والا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے اس عمل کو کس بات سے تشبیہ دے؟ بظاہر تو شرفو کو یوں لگ رہا تھا کہ وہ زہراں کو اپنے محاذ پر روانگی کی اطلاع دے کر اس کے ساتھ ہی نہیں' اپنے ساتھ بھی زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے' لیکن وہ اسے بے خبر بھی رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

"زہراں" اس نے برتن رکھ کر لوٹتی زہراں کو مخاطب کیا۔ جانے اس کے لہجے میں کیا بات تھی یا پھر زہراں کی چھٹی حس تھی جس نے اسے پہلے ہی سے اگلی اطلاع دے دی تھی کہ وہ ٹھٹھر کر رہ گئی۔

"جی" اس نے جیسے تھوک نگل کر ایک لمحے کے لیے شرفو کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا زہراں کہ میں تمہیں کیا کہوں؟ کل ساری رات میں اس الجھن کا شکار رہا کہ صبح میں اس خبر کے ساتھ تمہارا سامنا کیسے کر سکوں گا کہ میں محاذ پر جا رہا ہوں۔"

"کیا؟" زہراں اچانک گھبرا گئی' لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل چکی تھی۔

"ہاں زہراں۔ وہ عظیم مقصد جس کے لیے ہمارے آباؤ اجداد صدیوں سے قربانیاں دیتے آ رہے ہیں' جس کے لیے ہماری جان سے بڑھ کر پیاروں نے جانوں کے نذرانے پیش کیے ہیں' اس مقصد سے اگر میں پیچھے ہٹ گیا یا کسی ذمے داری یا بزدلی نے مجھے محاذ پر جانے سے منع رکھا تو روز قیامت ہم اللہ کے حضور تو جواب دہ ہوں گے ہی' اپنوں سے بھی آنکھیں نہیں ملا سکیں گے۔ مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے زہراں کہ اگر اپنے مقصد کے راستے میں مجھے موت آ جائے تو اس کا غم نہ کرنا' اس لیے کہ میری جان شیرو کی جان سے قیمتی ہرگز نہیں۔ پھر ہم دونوں نے اکٹھے جینے مرنے کے پیمان بھی تو کئی مرتبہ باندھے تھے۔"

وہ بات کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گیا۔

اسے یوں لگا جیسے اس نے آخری فقرہ بول کر کوئی غلطی کی ہو۔ زہراں آخر ایک عورت تھی' ایک کمزور سی لڑکی جو اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اسے تو چاہیے تھا کہ وہ زہراں کو حوصلہ دیتا' اس کی ڈھارس بندھاتا۔ شاید اسی ارادے کو ذہن میں لیے اس نے بالکل ہی آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

——اس کا یہ فعل قطعاً" غیر ارادی تھا لیکن زہراں کے رگ و پے میں ایک برقی رو سی دوڑنے لگی تھی۔ شرفو نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے قدرے بلند کر لیا۔

"مجھے معلوم ہے زہراں۔" اس نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا۔ "کہ تمہیں یہ سب کچھ کہہ کر میں بہت دکھ دے رہا ہوں' لیکن ہم سب کے دکھ مشترک ہیں۔ ہمارا دکھ کشمیر کے دکھ سے بڑا نہیں۔ مجھے رخصت کرتے ہوئے دل میں کوئی ملال نہ لانا۔" اس سے آگے وہ ہزار کوشش کے باوجود ایک لفظ نہ کہہ سکا۔

زہراں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ اسے وہ منظر یاد آ گیا جب ایک مرتبہ بستے کے کنارے اور پھر اس کی پناہ گاہ پر شیرو نے اسی طرح اس سے باتیں کی تھیں' پھر وہ چلا گیا تھا اسے ہمیشہ کے لیے اکیلا چھوڑ کر—— کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ کیا شرفو بھی——؟ اس نے سوچا اور وہ اس تصور ہی سے لرز کر رہ گئی۔

"نہیں—— نہیں۔" بے ساختہ اس کے ہونٹ وا ہو گئے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کا گلا رندھ گیا اور وہ سکتے کی سی کیفیت میں اسے دیکھتا رہا۔

کشمیر کی بیٹیاں بہت حوصلے والی ہوتی ہیں زہراں۔" شرفو نے اس کی دونوں ہتھیلیوں کو اپنے ہونٹوں سے چھوا اور زہراں کو یوں لگا جیسے وہ انگارے اس کے رگ و پے میں اتر رہے ہوں۔ اس نے انگ بجھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس سے چھڑا لیے۔ "مجھے معاف کر دینا۔ میں بہک گئی تھی۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کیسے جیوں گی اور ساری زندگی آپ کی یاد میں گزار دوں گی۔ خدا نہ کرے کبھی آپ کی موت کا قرار کرتے ہوئے میں آپ کی کوئی کمزوری بن جاؤں۔"

اس کے لہجے کی اچانک تبدیلی نے شرفو کو حیران کر دیا تھا۔ "مجھے تم پر ہمیشہ ناز رہے گا زہراں—— مجھے تم پر ہمیشہ ناز رہے گا۔"

"فی امان اللہ!" زہراں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور واپس جانے لگی۔

"خدا حافظ——!" شرفو بڑبڑایا۔ اس کی نظریں زہراں کے پیچھے جانے کتنی دیر بعد تک بھی دروازے پر جمی رہیں۔

☆○☆

شرفو ایک سیکشن کے ساتھ میتھڑ کی ولوی میں مورچہ بند تھا۔ پچھلے دس پندرہ دنوں سے وہ لوگ مسلسل حالت جنگ میں تھے۔ ہر روز وہ اپنی پوزیشنوں سے نکلتے اور دشمن پر گھات لگا کر لوٹ آتے۔ انہیں چوبیس گھنٹے میں بمشکل چار گھنٹے سونا نصیب ہوتا تھا۔ ان پندرہ دنوں میں اس کے بے شمار ساتھی زخمی ہوئے اور کئی ایک نے اس کے ہاتھوں میں دم دیا۔

——اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی کہ وہ کوئی لاش دشمن کے ہاتھ میں نہ رہنے دے۔

اسے گھر سے نکلے تین ماہ ہونے کو آئے تھے۔ اس دوران زہراں کی خیریت معلوم کرنے کا واحد ذریعہ وہ رضاکار تھے جو مظفرآباد سے بھرتی ہو کر اس طرف آتے رہتے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی نورولی کے گھر والوں کا یا اس کا واقف نکل آتا جس سے وہ نورولی کے گھر والوں کی خیریت معلوم کر لیتا۔

اس کے سیکٹر کے جوانوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ انھیں کبھی آگے جانے اور کبھی پیچھے آنے کے احکامات ملتے رہتے تھے۔ اس نے تین مہینوں میں آزاد کشمیر کے جی۔ایچ۔کیو سے اپنی بہادری کا لوہا منوا لیا تھا اور اس کی کمان میں نکلنے والی پٹرول اور چھاپہ مار پارٹیاں جب لوٹ کر آتیں تو ہر کسی کی زبان پر شرفو کی بہادری کی کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی تھی۔

اس کی اپنی بس ایک ہی خواہش تھی کہ کسی بھی طرح وہ حملہ کر کے پونچھ میں موجود مجاہدین کی مدد کو پہنچ جائے۔ وہ ان فضاؤں میں دوبارہ سانس لینا چاہتا تھا جو اس کے اندر رچی بسی تھیں۔ وہ وہ کر اس کے بن میں ایک ہی آرزو مچلتی تھی کہ وہ ان گلیوں میں' ان پہاڑوں پر' ان بلندیوں میں جی بھر کے بھاگے اور بھاگتا چلا جائے جہاں اس کا بچپن بکھرا ہوا تھا' جہاں اس کے شیرو کی یادیں پھیلی ہوئی تھیں اور جہاں اب دشمن اپنے خونی پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔

مظفر آباد پر موسم گرما کے حملے سے مایوس ہو کر بھارتی افواج نے بھی اپنی جنگی حکمت عملی بدل لی' اب ان کی ساری توجہ پونچھ کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔

——جموں سے مغرب کی طرف جو کچی سڑک پاکستانی سرحد کے متوازی بمشکل چند میل کے فاصلے سے گزرتی تھی' وہاں سے بھارتی فوج کا ایک بریگیڈ ایڈوانس کرتا ہوا نوشہرہ کی طرف بڑھا تھا۔ مجاہدین اپنی فتری اور ناکافی اسلحے کے ہاتھوں مجبور ہو کر پسپا ہو گئے اور یہ بریگیڈ نوشہرہ پہنچ کر ریاستی فوج سے "ملاپ" کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

یہاں پہنچ کر بھارتی فوج نے میرپور پر جو منگلا ہیڈورکس کے نزدیک واقع ہے' قابض ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس مقام سے جہلم نہر نکلتی ہے۔ اس کے اس حملے کو کشمیریوں' پٹھانوں اور پاکستانی رضاکاروں کے ملے جلے دستوں نے ناکام بنا دیا تھا۔ یہاں تاریخ حریت کا بھی نہ بھولنے والا معرکہ لڑا گیا اور مجاہدین نے بھارتی فوج کو میرپور کے گرد و نواح میں رک جانے پر مجبور کر دیا۔

عین اس وقت شمال مغرب میں کچھ فاصلے پر واقع کوٹلی کے علاقے سے مجاہدین اٹھے اور انہوں نے کوٹلی پر قبضہ کر لیا۔

☆○☆

ان حالات سے فائدہ اٹھا کر اگست ۱۹۴۷ء سے اب تک مجاہدین نے پونچھ میں ریاستی افواج کے کیمپوں کو دبائے رکھا تھا' لیکن اردگرد کے علاقے سے پسپا ہونے والی فوج اور غیر

مسلم باشندے پونچھ شہر میں آ جانے کی وجہ سے وہ اچانک تمام پونچھ شہر کا کنٹرول سنبھالنے سے قاصر ہو گئے ہوا تھا۔ وہ اپنا گھیرا دشمن کے گرداگرد روز بروز تنگ کرتے جا رہے تھے۔

مئی ۱۹۴۸ء میں اوڑی محاذ سے دشمن نے لداخ روڈ پر حملہ کیا تھا لیکن یہاں منہ کی کھائی اور دشمن کے ہاتھوں سے پونچھ کا علاقہ نکلتے نکلتے بچ گیا تھا۔ اس کے بعد دشمن نے پونچھ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اس نے پونچھ کا زمینی رابطہ بھی کاٹ دیا۔ اس طرح پونچھ سارے کشمیر سے کٹ کر رہ گیا۔

۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کو جب اقوام متحدہ نے جنگ بندی کی تو پونچھ کے محاصرے کو نظرانداز کر دیا۔ اس انکار کی وجہ صرف یہی تھی کہ ان حالات میں جنگ بندی ہونے سے پونچھ سے زمینی رابطہ قائم نہ ہو سکتا تھا۔ مسلم شہری اور فوجی پاکستانی اور کشمیری مجاہدین کے ہاتھ میں یرغمال بن جاتے اور اسی یرغمال کی بنا پر ہم بھارت کو رائے شماری کے لیے مجبور کر سکتے تھے۔ یہ تلخ حقیقت تھی جو بھارت سرکار کو بھی تھا' اسی لیے اس نے اپنی تمام صلاحیتیں پونچھ کے محاصرے کو برقرار رکھنے پر صرف کر دیں۔

وادی مینڈھر کی ایک حفاظتی چوکی میں موجود حوالدار اشرف خان تمام روز ہونے والی بھرتی فوج کی اطلاعات پہنچ رہی تھیں۔

۲۴ اگست کو دشمن کی طرف سے نوشہرہ سیکٹر میں تازہ مورچہ بندیوں کی خبریں۔

اس کے ساتھ ہی اس نے نوشہرہ کے چاروں اطراف پھیلی مجاہدین کی پوزیشنوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ قریباً ایک ماہ مجاہدین اور دشمن کے درمیان آنکھ مچولی جاری رہی۔ اس ایک ماہ میں کئی جگہ دشمن کا اور کئی جگہ مجاہدین کا پلہ بھاری پڑا۔

۲۵ ستمبر ۱۹۴۸ء کو دشمن نے نوشہرہ سے راجوڑی کو کمک پہنچانی شروع کر دی۔ یہاں ۱۰ اکتوبر تک بڑی خون ریز جھڑپیں ہوئیں۔

۱۰ اکتوبر کو راجوڑی کے شمال مشرق میں بھارتیوں نے زبردست حملہ کیا۔ حملہ آوروں کی تعداد خاصی تھی' لیکن مجاہدین نے انہیں پسپا کر کے پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ یہاں تین چار روز شدید لڑائی جاری رہی۔ ہر روز دشمن نئی تیاریوں کے ساتھ حملہ آور ہوتا اور منہ کی کھا کر پیچھے ہٹ جاتا۔ ان کی فضائیہ نے بڑھ چڑھ کر زمینی فوج کو مدد دی۔

۱۹ اکتوبر کو دشمن نے پورے بریگیڈ کے ساتھ راجوڑی پر حملہ کیا۔ اس روز نوشہرہ کے شمال مغرب میں پٹھانوں اور کشمیری مجاہدین نے دشمن کی کمک پر گھات لگائی اور اسے

زبردست نقصان پہنچا کر پیچھے ہٹ آئے۔

۲۶ اکتوبر کو پونچھ میں موجود کیرژن نے محاصرہ توڑنے کے لیے زبردست زور لگانا شروع کر دیا۔

۲ نومبر تک دشمن کئی سیکٹروں میں اپنے بکتر بند ڈویژنوں کی مدد سے ایڈوانس کر چکا تھا۔

۴ نومبر کو راجوڑی چناس روڈ مجاہدین نے بند کر دی اور اس پر اس طرح رکاوٹیں کھڑی کر دیں کہ دشمن کے لیے ایڈوانس کرنا مشکل ہو گیا۔

۵ نومبر کو راجوڑی کے شمال میں اور ۸ نومبر کو راجوڑی کے شمال مغرب میں مجاہدین نے اپنے سروں کی فصل کٹوا کر دشمن کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔

۹ نومبر کو دشمن اپنے ٹینک بھی میدان کارزار میں لے آیا۔ ۱۳ سے ۱۵ نومبر تک اس کے ٹینک رسالوں نے بڑھ چڑھ کر حملے کیے' لیکن اپنے کمترین وسائل کے ساتھ بھی پاکستانی فوج' کشمیری اور پٹھان مجاہدین نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا اور غنیم کو حتی الوسع آگے بڑھنے سے روکے رکھا۔

۱۸ نومبر کو جموں میں دو تازہ دم بریگیڈ اور ایک توپ خانہ رجمنٹ آ گئی جس کے بعد دشمن کے بڑے حملے کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ محصور فوج نے چلاس کی طرف پیش قدمی شروع کر دی' لیکن محاصرہ قائم رہا۔

☆○☆

۱۹ نومبر کی رات کو شرفو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کے حملے کا منتظر تھا۔

——ان لوگوں کو اطلاعات مل چکی تھیں کہ ریاستی پونچھ کے علاقے میں دشمن کے تین ڈویژن سرگرم عمل ہیں اور اس ساری فوج کی مرکزی کمان نوشہرہ میں رکھی گئی تھی۔ انہیں رات کو تیار رہنے کا حکم ملا تھا کیونکہ دشمن راجوڑی سے کوٹلی اور مینڈھر پر ایک زبردست حملہ کرنے والا تھا۔ مجاہدین نے راتوں رات دشمن کے علاقے میں "ریکی" کر کے اس کی بے پناہ جمع شدہ قوت کی نشاندہی کر دی تھی۔

اگلے ہی روز آزاد کشمیر کے فرسٹ بریگیڈ پر جس کے پاس رائفلیں یا چند مشین گنیں تھیں' دشمن نے زبردست حملہ کیا اور اسے دھکیلتا ہوا دریائے پونچھ کے کنارے مدار پور تک پہنچ گیا لیکن فرسٹ بریگیڈ کے غضب ناک جوابی حملے نے اسے دوبارہ شہر میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

ان دنوں پونچھ سیکٹر کے کمانڈر بریگیڈیئر (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) اعظم خان اپنے

ہیڈکوارٹر کو دشمن کے ارادوں سے خبردار کرتے رہتے تھے لیکن اس کی اطلاع کسی کو نہیں ہوئی۔

۲۰ نومبر کو صوبیدار اشرف خان نے ہوا کے دوش پر سنائی دینے والی آواز سے بیدار ہو کر زبردست نقل و حرکت نوٹ کی۔ اس نے دائیں طرف نظر دوڑائی تو اچانک زوردار دھماکے کی آواز نے اسے خبردار کیا کہ دشمن نے حملہ شروع کر دیا ہے۔ اس سے محض چند گز دور دشمن کی میڈیم گن کا گولہ آن گرا تھا۔ اگر وہ خبردار نہ ہو جاتا اور اس کے ساتھی اس کے بچاؤ کے لیے آگے نہ بڑھتے۔ چھروں کے زخم اس کے چہرے پر لگے۔ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ خون میں لت پت ہو گیا۔ اس کے کئی ساتھی بھی زخمی تھے۔

——اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کیا اور دوربین آنکھوں سے لگا لی۔

دشمن نے اچانک بڑی تیز گولہ باری شروع کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دشمن کے طیارے چنگھاڑتے ہوئے نمودار ہوئے—— انہیں کھل کر اپنا کام کرنے کا موقع دینے کے لیے دشمن نے گولہ باری روک دی۔

بے بس مجاہدین دشمن کے طیاروں کو آگ برساتے دیکھتے رہے۔ ان کے پاس کوئی طیارہ شکن گن بھی نہیں تھی۔

شرفو نے جھک کر ٹیلی فون اٹھایا کہ پیچھے کمانڈ کو دشمن کی نقل و حرکت سے مطلع کرے' لیکن ٹیلی فون کے تار کٹ چکے تھے۔ اس کے سامنے والے مورچے میں موجود وائرلیس آپریٹر شہید ہو چکا تھا اور اس بات کے امکانات بہت کم رہ گئے تھے کہ اس کا سیٹ سلامت رہ گیا ہو۔ مورچے سے سر باہر نکالنا خودکشی کے مترادف تھا لیکن وہ یہاں بیٹھ کر تو تماشا بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود وہ رینگتا ہوا مورچے سے نکلا اور قیامت کی گولہ باری میں اس مورچے تک جا پہنچا۔

اس نے مورچے میں اتر کر وائرلیس سیٹ پر کرنے شہید کو سیدھا کیا۔ شاید وہ شہادت سے پہلے اپنا آخری فرض ادا کرنا چاہتا تھا' لیکن موت نے مرحوم کو مہلت ہی نہیں دی تھی۔

شرفو نے جھک کر سیٹ کا جائزہ لیا اور اسے شدید دھچکا لگا کہ سیٹ بھی ناکارہ ہو چکا تھا۔

وہ پلٹا—— دشمن کے طیارے اپنا کام مکمل کر کے جا چکے تھے اور ایک مرتبہ پھر توپ خانہ حرکت میں آ گیا تھا۔ اس پر دیوانگی طاری تھی۔ وہ بھاگ بھاگ کر اپنے ساتھیوں کو ہدایات

HBC

رہنے اور دشمن کی انفنٹری کا انتظار کرنے کا حکم دے رہا تھا اور خود گھسٹتا ہوا پیچھے جا رہا تھا
کہ کمانڈو کو صحیح صورت حال بتا سکے۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ بہہ کر اب آنکھوں میں
گرنا شروع ہو گیا تھا اور شرفو کو بار بار آستین سے اپنی آنکھیں صاف کرنا پڑتی تھیں۔
لیکن ابھی اس نے بمشکل پہاڑی کا پہلا موڑ ہی کاٹا تھا جب اسے دشمن کی ایک یونٹ
کے کچھ جوان بڑی چالاکی سے چھپ چھپ کر گولہ باری کی آڑ میں اپنی طرف بڑھتے دکھائی
دیئے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ دشمن کی نظر اس پر نہ پڑی ورنہ وہ بالکل اس کے
نشانے پر تھا۔

دشمن کو دیکھتے ہی اس کی رگوں میں انگارے تڑپنے لگے۔

---- شرفو نے بے چینی سے نظریں گھما کر حالات کا جائزہ لیا۔ وہ کسی ایسی آڑ کی
تلاش میں تھا جہاں سے دشمن کا یہ یونٹ اس کی زد میں آ سکے اور اپنی مطلوبہ جگہ نظر آتے
ہی وہ بڑی پھرتی سے وہاں تک پہنچ گیا۔ اب وہ ایک چٹان کی آڑ میں اپنے پوچ سے دستی بم
نکالے ایک خاص پوائنٹ پر یونٹ کی آمد کا منتظر تھا۔

اس نے دانتوں سے پن نکال دی کیونکہ دشمن بڑے محتاط طریقے سے چلتا اس کے
پھندے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شرفو کے دل کی دھڑکن غنیم کے قدموں سے بہت تیز تھی۔
وہ زیادہ دو منٹ کے جان لیوا اور اعصاب شکن انتظار کے بعد گو ہر مقصود اس کے ہاتھ آ گیا۔
گرینیڈ بدقسمت یونٹ کے عین درمیان پھٹا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شرفو کی اسٹین گن کی لمبی
سرخ زبان انہیں چاٹنے کو لپکی اور یونٹ پر قہر ٹوٹنے لگا۔ اس کا مقابلہ تربیت یافتہ فوج سے
تھا۔ اسی لیے شاید ایک گولی اس کے بازو میں گھس گئی اور اس کا ہاتھ ناکارہ ہو گیا۔

شرفو نے گلے میں اسٹین گن لٹکائے اور اس کے سلنگ میں ہاتھ اڑسے جب کمپنی کمانڈر
تک پہنچا تو اس کے لیے سامنے دیکھنا ناممکن ہو چکا تھا۔ سر بے تحاشا خون بہہ کر اس کی
آنکھوں میں گرنے لگا تھا۔ دو جوانوں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔

"سر!" اس نے ڈوبتی آواز میں اپنے سامنے کھڑے پاکستان آرمی کے میجر کو مخاطب کیا۔

"سر! او سر دشمن....."

میجر نے منہ پرلی طرف پھیر لیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے کانوں میں کہیں دور
ی کہر کہیں سے آتی میجر کی آواز سنائی دی۔ "بہت دیر ہو گئی میرے بیٹے۔ ہم لڑائی ہار
ے ہیں....."

اور شرفو خان کا جوانوں کے بازوؤں میں جھول گیا۔

"——— اسے میری جیپ میں پیچھے ہسپتال لے جاؤ۔" میجر نے بھرائی ہوئی آواز میں
اپنے جوانوں کو حکم دیا۔

☆○☆

اسی روز شام تک دشمن مینڈھر پر قبضہ کر چکا تھا۔ دو تین روز بعد ہی اس نے پونچھ کا
محاصرہ توڑ ڈالا اور نوشہرہ اور پونچھ کو آپس میں ملا دیا۔ اس طرح اس لائن کے مشرق کا تمام
علاقہ بھارت کے قبضہ میں چلا گیا۔ اگلے چار پانچ روز میں اٹھائیس ہزار سے زائد مہاجرین
کے لئے پونچھ قافلے جہلم پہنچ گئے۔ ان کے پیچھے بھی مزید قافلے چل رہے تھے۔

دشمن کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی اور اس نے پونچھ کا محاصرہ توڑ دیا تھا۔
دشمن نے یہ حملہ بے خبری میں نہیں کیا تھا۔ پاکستانی ٹی۔ایچ۔کیو کو اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً
معلومات حاصل تھیں اور مقامی محاذوں کے کمانڈر ہیڈ کوارٹر کی اطلاعات روانہ کر رہے تھے۔

——— کشمیری حریت پسند دشمن کے علاقے میں دور اندر تک جانیں ہتھیلی پر رکھ کر
ریکی کرتے اور اس کی منصوبہ بندیوں کی خبر پہنچا رہے تھے۔ انتیلی جنس کا بڑا مربوط جال ابتدا
ہی میں بھارتی فوج کے خلاف بچھا دیا گیا تھا اور گو یہ سب کچھ عوامی سطح پر ہو رہا تھا لیکن
جی۔ایچ۔کیو کو اس سے ہمیشہ باخبر رکھا گیا۔

مینڈھر کی تحصیل ہاتھ سے نکلی تو پاکستانی عوام نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔
اخبارات نے حکومت کو لتاڑنا شروع کر دیا۔ عوامی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے حکومت
نے قبائلیوں، کشمیری حریت پسندوں اور پاکستان آرمی کی مختلف یونٹوں کو ملا کر پچیس ہزار کا
لشکر ترتیب دیا——— اس لشکر میں پچاس توپیں بھی تھیں اور اس فورس کو آگے روانہ کر
دیا، لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

اس فورس نے جموں سے پونچھ تک دشمن کی طویل رابطہ لائنوں کو درمیان سے توڑ ڈالا
اور دشمن کی ایک بڑی نفری کو جو نوشہرہ میں تھی، درمیان سے کاٹ کر قریباً مفلوج کر دیا۔
ان کا نوشہرہ سے آگے قریباً ایک سو میل تک فلینک (پہلو) ہماری زد میں تھا جو قبائلی اور
کشمیری حریت پسندوں کی بہترین شکار گاہ بن سکتا تھا، لیکن اس محاذ پر کچھ نہ کیا گیا۔

دسمبر کے اوائل میں پاکستانی توپ خانے سے پانچ ہزار گولے بھارتی علاقے میں پھینک کر
پاکستان نے ایک مرتبہ تو دشمن کی نبضیں ساکت کر دیں۔ بھارتی بھاگنے کی تیاریاں کرنے
لگے کیونکہ جنگی اصولوں کے مطابق اس زبردست گولہ باری کے بعد انفنٹری کا حملہ ہونا
چاہیے تھا، لیکن مقام حیرت ہے کہ یہ حملہ نہ کیا گیا اور پانچ ہزار قیمتی گولے ضائع کر دیئے

گئے۔ نہ صرف یہ کہ حملہ نہیں کیا گیا بلکہ چھاپہ ماروں کو بھی روک دیا گیا۔

۲۱ دسمبر ۱۹۴۸ء کی نصف شب کو ایک طویل لڑائی کا اختتام ہوا اور کشمیر کے تبوت میں پہلا کیل ٹھونک دیا گیا۔

جنگ بندی اب ہونی ہی تھی کیونکہ کوئی ایسا پہاڑی علاقہ یا محفوظ مقام اس وقت تک متنازعہ نہیں رہ گیا تھا جس کی بھارت کو سری نگر' لداخ یا جموں کے تحفظ اور دفاع کے لیے ضرورت ہو۔

——کمنونہ رو؛ انگریز سرکار کی مہربانیوں سے پہلے ہی ان کے قبضے میں تھی اور اب جموں سے پونچھ اور سری نگر تک انہوں نے اپنی رابطہ لائن بڑی مضبوطی سے قائم کر لی تھی۔

دوسری طرف ہمارے ہاتھ کوئی بھی تاش کا ایسا پتہ نہیں رہ گیا تھا جسے دکھا کر ہم ہاری ہوئی بازی جیت جاتے۔ ہمارے پاس کوئی ایسا مضبوط محاذ نہیں تھا کہ بھارت پر دباؤ ڈال کر ہم اسے رائے شماری کے لیے مجبور کر سکتے۔

قائداعظم" کی رحلت کے ساتھ ہی اصل میں مسئلہ کشمیر کو بھی موت آ گئی تھی۔ بابائے قوم نے حکم دیا تھا "انہیں گولیوں اور بموں کی زبان میں سمجھاؤ۔"

——وہ جب تک زندہ رہے' کشمیر کے متعلق فکرمند رہے اور جب یہ آخری چراغ بھی بجھ گیا اور ایوان اقتدار میں جوتیوں میں دال بٹنے لگی تو ارباب بست و کشاد اپنی گدیوں کے متعلق فکرمند ہوئے۔ انہوں نے قائد کی وفات کے بعد جتنا عرصہ بھی جنگ جاری رکھی' انتہائی بددلی سے۔ بالآخر اسے کسی منطقی نتیجے پر پہنچائے بغیر ختم کر دیا۔

شرفو کو لڑائی ختم ہونے کی اطلاع ہسپتال کے ایک کمرے میں ملی تھی۔ وہ تڑپ اٹھا' لیکن وہ اکیلا ہی کیا سارا کشمیر تڑپ اور سسک رہا تھا۔ سارا پاکستان اس سانحے سے لرز اٹھا' لیکن یہ آہ و زاریاں کبھی حکمرانوں کے دل نہ پسیج سکیں۔ ان کی کراہیں اور چیخیں ایوان اقتدار کی دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر اپنی موت آپ ہی مر گئیں۔

شرفو رو بصحت ہو کر واپس آ گیا۔ اس کا دل ٹوٹ چکا تھا' لیکن اسے زہراں کے لیے بہرحال ایک محفوظ مستقبل تلاش کرنا تھا۔ فوج میں رہتے ہوئے اس نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ نورولی اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ انتہائی بددلی اور مایوسی کے عالم میں واپس آیا۔ جس روز زہراں دلہن بن کر شرفو کے گھر آئی' اس کے بمشکل تین ماہ بعد ہی اسے ملازمت اور مطلوبہ تعلیمی استعداد کے پیش نظر کمیشن مل گیا۔

اب وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ اشرف خان عمر پاشا تھا۔

☆○☆

اقوام متحدہ میں "کشمیر ایشو" پر پاکستان نے اپنے موقف کو اس دلیل اور شدومد کے ساتھ پیش کیا کہ بھارتی وفد کو لینے کے دینے پڑ گئے اور کوئی راہ نہ پا کر انہوں نے یہ معاملہ سلامتی کونسل ہی میں غنیمت جانا۔ اس نے اقوام متحدہ کو بتایا کہ اسے دہلی سے ہدایت ملی ہے وہاں سے بھی وہ حکومتی صلاح مشورے کے لیے واپس آ جائیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور اسٹیفورڈ کرپس کا رسوخ ہنوز برطانوی وزیراعظم ایٹلی پر قائم تھا۔ برطانیہ انتہائی منافقت کی پالیسی اپناتے ہوئے بھارت کو تحفظ فراہم کرتا رہا اور ہمارے مرحلہ بھی آ گیا کہ برطانوی مندوب نوئیل بیکر کو مسٹر ایٹلی کے غضب کا شکار ہو کر اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا کیونکہ وہ اس معاملے میں پاکستان کو برحق جانتے اور رائے شماری پر زور دیتے تھے۔

اپریل ۱۹۴۸ء تک پاکستان کی لابنگ شروع کے لیے برطانیہ اور امریکہ نے Pakistan & U.N.C.I.P. (United Commission on India کمیشن" کا نام دیا گیا۔ مقرر کر دیا۔ اس کو بعد میں "کشمیر

پاکستانی مندوب نے اس دوران حالات کا جائزہ لینے کے بعد وزیراعظم کو اس مضمون کا Cypher تار دے دیا تھا۔

"کشمیر کا فیصلہ نیویارک میں نہیں' کشمیر میں ہو گا۔"

کشمیر کمیشن کے ارکان پہلی مرتبہ جنیوا سے ۷ جولائی ۱۹۴۸ء کو کراچی آئے۔ یہ کمیشن امریکہ' کولمبیا' بلجیم' چیکوسلاواکیہ اور ارجنٹائن کے نمائندوں پر مشتمل تھا' لیکن زبان ترکم چیکوسلاواکیہ کے نمائندے ڈاکٹر کوربیل کو کرنا ہوتا تھا۔ وہ حالات اور بھارت کے رویے سے اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ ۱۹۴۹ء کے آغاز میں مستعفی ہو گئے۔ ان کے الگ ہوتے ہی کمیشن نیم مردہ ہو گیا اور بالآخر اپنی موت مر گیا۔

انہوں نے علیحدگی کے وقت پاکستانی مندوب سے کہا تھا۔

All Yours Suspicions of Pandat Nehru Were More Than Fully Justified.

(پنڈت نہرو کے متعلق آپ کے تمام شبہات حق بجانب ہیں۔)

کشمیر کمیشن کی پہلی قرارداد کی رو سے جنگ بند ہو گئی۔ ۳ جنوری ۱۹۴۹ء کو دوسری

قراردلو پر عمل کرتے ہوئے کشمیر کمیشن موقع پر دونوں فریقین کے درمیان حد فاصل قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد کمیشن کو ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کی قراردلو کے مطابق Truce Agreement یعنی فوجی انخلاء کے معاہدے کو ترتیب دینا تھا۔ دلی میں فریقین کے نمائندوں کو اس سلسلے میں طلب کیا گیا۔ انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے ہمراہ "منصوبہ انخلاء" بھی تیار کر کے لائیں۔

وقت مقررہ پر پاکستان نے اپنا منصوبہ پیش کر دیا' لیکن بھارتی وفد نے حسب روایت ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ عذر پیش کیا کہ ان کے کمانڈر انچیف اور وزیراعظم ابھی منصوبے پر نظر ڈالنے کے لیے وقت نہیں نکال سکے۔ قریباً" دس پندرہ روز بعد انہوں نے بالآخر اس شرط کے ساتھ منصوبہ پیش کیا کہ اسے امن کمیشن تو دیکھ لے' لیکن پاکستان کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔ یہ ان کی طرف سے پاکستان اور امن کمیشن کا تمسخر اڑانے کی پہلی کوشش نہیں تھی۔ فتح کے نشے نے بھارت کا دماغ خراب کر دیا تھا۔

فوجی انخلاء کے متعلق یہ طے پایا تھا کہ مجاہدین آزادی (جو قبائلیوں' کشمیریوں اور پاکستانی رضاکاروں پر مشتمل تھے) ریاست کی حدود سے فوراً" نکل جائیں۔ اس کے بعد پاکستانی فوج ساری کی ساری ریاست سے باہر چلی جائے' جب کہ بھارتی فوج کا Bulk کثیر حصہ ریاست سے نکل جائے۔

اس Bulk کی تشریح پر کمیشن اور بھارت سرکار میں ٹھن گئی۔ چنانچہ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ بھارتی منصوبے پر تو ہم بحث کرنے کے مجاز ہی نہیں کہ اس طرح بقول بھارت سرکار منصوبہ انخلاء انشاء ہو جائے گا۔ ذاتی غور وخوض کے بعد کمیشن کے الفاظ تھے:

The Plan Neither Quantitatively Nor Qualitatively Complies With the Terms of the Resolution. (کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے منصوبہ قراردلو کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا)

اس مرحلے پر کمیشن بھارت کے سرد رویے کی وجہ سے اپنے تقرر کو فضول سمجھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

مجلس امن نے آسٹریلیا کے ایک جج سراوون ڈکسن کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا کہ وہ دونوں فریقین سے گفت و شنید کے بعد اس معاملے کو خوش اسلوبی سے طے کر لیں۔ مسٹر اوون نے پنڈت نہرو سے ملاقات کی اور کہا کہ وہ کوئی علیحدہ حل اس مسئلے کا تجویز کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے پنڈت نہرو سے پوچھا اگر کوئی ایسا منصوبہ ہو تو کیا وہ اس پر پاکستانی وزیراعظم

کی موجودگی میں مذاکرات کریں گے؟ پنڈت نے ہاں کر دی۔

جب مسٹر اوون یہی تجویز لے کر پاکستان آئے تو پاکستانی وزیراعظم نے خوشی رضامندی ظاہر کر دی اور وہ اپنی دانست میں "قابل عمل منصوبہ" تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اتنا طے" انہوں نے پنڈت نہرو کو مطلع کرنا ضروری سمجھا کہ وہ اب اپنی تجویز تیار کر لے ہیں۔ مسٹر اوون کو اپنے ٹیلی گرام کے جواب میں جو پیغام ملا اس نے وہ شیدا کر دیا۔ پنڈت نہرو نے لکھا تھا:

"مجھے تمہارے تار کی سمجھ نہیں آئی۔ مجھے تمہاری کسی تجویز کا علم نہیں۔ میرے لیے یہ بالکل نیا معاملہ ہے۔ تم دلی آؤ تو اس پر گفت و شنید کرتے ہیں۔"

سر اوون کا واسطہ زندگی میں پہلی مرتبہ ایسے شخص سے پڑا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پنڈت جی کی دعوت پر دلی چلے گئے۔ دلی ہوائی اڈے پر سرگرم باشکر پانچ گھنٹے تک انہوں نے پنڈت نہرو کے اس ناقابل فہم رویے کا ذکر کیا تو انہوں نے کمال بے تکلفی سے جواب دیا:

Sir Owen! I Conceive the Prime Minister Must Have Suffered an Attack of Temporary Amnesia.

(سر اوون! میرے خیال سے وزیراعظم پر نسیان کا عارضی لیکن شدید حملہ ہوا ہے۔)

"آپ انہیں کسی ہسپتال میں داخل کروائیں۔ ایسے ذمہ دارانہ عہدے پر ایسے بھلکڑ آدمی کا تقرر مناسب نہیں۔" سر اوون نے فی البدیہہ جواب دیا۔ گرجا شکر تماشا کر رہ گیا اور سر اوون پنڈت نہرو کے رویے کے خلاف احتجاجاً" لوٹ آئے۔

اس کے بعد مجلس امن نے کینیڈا کے جنرل میکناٹن سے درخواست کی' لیکن ان کی بھی بھارت کے سامنے کوئی پیش نہ چلی۔

میکناٹن کے بعد ڈاکٹر فرینک گراہم کا تقرر ہوا۔ انہوں نے فوجی انخلاء کے لیے کیے بعد دیگرے چھ رپورٹیں پیش کیں۔ پاکستان نے ہر رپورٹ سے اتفاق کیا جبکہ بھارت نے ہر تجویز کا تمسخر اڑا کر اسے رد کر دیا۔

پاکستان نے یہاں تک کہا کہ اعتراض تو Bulk of Force پر ہے۔ بھارت جسے Bulk سمجھتا ہے اسے نکال لے۔ جو حصہ اس کے خیال میں کم فوج پر مشتمل ہے' اسے رہنے دے لیکن بھارت نے یہ تجویز بھی نہ مانی۔

اس دوران بھارت سرکار نے کشمیری عوام کو اپنے حق میں پسپا لانے کے لیے ہر حربہ آزما لیا۔ ان کے کچھ لیڈروں کو پیکر بازی سے اور کچھ کو لالچ و تحریص سے خرید لیا گیا تھا۔ بالآخر کشمیر میں ایک نام نہاد مجلس آئین ساز کمزی کر کے کشمیر اور بھارت کے مکمل الحاق کا اعلان کروا دیا گیا۔

بھارتی نمائندے کرشنا مینن نے موشگافی کی کہ ریاست کا الحاق تو روز اول ہی سے غیر مشروط اور مستقل ہے۔ اس میں اب کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں' چونکہ پاکستانی افواج آزاد کشمیر سے واپس نہیں گئیں' اس لیے بھارت بری الذمہ ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حالات اب بدل چکے ہیں' لہٰذا بھارت سرکار "استصواب رائے" کی قطعاً" پابند نہیں رہی۔

ان کی اس لن ترانی کا شافی جواب دیا گیا لیکن جب کوئی کسی کا حق غصب کرنے پر مصر ہو تو اس کا علاج تقریریں' تحریریں یا دلائل نہیں ہوا کرتے۔ ظالم صرف طاقت کی زبان سمجھتا ہے جو پاکستان نے ذرائع' نفری' حالات ہونے کے باوجود کسی ان دیکھے' ان جانے خوف کے تحت کبھی استعمال نہ کی اور آہستہ آہستہ مسئلہ کشمیر صرف کاغذات پر زندہ رہ گیا۔

شیخ عبداللہ جو خود کو سیاسیات کا چیمپئن کہا کرتا تھا اور جس کو قائداعظم" نے کہا تھا کہ وہ گاندھی اور نہرو کے چکر میں نہ آئے ورنہ ایک روز اسے پچھتانا پڑے گا' بالآخر معتوب ٹھہرا۔ اپنا مقاصد کے حصول کے فوراً" بعد ہی نہرو نے جس کی دوستی پر شیخ عبداللہ فخر کیا کرتا تھا اور جو تمام بھارت بلکہ دنیا بھر میں شیخ عبداللہ کا سب سے بڑا حمایتی تھا' شیخ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا ـــــ اور کشمیر میں کٹھ پتلی سرکار قائم کر کے وہاں قابض ہو گیا۔

☆○☆

شیرو بڑی حیرت سے نووارد کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

ـــــ آنے والے نے خفیہ کوڈ کے ذریعے اپنا تعارف کروانے کے بعد اسے اطلاع دی تھی: "ان کا ہیڈ کوارٹر گھیرے میں لینے کے لیے فوجی ٹرک تھوڑی ہی دیر میں روانہ ہونے والے ہیں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" شیرو دھاڑا۔

نسیم اس کی آواز سن کر ہی گھبرا کر باہر نکلی تھی۔ "کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"کچھ نہیں۔ تم اندر چلو۔" شیرو نے اسے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی۔

"تم بھی میرے ساتھ۔" اس نے نووارد کو مخاطب کیا۔

پچھلے سات سال سے وہ "صاعقہ" کے لیے سرگرم عمل تھا۔

ـــــ سات سال اس کی زندگی کے سات تنگ نہیں تھے اور سات سے اس کی زندگی کے ہر تنگ میل پر بڑے گہرے نقش چھوڑے تھے۔ ماضی سے جب وہ سکی کر بھاگا تو پیچھے دور پیچھے ڈوبنے والی قیامتوں نے اسے مضمحل کر دیا ـــــ وہ بیرون کی خان کے ہاں آیا اور اس نے بالاکم و کاست ساری داستان نبی خان کو سنا ڈالی تھی۔ نبی خان نے اس کے لفظ لفظ سے دل و دماغ سے تمام جزئیات پر بحث کرنے کے بعد اس کے لیے کوئی فیصلہ نہیں دیا تھا۔

"شیرو اس سب کچھ کے باوجود بھی ہمت سے راستے کھلے ہیں۔ تم اگر چاہو تو پاکستان کے کسی بھی بڑے شہر کے ہجوم میں کھو سکتے ہو اور اگر پاکستان نہیں جانا چاہتے تو بھارت کے کسی بڑے شہر کی طرف نکل سکتے ہو۔"

"یہ سب فرار کے راستے ہیں نبی خان!" شیرو نے اس کی بات کاٹ دی۔

"کچھ بھی کہو' لیکن ایک بات سوچ لینا۔ مارچ گزرنے کے بعد گھر پہنچنے والوں کے لیے اس دنیا میں سوائے پچھتاوے کے اور کچھ نہیں رہ جائے گا۔ شیرو! صبح کا بھولا صرف شام تک ہی گھر لوٹ سکتا ہے۔ اس کے بعد لوگ اسے بھلا دیتے ہیں۔ میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم کل اپنے کسی فیصلے پر پشیمانی کا اظہار کرو ـــــ ہم موت کی شاہراہ کے مسافر ہیں۔ ہماری منزل بالآخر ایک باوقار موت پر ختم ہوتی ہے۔

ـــــ یہ راستہ بہرحال پھولوں کا نہیں' صرف کانٹوں کا ہے اور نقصان مصیبت بن بیٹھا ہے تو اس جذبے سے کہ وہ کل کوئی لابھ حاصل کر سکے جب کہ یہاں ایسی کوئی بات نہیں۔

ـــــ ہم تم سب ایک روز مر جائیں گے۔ خدا جانے ہماری زندگیوں میں کشمیر آزاد ہو گا بھی یا نہیں' یا ہم یہ لڑائی اپنے بچوں کو منتقل کر جائیں گے اور اگر کبھی ہمارے بچے بھی ایسا ہو بھی گیا تو کون یاد رکھے گا کہ شیرو یا نبی خان کون تھے؟ ہماری کوئی پہچان نہیں۔ ہم کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں۔ ہمارا تو صرف ایک مصرف ہے کہ ہماری لاشوں پر آنے والی نسلیں اپنے اقتدار کے ایوان سجائیں ـــــ اب بھی وقت ہے شیرو! لوٹ جاؤ۔"

شیرو نے ایک لمحے کے لیے آنکھ بھر کر نبی خان کی طرف دیکھا۔ "نبی خان! کشمیر آزاد ہو گا یا ہم مر جائیں گے۔"

اس نے فیصلہ کن جواب دیا تھا ـــــ اور پھر!

شیرو "صاعقہ" کا ہو کر رہ گیا۔

شیرو ڈکیت

نبی خان کو اس کی آسیہ سے ملاقات کا علم تھا۔ وہ شیرو کو بتائے بغیر ہی ایک روز وہاں چلا گیا۔ آسیہ کے بھائیوں نے شیرو کے چچا کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور نبی خان دل میں ایک ارادہ کر کے وہاں سے واپس آیا تھا۔ اس کے بعد ہونے پر ہی شیرو آسیہ کے بھائیوں کو ملنے گیا تھا۔ جب اس کی آمد پر آسیہ کے بھائیوں نے گرم پانی سے اس کے پاؤں دھوئے تو شیرو روایات کے مطابق انہوں نے اسے صرف عزت ہی نہیں دی تھی بلکہ اس سے ایک خاص نسبت طے کرنے پر بھی اپنی خواہشات کا اظہار کیا تھا۔

نبی خان نے جب اسے بتایا کہ آسیہ کے بھائی اسے رشتہ دینے کے لیے رضامند ہیں تو اس کا ردعمل بڑا عجیب تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس اطلاع پر مسرت کا اظہار کرے یا ان کی پیش کش کو ٹھکرا دے۔

"نبی خان" اس نے جذبات سے قطعی عاری آواز میں اسے مخاطب کیا تھا۔ "میں تمہیں اپنا راہنما ہی نہیں بلکہ بزرگ بھی تسلیم کرتا ہوں اور میرے متعلق تمہارے جو جذبات ہیں' میں ان سے بھی آگاہ ہوں لیکن ہم لوگ جس راستے کے مسافر ہیں وہاں کسی کو اپنا ہمراہی بنانا اس کے ساتھ زیادتی نہ ہو گی؟"

"شیرو!" نبی خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اگر تم مجھے اپنا بزرگ سمجھتے ہو تو میرا فیصلہ بغیر کسی بحث کے قبول کر لو۔ میں جو کچھ سوچوں گا تمہاری بھلائی کے لیے ہی سوچوں گا۔"

شیرو نے صرف چند لمحے اس کے چہرے پر نظریں جمائیں' جہاں اس کے لیے شفقت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"ٹھیک ہے چاچا۔" اس نے گردن جھکا لی۔

☆○☆

آسیہ پڑھی لکھی لڑکی تھی جس نے ایک خاص سیاسی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کی

تربیت ایک مخصوص نہج پر کی جا رہی تھی۔ اپنے والدین کی موت تک وہ کانگریسی خیالات رکھتی تھی' لیکن جو سلوک اس کے گھر والوں کے ساتھ کانگریسی ذہنیت نے کیا تھا' اس نے آسیہ کو یقین دلا دیا تھا کہ گاندھی یا شیخ عبداللہ لاکھ امن کے پرچارک بنیں' ہندو مسلم اتحاد کی کتنی ہی تبلیغ کریں' لیکن عملی طور پر نہیں۔ مسلمان کتنا ہی غیر متعصب ہو' ہندو کے ذہنی کلای تو ممکن ہے' لیکن عملی طور پر نہیں۔ مسلمان کتنا ہی غیر متعصب ہو' ہندو کے لے کیسے ہی نیک جذبات رکھے' لیکن اس کی فطرت میں چھپی مسلم فطرت ہمیشہ ہندو پر غالب رہے گی۔ اس حادثے نے آسیہ کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ اسے گاندھی اور شیخ عبداللہ کے نظریات کھوکھلے' بے بنیاد اور ناقابل عمل دکھائی دینے لگے تھے۔

جس روز وہ شیرو کی دلہن بن کر آئی' بہت خوش تھی کہ زندگی میں اسے کم از کم وہ خاوند تو ملا جس کی اس نے خواہش کی تھی۔ شیرو کو نبی خان اور آسیہ کے بھائیوں نے فروٹ کا کاروبار بھی کروا دیا تھا۔ اس کے آبائی باغ پونچھ میں موجود تھے جو اس نے موقع ملتے ہی اونے پونے داموں ایک مقامی مسلمان کے ہاتھ فروخت کر کے اپنی کچھ پونجی بنا لی تھی۔

پہلے پہل تو اس نے آسیہ کو اپنی "نجی مصروفیات" کی خبر نہ ہونے دی' لیکن بہرحال وہ اس کی بیوی تھی اور شیرو نے اس کے اندر چھپی مسلمان اور کشمیری عورت کو بھی دیکھ لیا تھا اس سے پہلے تو وہ اپنے اکثر غائب ہو جانے کو "کاروباری مصروفیات" کا بہانہ بنا لیا کرتا تھا' لیکن ایک روز اسے آسیہ کو اعتماد میں لینا پڑا۔

آسیہ نے بڑے ٹھنڈے دل و دماغ سے اس کی باتیں سنیں اور اس کے ردعمل سے تو شیرو بھونچکا رہ گیا۔ آسیہ نے اسے بتایا کہ جو بات وہ اسے آج بتا رہا ہے' اس کا علم اسے پچھلے ڈیڑھ سال سے ہے۔ اس نے شیرو کو بتایا کہ اس کی غیر معمولی حرکات پر وہ تجسس صرف اسی لیے نہیں ظاہر کرتی تھی کہ مبادا کبھی شیرو شکوک و شبہات کا شکار ہو کر اپنے عظیم مشن کو سلیقے سے نبھا نہ سکے۔

"میں خود کو آج سے پہلے تو اس لیے خوش قسمت جانتی تھی کہ میں ایک مجاہد کی بیوی بن کر اس کی خدمت کی سعادت حاصل کر رہی ہوں۔" آسیہ نے کہا۔ "لیکن آج میری خوشی کا ٹھکانہ ہی نہیں' آپ نے مجھے اس قابل جانا کہ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی اصلیت

[illegible]

"میں ہی نہیں' کشمیر بھی تم پر ہمیشہ فخر کرے گا آسیہ۔" شیرو نے بڑے جذباتی لہجے میں

[illegible] تیرے سال قبل نے انہیں ایک بیٹی دے دی تھی۔ عائشہ کی آمد نے بھی

شیرو کے معمولات میں کوئی فرق نہ ڈالا۔

"[illegible] ساتھ" کی سرگرمیاں اگرچہ سخت ترین خفیہ اقدامات کے تحت ہو رہی تھیں' پھر بھی دل کی وجہ سے کچھ محدود ہو کر رہ گئی تھیں' لیکن سری نگر میں ان تنظیموں نے کبھی پولیس سے مار کھانا گوارہ نہ کیا۔ آئے دن وہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ بپا کیے رکھتے تھے' جو کہ بالآخر نبی خان کی گرفتاری پر منتج ہوتا تھا۔ اس نے تو جیسے ہی کشمیر میں ہوا کا رخ بدلتے دیکھا تھا' وہ سمجھ گیا تھا کہ کل کے دشمن آج کے دوست اور کل کے دوست آج کے دشمن بنتے جا رہے ہیں۔ بنیا ذہنیت نے مسلمانوں کی کمزوریاں ڈھونڈ کر ان کا بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ کانگریسی خیالات کے حامل لیڈروں کا جائیدادوں اور عہدوں سے نوازا جانا بھی اسی سلسلے کی کڑی تھا۔ کئی خاندان لکھ پتی بنتے جا رہے تھے۔ پاکستان نواز مہاسبھا کی جنگی طرز جدوجہد شروع ہو رہی تھی اور شیرو کے اکثر ساتھی بددل ہو کر پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ ان کی تنظیم کے دو تین مرکز بھی اپنوں کی غداری کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔

لیکن آج کی صورت حال نے تو واقعی اسے بوکھلا دیا تھا۔ ان کا ایک ساتھی جو خفیہ پولیس کے ہیڈکوارٹر میں ملازم تھا' خبر لایا تھا کہ چن زیب نے جو ان کا سب سے قابل اعتماد ساتھی تھا' لانچ میں آ کر ان کا ٹھکانہ بتا دیا ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد پولیس اور فوج ان کی سرکوبی کے لیے یہاں پہنچنے والی ہے۔

☆○☆

نووارد کو ساتھ لیے وہ دوسرے کمرے میں پہنچا جہاں نبی خان اور اس کے ساتھی صورتحال پر مشورہ کر رہے تھے۔ ان پر چن زیب کی غداری کی خبر بجلی بن کر گری۔

"اپنا اسلحہ سنبھالو اور یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔"

---نبی خان نے سنبھلتے ہوئے حکم دیا۔ پھر وہ شیرو سے مخاطب ہوا۔ "شیرو! میرے بیٹے۔ آج میری آخری بات مان لو۔ آسیہ اور اپنی بچی کے ساتھ پاکستان چلے جاؤ۔ یہ ظالموں کی سیاہ رات ڈھلتی دکھائی نہیں دیتی۔ میرے بچے! ہمارا مقابلہ دشمن سے نہیں' اپنوں سے ہے اور ہمارا جوابی وار بھی اپنے اوپر ہی ہوتا ہے۔ ممکن ہے کبھی تقدیر کو ہم پر رحم آ جائے اور وہ ہمیں کم از کم اپنوں کے عتاب سے بچ نکلنے کی مہلت نصیب کر دے۔"

"چاچا!" شیرو کا گلا رندھ گیا۔ "چاچا کشمیر کا آخری حصار بھی ٹوٹ جائے گا۔" وہ تڑپ کر رو پڑا۔

"یہ خدائی فیصلہ ہے میرے بچے۔ اسے قبول کرنا ہی ہو گا۔ ہمارے اعمال نے ہمیں

دن دکھانے ہی تھے۔ یہ لو اسنین کن۔" اس نے ایک گن شیرو کی طرف بڑھائی اور دوسرے کمرے میں موجود آسیہ کو بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔ ننھی عاکفہ آنے والی قیامت سے بے خبر اپنی ماں کے سینے سے چمٹی گہری نیند سو رہی تھی۔

"آسیہ میری بچی!" نبی خان نے جھک کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ "اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ وہ سامنے والے راستے کی طرف سے نکل کر گاؤں کے باہر والے مندر تک پہنچو۔ ہم تمہارے پیچھے آتے ہیں۔"

نبی خان نے آسیہ کو خفیہ راستے کی طرف روانہ ہونے کی ہدایت کی۔

——شیرو نے بے اختیار آگے بڑھ کر سوئی ہوئی عاکفہ کا منہ چوم لیا۔ "اللہ کے حوالے آسیہ۔ فی امان اللہ!!" اس میں آسیہ سے نظریں ملانے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔

"خدا حافظ——!" آسیہ کا گلا رندھ گیا۔

اس نے بچی کو چادر میں اچھی طرح لپیٹ کر اپنے سینے سے چمٹا لیا اور اس راستے پر گامزن ہو گئی جو کسی ہنگامی ضرورت کے وقت اسے اختیار کرنا تھا۔

نبی خان نے آنکھوں سے لگی دوربین سے وہ ٹرک دیکھ لیے تھے جنہوں نے گاؤں کو گھیرے میں لینا شروع کر دیا تھا۔

"ادھر آؤ شیرو۔ ہم دوسری طرف سے نکلیں گے۔"

——اس نے آسیہ کی مخالف سمت میں بڑھتے ہوئے شیرو سے کہا۔

دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں اپنی اپنی گنیں سنبھالے چل رہے تھے' لیکن دونوں یہ بات بھول چکے تھے کہ چن زیب نے سب سے پہلے دشمن کو فرار کے خفیہ راستے ہی سے آگاہی دی ہو گی۔

اور دونوں بمشکل چند گز آگے بڑھے تھے جب ہوائی فائرنگ نے ان کے قدم تھام لیے۔

نبی خان نے ایک آڑ میں رکتے ہوئے دوبارہ دوربین آنکھوں سے لگائی تو جیسے اس کا وجود پتھر ہو گیا۔ وہ منظر ہی کچھ ایسا تھا۔ آسیہ کے فرار والے راستے کے عین سامنے سے اچانک نمودار ہونے والے فوجیوں نے اسے للکارنے یا "ہالٹ" کہنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی تھی۔

بیک وقت تین چار گنوں کی سرخ زبانیں اس طرف لپکیں اور آسیہ کا جسم خون میں

سنے کا تھا۔

نبی خان کو محسوس ہو رہا تھا۔

نبی خان نے کشمیر کی بیٹی کو لہو کا غسل لیتے ہوئے تیورا کر گرتے دیکھا۔ اس کی معصوم بچی ماں کی گود میں آواز ڈھالنے کی مہلت بھی شاید نصیب نہیں ہوئی تھی جب اسے اپنا وجود مٹی اجل نے آ لیا۔ آسیہ ڈگمگا کر پہلو کے بل گری تھی۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ آخر دم تک اس سے جدا نہ ہو سکی۔

ماں بیٹی کا خون ایک دوسرے کے خون میں مل کر ایک ہو گیا تھا۔

——ننھی عاکفہ ابھی تک اپنی ماں کے پہلو سے چمٹی ہوئی تھی۔ ان کے جسموں سے بہنے والا لہو اب نبی خان کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ ایک دوسرے سے اس طرح سختی سے جڑے ہوئے تھے کہ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں باہر نکلی محسوس ہو رہی تھیں۔ حملہ آوروں نے رک کر ماں بیٹی کی موت کی تصدیق بھی نہیں کی تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے اس پہاڑی کی طرف آ رہے تھے جہاں "صاعقہ" کے جانبازوں کی موجودگی نے ان کے تن بدن میں آگ لگائی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے چاچا——؟ کیا ہوا؟ مجھے دکھاؤ۔" شیرو نے جب گنگی باوے نبی خان کو اس سمت نظریں جمائے دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا۔

——اس نے نبی خان کے ہاتھ کو ذرا سا ہٹا دے کر دوربین اس کی آنکھوں سے ہٹا لی تھی اور—— پھر دوربین شیرو کی بے چین آنکھوں پر تن گئی۔

اس میں سامنے کا منظر دیکھنے کی تاب نہ رہی تھی۔

——بمشکل چند لمحے ہی دوربین اس کی آنکھوں پر رہی تھی' جب اسے اپنا وجود مٹی ہوتا محسوس ہوا۔ اسے یوں گمان گزرنے لگا جیسے وہ آہستہ آہستہ قسطوں میں مر رہا ہو—— دوربین اس کے ہاتھوں سے نکل کر زمین پر گر پڑی اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح خود بھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔

——اس کا بدن سرسام کے مریض کی طرح جھٹکوں سے کپکپا رہا تھا۔ اس کے سامنے کا منظر دھندلانے لگا تھا اور اس کی بیوی اور بچی کے مقدس اور معصوم خون کی چادر اس کی آنکھوں کے سامنے تن گئی تھی—— اسے اردگرد کے مناظر اور اپنے گردا گرد کھڑے ساتھی اسی لہو میں ڈوبتے' غرق ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

اس کی آنکھوں سے ٹپکتا لہو انگارے بن کر اس کے گالوں پر بہنے لگا' پھر جیسے اس کے لہو کا خمیر بدلنے لگا۔ اچانک ہی اسے یوں لگا جیسے کسی نے طاقتور انجکشن کے ذریعے اس کے لہو میں آگ بھر دی ہے۔ اس کے بدن میں انگارے تڑپنے لگے اور وہ جو اپنے بدن سے

تلخی محسوس ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ واپس آنے لگی۔ کسی ان دیکھی طاقت نے اسے دشمن سے انتقام کے لیے اکسا کر دبا۔

"میں انتقام لوں گا۔" وہ بڑبڑایا۔ "انتقام ـــــ انتقام!"

اس نے گردن موڑی تو نبی خان کی انگارہ آنکھوں سے خارج ہوتی برقی لہریں اسے اپنے جسم میں دھنستی محسوس ہو رہی تھیں۔ بوڑھے نبی خان کی انگلیاں اس کے بازو کے گوشت میں اترنے کے بعد ہڈی کے گرد اپنا شکنجہ تنگ کر رہی تھیں۔

"شیرو!" نبی خان کی آواز کا تیر تھا کہ شیرو اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے صرف سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے ہی پر اکتفا کیا۔ "تو نے "صاعقہ" میں شمولیت کے وقت ایک حلف دیا تھا مجھے۔" نبی خان غرایا۔

"ہاں چاچا۔" شیرو کو بولنے کے لیے بڑا زور صرف کرنا پڑا۔

"میرے بیٹے! تو نے کبھی میری اطاعت سے منہ نہیں موڑا اور آج بھی میرا یہ آخری حکم تجھے ماننا ہو گا۔ جس طرح بھی ممکن ہو' چن زیب کو جان سے مار ڈالنا' پھر پاکستان پہنچ جانا۔ میں دشمن سے تمہاری بیوی اور بچی کا انتقام لوں گا اور تم سارے کشمیر کے بے گناہوں کے خون کا انتقام لینے کے لیے تیاری کے ساتھ واپس آنا۔ شیرو! اگر تو ہمارے پیچھے آیا یا یہاں سے فوراً" نہ نکل گیا تو صف توڑنے پر میں روز قیامت تیرے گریبان پر ہاتھ ڈالوں گا۔ جا میرے بیٹے! نکل جا یہاں سے۔ تیرے سوا اور کوئی مجھے ایسا نظر نہیں آتا کہ جو میرے مشن کو جاری رکھ سکے۔"

شیرو کی حالت اس بپھرے اور تلملائے ہوئے شیر کی سی تھی جس کے سامنے سے اس کا شکار اچانک ہٹا لیا جائے۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کچھ کر گزرے۔

ـــــ چاچا نبی خان نے قرآن مجید پر اٹھایا ہوا حلف یاد دلا کر اس کے ہاتھ پاؤں دیئے تھے۔

وہ یہاں سے زندہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ آسیہ اور اپنی بچی کی طرح ان لوگوں کی طرح جو اس کے سامنے مرنے جا رہے تھے' دشمن سے لڑتا ہوا مر جائے' لیکن نبی خان اس کے اور موت کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو گیا تھا اور اپنا فیصلہ اٹل کر اسے سنا دیا تھا۔

"شیرو! چن زیب کو اس خنجر سے قتل کرنا۔ اس کی موت جتنی اذیت ناک ہو گی' اتنا ہی ہمارے دلوں کو ٹھنڈک ملے گی۔ جاؤ! خدا تمہارا نگہبان ہو۔ ادھر آزاد کشمیر

والوں کو ہمارا سلام پہنچا دینا۔ وہاں کے لوگوں کو بتانا کہ ہم نے اپنے سر کٹوا کر بھی جنہوں نے کشمیر کو بھلایا نہیں ـــــ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ اقوام متحدہ کے ہوٹلوں میں نہیں' سری نگر کی پہاڑیوں میں ہو گا۔ ہم اپنے خون سے آزادی کا جو باب لکھیں گے' وہی ہماری تاریخ بنے گا ـــــ وہی ہمارا فیصلہ ہو گا۔ جا میرے بچے! خدا تیرا حامی و ناصر ہو۔"

نبی خان نے ساکت کھڑے شیرو کے ایک ہاتھ میں خنجر تھما کر اور اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر شدت جذبات سے دبایا۔ اس کے ماتھے کو بوسہ دیا اور اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اس راستے کی طرف بھیج دیا جو انہوں نے اس طرف سے حملہ کرنے والوں کی پسپائی کی تکمیل و حفاظت کے لیے منتخب کر رکھا تھا۔

☆○☆

شیرو دل پر پتھر رکھ کر پلٹا تھا۔

ـــــ اس نے اپنا سفر یہاں سے روانہ ہونے والے سربلندوں کی خاصی دور تک میں شروع کیا تھا۔ اس کی جیب میں کچھ کرنسی تھی۔ ایک خنجر کپڑوں کے نیچے بندھا ہوا تھا اور بیلٹ میں گولیوں کے علاوہ اس نے ہاتھوں میں اسٹین گن اور پہلو سے لٹکتے تھیلے میں بھری ہوئی کچھ میگزینیں اور گرنیڈ وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔

روانگی کے وقت اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ عاکفہ اور آسیہ کے خون میں لتھڑے ہوئے جسم اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئے تھے۔ وہ بیک وقت زندہ بھی تھا اور مردہ بھی۔ اسے اپنی بیوی اور بچی کا آخری دیدار تک نصیب نہیں ہوا تھا۔

یہ تھا اس کی تمام تر جدوجہد کا نتیجہ۔ اس روز بد کو دیکھنے کے لیے اس نے اتنی قربانیاں دی تھیں کہ ان میں سے انہی کا کوئی ساتھی اٹھے اور چند لمحے اپنے ضمیر کی قیمت وصول کر کے ان سب کے کیے کرائے پر پانی پھیر دے؟ اس نے اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کو دیکھا اور کانوں سے سنا تھا جو کشمیر آزاد کروانے کے لیے اپنی جان سے گزر جانے کی قسمیں کھایا کرتے تھے' لیکن جو نکوں کے مول بک گئے۔ معمولی عہدوں اور سکوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کل تک جو لوگ بھارتی حکومت کا نام سننا گوارہ نہیں کرتے تھے وہ آج اس حکومت کے ستون بنے ہوئے تھے۔

شیخ عبداللہ کا حشر بھی ان لوگوں کو خواب غفلت سے نہیں جگا سکتا تھا۔

ـــــ ۱۹۵۲ء کے بعد سے جو حشر شیخ عبداللہ کا ہو رہا تھا' وہ سب کے سامنے تھا' لیکن سب اقتدار کی کرسیوں سے چمٹے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی فکر میں تھے۔ کل تک کشمیر

کے وفادار تھے۔ آن بوجھ کر غلاموں کی وفاداری کے کن کا رسیا تھا۔ شیرو سوچ رہا تھا۔ "یہ سب بکواس ہے۔ کوئی انتخاب نہیں آئے گا یہاں۔ یہ لوگ محض چند روپوں کے لیے ساری زندگی کشمیر کی عزت سے پیٹ کمیلتے رہیں گے۔ یہ سب چور ہیں، ڈاکو ہیں۔ الوطنی سے کمائی کما کر خود اپنا شکار کھیلا ہے۔"

اچانک ہی زوردار دھماکوں نے اس کے قدم ڈگمگا دیئے۔ وہ سمجھ گیا کہ ——— دشمن اس کے ساتھیوں کے نرغے میں پھنس چکا ہے اور انہوں نے ہینڈ گرنیڈ پھینکنے شروع کر دیئے ہیں۔

——— لیکن شیرو جانتا تھا کہ اب اس کے ساتھیوں کے بچ نکلنے کے امکانات بھی ختم ہو رہے تھے۔

☆○☆

اس نے فرار کے لیے طویل پہاڑی راستہ منتخب کیا تھا کیونکہ نزدیک کے دو تین دیہات میں فوج نے اپنے گھیرے میں لے رکھے تھے اور اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر مرنا اسے گوارا نہیں تھا۔ رات کے دوسرے پہر وہ سری نگر شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ اپنے کسی اڈے کی بجائے اس کا رخ سری نگر کی اس مالدار آبادی کی طرف تھا جو حال ہی میں آباد ہوئی تھی جہاں چن زیب کو جو سرکاری افسر ہونے کے علاوہ ان کا ساتھی بھی تھا، ایک خوبصورت بنگلہ الاٹ ہوا تھا۔

ان لوگوں نے چن زیب کے متعلق کبھی غداری کا تصور بھی نہیں کیا تھا کیونکہ وہ بے [illegible] طرح سے مطمئن زندگی گزار رہا تھا اور یہاں بہرحال ایک بہتر مستقبل کے ساتھ [illegible] لیکن وہ انہیں "ڈبل کراس" کر گیا۔ محض چند ہزار روپوں کے لالچ میں کیونکہ [illegible] چن زیب اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے لیے انعام مقرر کر رکھا تھا۔

[illegible] اس گن کے ساتھ یہاں تک پہنچنا ناممکن نہیں تھا۔ اسے اپنی گن خود [illegible] بہت ہوا تھا، لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا رہ گیا تھا۔

[illegible] بنگلہ کمرے اور اندھیرے کی چادر میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ کے اندر ایک [illegible] کھڑی تھی جس کے پیچھے لگی تختی چن زیب کا عہدہ بڑھ جانے پر دلالت کرتی تھی۔ پھاٹک کے وسط میں بنے کمرے سے نکلتی روشنی شیرو کو چوکنا کر رہی تھی کہ عمارت کے [illegible] ابھی جاگ رہے ہیں۔ شیرو بخوبی اس بات کو سمجھ رہا تھا کہ چن زیب ان لوگوں کی [illegible] سے کسی ایسی کارروائی کے خوف سے نہیں جاگ رہا تھا کیونکہ اس کے "آقاؤں" نے

اسے یقین دلا دیا ہوگا کہ تمام "غدار" مارے گئے ہیں۔ خود اسے بھی یقین تھا کہ کوئی زندہ ہی کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے فرار کے تمام راستوں کی نشان دہی کر دی تھی۔

پھاٹک کی چھوٹی سی اونچائی والی دیوار چھلانگ کر جب وہ اندر داخل ہوا تو ان لوگوں کی اس قدر بے پروائی پر وہ متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ باہر کوئی خفیہ بھی تو موجود نہیں تھا۔

——— اور اس احساس نے کہ وہ اپنی جان اور معصوم بچی کے قتل کے گھر میں آ گیا ہے، اس کے تن بدن میں شعلے بھڑکا دیئے تھے۔ وہ کسی بھی لمحے خونخوار چیتے کی طرح چن زیب پر جھپٹ کر اسے چیر پھاڑ دینا چاہتا تھا۔ اس کا سارا دکھ قہر میں ڈھل رہا تھا اور وہ کسی بھی لمحے اجل بن کر اس پر ٹوٹنے کے لیے پر تول رہا تھا۔

کسی بھی ممکنہ مدافعت کا بندوبست اس نے وہیں برآمدے کے ایک ستون کی آڑ میں رک کر کر لیا تھا۔ وہ بلی کی طرح دبے قدموں اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کمرے سے شراب کے نشے میں دھت آوازیں اب اسے بخوبی سنائی دینے لگی تھیں۔ کبھی کبھی مردانہ قہقہوں کے ساتھ نسوانی چیخ نما ہنسی بھی ابھر رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ غدار اندر داد عیش دے رہا ہے۔

ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے کچھ سوچا پھر خنجر کو جو اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا دوبارہ اپنی لمبی گرم جراب میں اڑس لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ریوالور کو ہاتھوں میں تول رہا تھا۔ اچانک آسمان پر بادل زور سے دھاڑے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ جوش انتقام سے اس کے سانسوں کی ترتیب بگڑنے لگی تھی۔ اس نے منہ کے ذریعے دو تین لمبے لمبے سانس باہر پھینک کر خود کو نارمل کیا۔

دروازے پر اس نے اتنی زوردار لات ماری کہ اسے کھولا تھا کہ اس کی چٹخنی ٹوٹ گئی۔ اندر چن زیب اور ایک فوجی صوفے کے سامنے میز پر ——— شراب کی بوتل رکھے بیٹھے تھے جو تقریباً خالی ہو رہی تھی۔ ایک آبرو باختہ لڑکی ان دونوں کے درمیان بیٹھی تھی جس کی آنکھیں شیرو کو دیکھتے ہی خوف سے پھٹ چلی تھیں اور چیخ اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی تھی۔

چن زیب کا نشہ شیرو پر نظر پڑتے ہی ہرن ہو گیا جس کے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کی نالی اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"تت..... تت..... تم۔" اس پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

"کک..... کک..... کون ہو تم؟" فوجی افسر خوف سے منجمد ہو چکا تھا۔

HBC

کے جو وفادار تھے' آج بیٹھ بیٹھ کر غداروں کی وفاداری کے گن گا رہے تھے۔ شیرو سنتا رہا تھا۔ "یہ سب بکواس ہے۔ کوئی انقلاب نہیں آئے گا یہاں۔ یہ لوگ محض چند ٹکڑوں کے لیے سارے کشمیر کی عزت سے ہمیشہ کھیلتے رہیں گے۔ یہ سب چور ہیں' ڈاکو ہیں۔ انہوں نے کمات لگا کر خود اپنا شکار کھیلا ہے۔"

اچانک ہی زوردار دھماکوں نے اس کے قدم ڈگمگا دیئے۔ وہ سمجھ گیا کہ ـــــ دشمن اس کے ساتھیوں کے نرغے میں پھنس چکا ہے اور انہوں نے ہینڈ گرنیڈ پھینکنے شروع کر دیئے ہیں۔

ـــــ لیکن شیرو جانتا تھا کہ اب اس کے ساتھیوں کے بچ نکلنے کے امکانات بھی ختم ہو رہے تھے۔

☆○☆

اس نے فرار کے لیے طویل پہاڑی راستہ منتخب کیا تھا کیونکہ نزدیک کے دو تین دیہات بھی فوج نے اپنے گھیرے میں لے رکھے تھے اور اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر مرنا اسے گوارہ نہیں تھا۔ رات کے دوسرے پہر وہ سری نگر شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ اپنے کسی اڈے کی بجائے اس کا رخ سری نگر کی اس مضافاتی آبادی کی طرف تھا جو حال ہی میں آباد ہوئی تھی جہاں چن زیب کو جو سرکاری افسر ہونے کے علاوہ ان کا ساتھی بھی تھا' ایک خوبصورت بنگلہ الاٹ ہوا تھا۔

ان لوگوں نے چن زیب کے متعلق کبھی غداری کا تصور بھی نہیں کیا تھا کیونکہ وہ بے نیاز اور ہر طرح سے مطمئن زندگی گزار رہا تھا اور یہاں بہرحال ایک بہتر مستقبل کے ساتھ قیام پذیر تھا' لیکن وہ انہیں "ڈبل کراس" کر گیا۔ محض چند ہزار روپوں کے لالچ میں کیونکہ سرکار نے نبی خان اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے لیے انعام مقرر کر رکھا تھا۔

شیرو کے لیے اسٹین گن کے ساتھ یہاں تک پہنچنا ناممکن نہیں تھا۔ اسے اپنی گن خود سے جدا کرتے ہوئے دکھ تو بہت ہوا تھا' لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا رہ گیا تھا۔

مضافاتی آبادی کا یہ بنگلہ کہرے اور اندھیرے کی چادر میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ کے اندر ایک سرکاری جیپ کھڑی تھی جس کے پیچھے لگی تختی چن زیب کا عہدہ بڑھ جانے پر دلالت کرتی تھی۔ بنگلے کے وسط میں بنے کمرے سے نکلتی روشنی شیرو کو چوکنا کر رہی تھی کہ عمارت کے مکین ابھی جاگ رہے ہیں۔ شیرو بخوبی اس بات کو سمجھ رہا تھا کہ چن زیب ان لوگوں کی طرف سے کسی انتقامی کارروائی کے خوف سے نہیں جاگ رہا کیونکہ اس کے "آقاؤں" نے

اسے یقین دلا رکھا ہوگا کہ تمام تر تعاون کے باوجود انہیں کشمیر میں اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے فرار کے تمام راستوں کی نشاندہی کر دی تھی۔

پچھلے کی پہاڑی کی اونچائی والی دیوار بھانگ کر جب وہ اندر داخل ہوا تو اس کی اس قدر سے پرواہی پر وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور تب اسے یقین ہو گیا کہ ـــــ اور اس نے اس کا سر اپنی ران پر رکھ لیا۔ وہ اپنی ران اور معصوم بچی کے آنسو سے تر ہوتا محسوس کر رہا ہے' اس کے تن بدن میں آگ بھڑکا دیئے تھے۔ وہ کسی بھی لمحے طوفان بن کر اس کی عزت کو جھپٹ کر اسے جہنم واصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا سارا دھیان قدموں میں پڑا تھا اور وہ بھی لمحے اجل بن کر اس پر ٹوٹنے کے لیے پر تول رہا تھا۔

کسی بھی ممکنہ مداخلت کا بندوبست اس نے دروازے کے باہر برآمدے میں ایک ستون کی آڑ میں رک کر کر لیا تھا۔ وہ بلی کی طرح دبے قدموں اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کمرے سے شراب کے نشے میں مست آوازیں اب اسے جذباتی سنائی دینے لگی تھیں۔ کبھی کبھی مردانہ قہقہوں کے ساتھ نسوانی چیخ نما ہنسی بھی ابھر رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ غدار اندر داد عیش دے رہا ہے۔

ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے کچھ سوچا پھر خنجر کو جو اس نے ہاتھ میں تھام رکھا تھا دوبارہ اپنی لمبی گرم جراب میں اڑس لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ریوالور کو ہاتھوں میں تول رہا تھا۔ اچانک آسمان پر بادل زور سے دھاڑے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ جوش انتقام سے اس کے سانسوں کی ترتیب بگڑنے لگی تھی۔ اس نے منہ کے ذریعے دو تین لمبے لمبے سانس باہر پھینک کر خود کو نارمل کیا۔

دروازے پر اس نے اتنی زوردار لات مار کر اسے کھولا تھا کہ اس کی چٹخنی ٹوٹ گئی۔ اندر چن زیب اور ایک فوجی صوفے کے سامنے میز پر ـــــ شراب کی بوتل رکھے بیٹھے تھے جو قریباً خالی ہو رہی تھی۔ ایک آدھ بدحواس لڑکی ان دونوں کے درمیان بیٹھی تھی جس کی آنکھیں شیرو کو دیکھتے ہی خوف سے پھٹ چلی تھیں اور چیخ اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی تھی۔

چن زیب کا نشہ شیرو پر نظر پڑتے ہی ہرن ہو گیا جس کے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کی نالی اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"تت..... تت..... تم۔" اس پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

"کک..... کک..... کون ہو تم؟" فوجی افسر خوف سے منجمد ہو چلا تھا۔

HBC

"کوئی آواز منہ سے نہ نکالنا۔" شیرو پھنکارا۔ اس کی لہو بھری آنکھیں چن زیب کو اپنے سینے میں دھنستی محسوس ہو رہی تھیں۔

تینوں لرز کر رہ گئے۔

"تم۔" اس نے لڑکی کی طرف ریوالور کی نال سے اشارہ کیا۔ "اٹھو اور اپنے کپڑے پہن کر سامنے دیوار سے لگ کر کھڑی ہو جاؤ۔"

لڑکی ڈگمگاتے قدموں سے اپنے کپڑوں تک پہنچی۔ کپڑے پہنتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی لمحے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔ اس نے جیسے تیسے کپڑے پہنے اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اپنے حلق کو تر کرنے کے لیے اسے بار بار تھوک نگلنا پڑتا تھا۔

"تم میجر خندن ہو؟" شیرو نے کمرے میں ایک کھونٹی سے لٹکی فوجی جرسی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے فوجی کو مخاطب کیا۔

"شیرو ـــــ دیکھو....." میجر کی بجائے چن زیب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

"بکو مت۔" شیرو دھاڑا۔ وہ چن زیب کو آواز نکالنے کی مہلت بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔

چن زیب سہم کر خاموش ہو گیا۔

"بیوقوف مت بنو جوان۔" اس کا مخاطب بہرحال آرمی انٹیلی جنس کا میجر تھا۔ جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا دے لیا۔ "تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے۔ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دو۔ میں....."

"میں جہاں سے بچ کر آ گیا ہوں' وہاں تم نے اس غدار کی مخبری پر بہت فوج بھیجی تھی مجھے مارنے کے لیے۔" شیرو اس کی بات کاٹ کر غرایا۔ "میجر تم کو بہرحال مرنا تھا جلد یا بدیر۔ کیونکہ تمہارے ہاتھ بہت سے بے گناہوں کے خون سے رنگے ہیں۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔" میجر کو واقعی غصہ آ گیا۔

"ہاں اور میرے پاگل پن کا شکار تم چن زیب سے بھی پہلے بنو گے۔ میں تم دونوں کو مار ڈالوں گا میجر خندن۔ صرف یہ فاحشہ تمہاری کہانی سنانے کے لیے زندہ رہے گی۔" وہ غصے سے بری طرح کھول رہا تھا۔

پھر اتنی زور سے دھاڑا کہ شیرو کے ریوالور سے نکلنے والی گولی کی آواز بھی اس میں دب کر رہ گئی۔ میجر خندن نے اپنے سامنے رکھی میز کو پاؤں مارنے کی کوشش کی تھی۔ وہ شیرو کی آنکھوں کا نشانہ بنانا چاہتا تھا۔

گولی اس کے ماتھے سے دو انچ کے فاصلے میں دونوں آنکھوں کے بالکل درمیان لگی تھی۔ شیرو کے

نشانے کے متعلق چن زیب کو کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ میجر نے شاید اسے کوئی عام سا بدمعاش ہی سمجھا تھا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ خون کی ایک کیر اس کے ماتھے سے پھوٹی اور وہ آگے کو جھک کر میز پر گر پڑا۔ پھر ایسے جیسے اس نے پہلے پہلو بدلنے کے لیے اپنا سر میز پر ٹکا دیا ہو۔ ڈکرائے ہوئے کمرے کی طرف اس نے آخری سرسراہٹ کی کوشش کی تھی لیکن دوبارہ اسے اپنی گردن موڑنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ اس مرتبہ شیرو نے اس کا کھوپڑا دھماکے سے گرا اور بے ہوش ہو گئی۔ شیرو نے اس کی طرف مڑ کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ وہ اب براہ راست چن زیب کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا جس کا چہرہ خوف سے بتا چکا تھا اور خون کی ایک رمق بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"م..... مجھے..... مجھے معاف کر دو۔" وہ گھگھیانے لگا۔

"شٹ اپ!" شیرو اتنی زور سے دھاڑا کہ ہال کی گنبد میں بھی اس کی آواز گونجیں تھی۔ "تم ناقابل معافی ہو۔ تمہیں خدا بھی معاف نہیں کرے گا۔ ذلیل ـــــ غدار!" میں تمہیں اذیت ناک موت ماروں گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔" اس نے پستول اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال کر نبی خان کا دیا ہوا خنجر نکال لیا تھا۔ خنجر شیرو کے ہاتھ میں دیکھ کر خوف اور دہشت سے چن زیب کی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔

"اٹھو ـــــ اس طرف آؤ۔" اس نے چن زیب کو کمرے کی خالی سمت اشارہ کیا اور وہ خوف سے تھرتھراتا اس کے حکم کی پابندی کرنے لگا۔ ابھی اس نے چند قدم ہی اٹھائے تھے جب اچانک شیرو اپنی جگہ سے اسپرنگ کی طرح اچھل کر اس کے پہلو میں آ گیا اور اس سے پہلے کہ چن زیب کوئی مدافعت کرے' اس کے خنجر کے بھرپور وار نے چن زیب کی انتڑیاں باہر نکال دیں۔ اس کے بعد تو جیسے اس پر جنون طاری ہو گیا۔ اسے یاد بھی نہ رہا کہ اس نے چن زیب کو کتنے گھاؤ لگائے تھے۔ چن زیب کی چیخوں نے آہستہ آہستہ دم توڑنا شروع کر دیا تھا۔ لڑکی کو ہوش آ چکا تھا' لیکن سامنے کا منظر دیکھنے کی تاب اس میں نہیں تھی۔ اس کے حلق سے بڑی بے ہنگم اور ڈراؤنی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر منہ زانوں میں چھپا لیا تھا۔

شیرو جب چن زیب سے الگ ہوا تو اس کی لاش ناقابل شناخت ہو چکی تھی۔ شیرو کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ اس کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ اس نے غصے سے ہانپتے ہوئے بھی چن زیب کی لاش کو ٹھوکر ماری اور اس پر تھوک کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

مجرا ابھی تک مضبوطی سے اس کے ہاتھ میں تھا۔ شیرو نے ایک نظر خنجر کے دستے پر بنے "شاہین" پر ڈالی۔ یہ "صاعقہ" کا امتیازی نشان تھا اور اسے چن زیب کی لاش پر پھڑکتے دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔

اب اسے آہستہ آہستہ قرار آنے لگا تھا۔ چن زیب کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے اسے ایک عجیب سا روحانی سکون محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے اپنے اوپر پڑا منوں بوجھ اتار کر پھینک دیا ہو۔ وہ ایک آگ سی جو شام سے اب تک اس کے اندر مسلسل دہک رہی تھی چن زیب کے خون کے چھینٹوں نے اس پر شبنم کا کام کیا تھا۔

اچانک ہی آسیہ اور اس کی بچی کے خون میں نہائے ہوئے لاشے اس کے سامنے سوال بن کر آن کھڑے ہوئے اور اس کی دہکتی آنکھوں سے گرم آنسوؤں کے دھارے نکل کر اس کے چہرے پر پھیلنے لگے۔ جلد ہی وہ نارمل ہو گیا۔

اس نے لڑکی کو دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہونے کو کہا اور باتھ روم کے کھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اپنا پستول اور گولیاں ایک طرف رکھ کر اس نے اپنے کپڑے چند لمحوں میں اتار دیئے تھے۔ بمشکل دو منٹ بعد وہ اپنا منہ ہاتھ دھونے سے فارغ ہو گیا تھا بظاہر اب اس کے جسم پر خون کا کوئی دھبہ نہیں رہا تھا۔ الماری سے کپڑوں کا ایک جوڑا نکال کر اس نے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور باہر نکل آیا۔ لڑکی کو اس نے باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔

کمرے میں رک کر اس نے کپڑوں کے اوپر میجر کا ویسٹ کوٹ پہنا۔ ٹوپی سر پر جمائی اور اس کے کپڑوں کی تلاشی لینے سے جو چابیوں کا گچھا برآمد ہوا تھا' اسے ہاتھ میں تولتا باہر نکل آیا۔ دوسرے ہی لمحے باہر کھڑی میجر شنڈن کی جیپ میں وہ اڑا چلا جا رہا تھا۔ ہری پربت اور بڈگام وادی سے گزرتا وہ اس سڑک پر آ گیا تھا جو سری نگر کو سورہ سے ملاتی تھی۔ جھیل کے کنارے جیپ روک کر اس نے چند لمحے کچھ سوچا' پھر جیپ کو پہلے گیئر میں ڈال کر پہاڑی سلسلے پر اوپر ہی اوپر چڑھنے لگا۔ ایک جگہ رک جیپ روک کر وہ باہر نکل آیا۔

انجن اسٹارٹ تھا جب اس نے گیئر دبا دیا۔ جیپ کو جھٹکا لگا اور وہ لڑھکنیاں کھاتی سینکڑوں فٹ نیچے جا گری۔

"اس نے اپنا خونیں چہرہ چٹانوں کی اوٹ سے باہر نکالنا شروع کر دیا تھا جب وہ پہاڑوں سے اترتا ہوا بنے گاؤں نیل مل کے ایک دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دروازہ درمیانی عمر کے ایک شخص نے کھولا تھا۔ شیرو پر نظر پڑتے ہی وہ چونکا' پھر سنبھل گیا۔

"اندر آ جاؤ ——!" اس نے شیرو کو اشارہ کیا۔ وہ اس کا ساتھی جمال تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے دوبارہ کنڈی لگا کر دروازہ بند کر دیا۔ شیرو اس دوران ایک چارپائی پر ڈھیر ہو چکا تھا۔

جمال نے صرف ایک ہی نظر اس کی طرف دیکھا تھا اور آنکھیں جھکا لیں۔

"مجھے تمام حالات کا کل ہی علم ہو گیا تھا شیرو۔" اس نے اپنی عادت کے مطابق دھیمے لہجے میں بولتے ہوئے کہا تھا۔ "افسوس ہم بالآخر اپنوں ہی کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے۔ مجھے تمہارے دکھ کا احساس ہے شیرو۔ میں ہی جانتا ہوں یا پھر خدا کی ذات کہ جب اسی طرح ظالموں نے میرے جوان بیٹے اور اس کی ماں کو مار ڈالا تھا' لیکن میرے دوست آزادی کے لیے ——"

"چپ ہو جاؤ جمال۔" شیرو نے تڑپ کر اس کی بات کاٹ دی۔ "کس آزادی کی بات کرتے ہو جو کبھی ہمارے مقدر میں نہیں تھی جمال۔ جب اپنے اپنوں کو کھانے لگیں' جب گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے پر تلا ہو محض چند ٹکوں اور اقتدار کے لیے' جب ہم خود ہی اپنی غیرت کو بیچنے لگیں تو آزادی کیسی؟ یہاں کس کی حکومت ہے؟ کون حکمران ہے ہمارا؟ کس نے ہاتھ مضبوط کر رکھے ہیں برہمنوں کے؟ نہیں جمال نہیں۔ یہ سب فراڈ ہے —— سب لٹیرے ہیں۔"

"میں تمہارے لیے ناشتے کا بندوبست کروں۔" جمال کے پاس اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

قہوے کی پیالیاں دونوں کے آگے رکھی ہوئی تھیں' شیرو نے جمال کو اپنی ساری کہانی سنا دی تھی۔

"میں پاکستان جا رہا ہوں۔" اس نے سگریٹ کا کش لگا کر جمال کی آنکھوں میں جھانکا۔

"مجھے علم ہے اب تم یہاں ایک پل رکنا گوارہ نہیں کرو گے۔" جمال بولا۔ "شیرو! کوئی طاقت مجھے بار بار اس بات کا یقین دلاتی تھی کہ تم زندہ ہو' میں کل ہی چلا جاتا لیکن میں شاید لاشعوری طور پر تمہاری ہی آمد کا منتظر تھا۔ میں نے آج سے دو سال پہلے نبی خان کو کہہ دیا تھا کہ یہ زمین اب غیرت مندوں پر تنگ ہونے لگی ہے' لیکن میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرا نام بزدلوں یا بھاگ جانے والوں کی فہرست میں آئے۔ میرا اب یہاں ہے ہی کیا؟ بیٹا تھا' بیوی —— اب تو دونوں ہی نہ رہے ——" وہ ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو رہا۔

دونوں دوست کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ دونوں نے شام ڈھلنے پر یہاں سے نکلنے کا پروگرام بنایا تھا۔ منصوبے کے مطابق جمال کو بارہ مولا کے راستے سرحد عبور کرنا تھی اور

شیرو نے جموں کی طرف نکلنے کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ آزاد کشمیر کے بجائے پنجاب کو اپنا مسکن بنانا چاہتا تھا۔ شام ڈھلے وہ دونوں اس گھر سے چھپتے چھپاتے باہر نکل آئے۔

"شیرو! تم سے بحث کرنا فضول ہے کیونکہ تم نے زندگی بھر کسی کو اپنے فیصلوں میں شریک نہیں کیا' لیکن بہتر ہوتا اگر ہم اکٹھے سفر کرتے۔" جمال نے ایک جگہ رکتے ہوئے کہا۔

"نہیں جمال!" شیرو نے کہا۔ "یہ امر خطرے کا باعث ہو گا۔ وہ لوگ سورہ تک جیپ کے تعاقب میں آئیں گے اور یہاں کی سیکورٹی بھی جلدی ہوشیار ہو جائے گی۔ تم ابھی ان بھیڑیوں کی نظر میں نہیں آئے جب کہ میری بات اور ہے۔ میں ان کو اپنے پیچھے لگا کر سری نگر تک واپس لے جاؤں گا۔ اس کے بعد میں فرار کے لیے شاید کوئی اور بارڈر منتخب کروں گا۔"

گاؤں کے باہر ایک پہاڑی کے دامن میں جہاں سے دو راستے متضاد سمتوں کو پھوٹتے تھے' وہ رک گئے۔

"جمال! میری بڑی خواہش تھی کہ یہ جنگ کسی کے ہاتھوں میں منتقل کر کے یہاں سے رخصت سفر باندھتا۔ میں جانتا تھا کہ میری زندگی میں ممکن ہے' کشمیر آزاد نہ ہو لیکن اگلی نسل کو ہم آزاد زندگی اور محفوظ مستقبل دے کر جائیں گے....." شیرو اپنی بات مکمل نہ کر پایا۔ اس کا گلا رندھ گیا۔

"خدا حافظ میرے دوست! الوداع۔ میں خدا سے دعا گو ہوں کہ پاکستان میں تمہاری دوستی مجھے نصیب رہے۔" جمال کے لیے یہاں مزید ایک پل رکنا بھی ناممکن تھا۔

"فی امان اللہ!" شیرو کے ہونٹ کپکپائے اور وہ آگے بڑھ گیا۔

کافی دور جا کر اس نے پلٹ کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا دوست بارہ مولا کی طرف جا رہا تھا۔ "خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے!" اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی منزل کی طرف ہو لیا۔

☆○☆

سری نگر چھوڑنے سے پہلے شیرو نے آسیہ کے بھائیوں سے ملاقات کر لی تھی۔ وہ لوگ اس کے دکھ درد بانٹنے کی آرزو رکھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ شیرو بھارت کے کسی دوسرے صوبے میں رہائش اختیار کر لے۔ وہ اسے مکمل تحفظ کے ساتھ کاروبار کروانا چاہتے تھے' لیکن جب شیرو نے انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو ایک لفظ بھی اس کی مخالفت میں

کسی کے منہ سے نہ نکل سکا۔ یہ ان لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ آسیہ کی چتا کی راکھ ان کے ہاتھ نہیں کر سکتے تھے ورنہ اب تک وہ زندہ درگور ہو چکے ہوتے۔

"شیرو بھائی" آسیہ کے بڑے بھائی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہم تمہارے فیصلے پر اس لیے تو خوش ہیں کہ تم کم از کم ان درندوں سے محفوظ رہو گے لیکن جب تمہاری جدائی کا تصور کرتے ہیں تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ ہمارے پاس ایک تم ہی تو ہو۔ آسیہ اور عائشہ کو تو....." وہ سسک پڑا۔

شیرو نے اسے گلے سے لگا کر تسلی دی۔

"شیرو!" جلد یا بدیر بالآخر ہمیں بھی پاکستان جانا پڑے گا۔ خدا کرے ہم کو اکٹھے ہی جانیں۔" اس نے دم رخصت شیرو سے کہا اور اس کے اصرار کے باوجود زبردستی ایک تھیلا رقم اس کے حوالے کر دی۔

"یہ آسیہ کا حصہ تھا۔ ہم پر حرام ہے۔" آسیہ کے بھائی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

سری نگر سے جموں تک کا سفر اس نے برہمن کے روپ میں کیا تھا اور راستے میں اپنے اکثر ساتھیوں سے ملتا آیا تھا۔ کسی نے اس کے فیصلے کو سراہا اور کسی نے خاموشی اختیار کرنی لیکن اس کے فیصلے پر تنقید کسی نے بھی نہ کی۔ وہ سب شیرو کے قد سے بخوبی آگاہ تھے اب بھی ان میں زیادہ تعداد انہی افراد کی تھی جنہوں نے اپنی زندگیاں مشن و ملت کے لیے وقف کر رکھی تھیں اور وہ جیتے جی کشمیر سے لڑنا گوارا نہیں کرتے تھے۔

شیرو نے کسی سے بحث نہ کی' کسی کو اپنے حق میں دلائل نہ دیئے۔ بس ایک دیرینہ رفیق کار کی حیثیت سے اس نے ان سب سے آخری مرتبہ ملنا مناسب سمجھا۔ اب جانے زندگی میں دوبارہ ان سربلندوں سے ملاقات ہو یا نہ ہو۔

☆○☆

اسے سری نگر سے چلے ایک ماہ ہونے کو آیا تھا اور آج وہ جموں کے ایک ہوٹل میں بیٹھا اس بات پر مغز کھپا رہا تھا کہ سرحد کہاں سے عبور کی جائے۔ یہ ہوٹل جموں شہر کے لاری اڈے کے نزدیک ہی بنا ہوا تھا اور زیادہ تر اس راستے پر سفر کرنے والے مسافر ہی یہاں قیام کیا کرتے تھے۔

ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد وہ کھانے کا بل ادا کر کے باہر نکل رہا تھا کہ ایک چہرے پر نظریں پڑتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے سے آنے والے نے بھی یہی عمل دہرایا تھا۔ شیرو سے بمشکل پانچ سات قدم آگے نکل کر وہ رک گیا۔ دونوں نے ایک ساتھ ہی مڑ کر

گاؤں پہنچتے ہی وہ گہری نیند سو گیا اور سہ پہر کو اس کی آنکھ گاؤں کی مسجد سے بلند ہونے
والی اذان کی آواز سے کھلی۔

دن ہفتوں' مہینوں اور سالوں میں بدلتے چلے گئے۔ وہ شیر محمد سدھن سے اب "شیرو
ڈکیت" بن چکا تھا۔ دولت اس کے گھر کی باندی تھی۔ وہ ملک کے کونے کونے میں گھوما'
لیکن کبھی اس نے جہلم کے پانیوں کی پرلی طرف نہ جھانکا۔ اس کے ساتھی حیران تھے کہ اس
نے مقامی کمینوں والی کوئی بھی "بد عادت" نہیں اپنائی تھی۔

شوکت کئی مرتبہ بضد ہوا کہ وہ شادی کر لے' لیکن اس نے شادی نہ کی۔ پھر وہ دن بھی
آ گیا جب شوکت سرحدی پولیس کی گولی کا نشانہ بن گیا اور اب وہ اکیلا اس ڈیرے کا مالک
تھا۔ شوکے کی موت نے اسے ایک مرتبہ پھر دکھی کر دیا' لیکن اب تو جیسے اسے جینے کا ڈھنگ
آ گیا تھا۔

اس کے معمول میں صرف ایک تبدیلی آئی تھی۔ اب وہ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ہی
خود سرحد عبور کرتا تھا۔ اس کا سارا کام اس کے کارندوں نے سنبھال رکھا تھا۔

کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ آزاد کشمیر جائے اور شرفو اور زہراں کو دیکھے' لیکن اس سوچ
کے ساتھ ہی بے نام سے خوف کی پرچھائیاں اس کے ذہن پر لرزنے لگتیں۔ دو تین مرتبہ تو
وہ منگلا تک جا کر واپس آیا تھا۔ اسے ایک ہی خدشہ وہاں جانے سے روکے ہوئے تھا۔ وہ
سوچتا: "خدانخواستہ اس کی اچانک آمد کہیں دونوں کو پشیمانی میں مبتلا نہ کر دے؟" وہ نہیں
چاہتا تھا کہ شرفو اور زہراں کی زندگیوں پر اس کی وجہ سے ایک لمحے کو بھی یاسیت طاری ہو۔

——اس دوران اسے دو تین واقف کاروں سے دونوں کی خیریت کی اطلاع ملتی رہی
تھی۔ اس نے سن لیا تھا کہ شرفو پاکستانی فوج کا کیپٹن بن چکا ہے اور زہراں دو بیٹیوں کی
ماں۔

☆○☆

ایف آئی یو کے کیپٹن اشرف خان کے سامنے شیرو کی تصویر رکھی تھی جس کے ساتھ
مقامی صوبے دار کی رپورٹ موجود تھی کہ اس علاقے میں کام کا آدمی صرف شیرو ڈکیت ہے
اور شرفو دیوانوں کی طرح ٹکٹکی لگائے تصویر کو گھور رہا تھا۔

"شیرو! تم زندہ تھے۔ تم نے کتنا ظلم کیا شیرو۔" آہستہ سے تصویر کو گھورتے ہوئے وہ
بڑبڑایا۔

جب اس کا اردلی صاحب کے لیے چائے لے کر اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس

کے صاحب کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ وہ حیران رہ گیا۔ کیپٹن صاحب کو [illegible]
لیکن دوبارہ وہ اپنے صاحب کے چہرے کو دیکھنے کی ہمت نہ کر [illegible]
آیا۔

اگلے روز شام تک اس کے پاس شیرو کی "تمام [illegible]
گئے تک وہ کروٹیں بدلنے کے بعد ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے [illegible]
کروا دی تھی کہ وہ شیرو کو ضرور کام کے لیے تیار کرے گا۔

"یہ ملک کے لیے بہت بڑی خدمت ہو گی کیپٹن۔" میجر حسن صاحب نے گرمی سرداں سے
ابھر کر روانگی کے وقت اسے کہا تھا۔

اور آج ۱۵ مئی ۱۹۶۵ء کو وہ یہی مشن لے کر اپنے دوست سے ملنے آیا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی کہانی سنا رہے تھے اور —— کیپٹن اشرف خان وقت کی
ستم ظریفی پر حیران تھا کہ وہ شخص جس نے اسے اور اس جیسے کتنے اور نوجوانوں کو آزادی کی
راہ دکھائی تھی۔

——جس کا خاندان پچھلی تین نسلوں سے کشمیر کے لیے اپنا خون بہاتا چلا آ رہا تھا۔ وہی
شیر محمد سدھن اس کے سامنے شیرو ڈکیت بن کر بیٹھا ہوا ہے۔

اس کی کہانی میں کئی ایسے موڑ آئے تھے کہ شرفو کا دل بھر بھر آیا' لیکن اس نے بطور
فوجی شیرو کے سامنے آنسو بہانا بزدلی سمجھا۔ وہ جان چکا تھا کہ ایسے حالات جن سے گزرش
وقت نے اس کے دوست کو ٹکرایا تھا کسی کو بھی باغی کر دینے کے لیے کافی تھے —— اس
کا دوست مجاہد سے ڈاکو یونہی نہیں بن گیا تھا۔ وہ تو اپنے اندر بہتے لاوے کو نہیں کی رلو دیکھ
رہا تھا جو آگ اس کے سینے میں بھڑک رہی تھی' وہ اسی کو ہتھیار بنا کر سارے کشمیر کو جلا کر راکھ
کر سکتی تھی۔

"مجھے کہنا تو نہیں چاہیے شیرو بھائی۔" کیپٹن اشرف نے لمحہ بھر کی آہ بھری۔ "میں تو کبھی
تم سے بحث نہیں کیا کرتا تھا۔ یوں بھی تم نے زندگی میں اپنی ہر بات مجھ سے منوائی ہے'
لیکن شیرو بھائی میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تم نے ہمارے ساتھ بہت ظلم کیا —— بہت
ظلم کیا تم نے ہمارے ساتھ۔ میں کیا جواب دوں گا زہراں کو —— کیا بتاؤں گا اسے؟"

"شرفو! حالات نے موم کی گڑیا کی طرح میری ناک جس طرف چاہی گھما دی۔ میں تو
ہمیشہ سے وقت کی ٹھوکروں میں رہا ہوں اور آج بھی گردش حالات نے مجھے [illegible]
سامنے پھینک دیا ہے۔ میں واقعی تمہارا گنہگار ہوں لیکن خدا میرا [illegible]

اللہ کا سپاہی

جس تپش کو محسوس کرتے ہوئے چارسدہ (صوبہ سرحد) کے اس سادہ لوح پٹھان ——
جنرل طارق نے ساحل کشمیر پر قدم رکھا تھا۔
—— اس حرارت کو برسراقتدار طبقہ سمجھنے سے یکسر قاصر تھا۔
وہ کوتاہ اندیش محض اقتدار کی جنگ لڑنا جانتے تھے —— اپنی کرسی کی حفاظت کے لیے
تو وہ ہر قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔
جب سینڈ ہرسٹ ملٹری اکیڈمی (انگلستان) کے اس گریجویٹ نے مڑ کر دیکھا تو وہ تنہا
تھا —— بالکل اکیلا!
اور —— وقت اس کی تنہائیوں میں اضافہ ہی کرتا چلا گیا۔ اس کے ساتھی کٹتے
گئے —— اور کسی نے اس کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش بھی نہ کی۔
کشمیر ہمیشہ ایک سلگتا ہوا سوال بن کر برصغیر کے ماتھے پر دھکتا رہا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد سے
دونوں ملکوں کی حکومتیں یہی سمجھنے لگی تھیں کہ اب کشمیر کا مسئلہ شاید ختم ہو گیا ہے، لیکن وہ
بھول رہے تھے کہ تاریخ اپنا عمل دہراتی ہے اور دبی چنگاریاں کبھی نہ کبھی بھڑک کر شعلوں کا
رُوپ ضرور اختیار کرتی ہیں۔ قائداعظمؒ نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ کہا تھا۔ اس میں
مبالغہ بھی نہیں کہ اگر یہ شہ رگ کٹ جاتی تو پاکستان کی شریانوں سے خون کا ایک ایک قطرہ
نچڑ جاتا۔ کشمیر کی پہاڑیوں سے اترنے والے دریاؤں کے سوتے اگر پاکستان کے لیے خشک کر
دیئے جاتے تو اس کی ہریالی کو موت آ جاتی۔
کشمیر پاکستان کے لیے ناگزیر تھا ——!
اس حقیقت کو پاکستانیوں سے زیادہ کشمیری عوام نے محسوس کیا —— ان مظلوموں کو
ہمیشہ یہی امید رہی کہ پاکستانی کبھی نہ کبھی ان کی مدد کو ضرور آئیں گے، لیکن وہ دن شاید ان
کا پھر مقدر نہ بن سکا اور کشمیر میں حالت تنگ آمد بجنگ آمد پر پہنچ گئی۔
جلد ہی خبریں ملنے لگیں کہ کشمیر میں کفن بردوش مجاہدین زیر زمین روبہ عمل ہیں۔

☆○☆

محسوس کیا جانے لگا کہ وہاں "ڈرٹی زمین" پہلے سے

۱۹۹۴ کے آخری مہینوں میں یہ معروف عمل تحریکوں نے اب مکمل کر سامنے آنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ خصوصاً "حزب
بل" کے جنگجوؤں نے ایسی خطرناک صورت اختیار کی کہ مقبوضہ کشمیر کے بچے بچے سے
آزادی کے نعرے گونجنے لگے اور انہی نعروں کی گونج میں پاکستان میں ایک منصوبہ
"آپریشن جبرالٹر" ترتیب دیا گیا۔

اس منصوبے کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی تھی کہ جیسے ہی پاکستانی کمانڈوز جنہیں
مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو کر گوریلا نوعیت کی کارروائیاں پہلے سے معروف عمل مجاہدین کے
ساتھ مل کر انجام دینی تھیں، کو چند کامیابیاں نصیب ہو گئیں تو عام کشمیری بھی اس "بغاوت"
میں عملاً شامل ہو جائیں گے۔

——اور اس سلسلے میں اس وقت کے وزیر خارجہ کی یہ یقین دہانی موجود تھی کہ امریکہ
بہادر نے ضمانت دی ہے کہ اگر بین الاقوامی سرحدوں (سوائے حد متارکہ جنگ کشمیر) پر کوئی
ہنگامہ پاکستان نہ کرے تو بھارت کبھی پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا۔

——ابتدا ہی میں جب اس منصوبے کے لیے کارفرما نفری کا جائزہ لیا گیا تو دو نئے
ڈویژن کھڑے کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، لیکن ایک سازش کے تحت وزارت خزانہ نے
اس مد میں فنڈ فراہم کرنے سے معذرت کر دی۔

نامکمل اسباب کے باوجود بہرحال اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کیا گیا اور ان
تین مرحلوں میں آپریشن جبرالٹر ترتیب پایا۔

۱۔ Deep Peneteration Force. اس "فورس" کو یہ فرض سونپا گیا کہ کمانڈوز
چوری چھپے "سویلین راہبروں" کی راہنمائی میں مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو جائیں۔ ہر ٹولی
اپنے تین تین چار چار "آرمز" اور ایمونیشن بھی لے کر جائے گی جو سری نگر پہنچ کر انہوں
نے میرواعظ کشمیر (جن کے دعوؤں پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ سارا منصوبہ ترتیب دیا گیا تھا۔)
اور ان کے پہلے سے معروف عمل ساتھیوں کو پہنچانا تھا۔

اس "فورس" میں موجود کمانڈوز کو سری نگر میں موجود حریت پسند کشمیری مجاہدین کے
ساتھ مل کر ان کے لیے "منصوبہ بندی کے مرکز" اور "راہنمائی کرنے والوں" کا کردار ادا
کرنا تھا۔

۲۔ دوسری "فورس" کو Medium Penetration Force. کا نام دیا گیا۔ اس

"فورس" کو "پہلی فورس" اور اپنے درمیان رابطے اور ہنگامی ضروریات کے لیے سامان کا
فرض لوا کرنا تھا۔ اس "فورس" نے بھی کشمیر کے کافی اندر تک گھس کر کام کرنا فرض
کرنا اور دونوں روپہ عمل فورسز کے لیے ایک طرح سے "ہیڈ کوارٹر" کی حیثیت اختیار کرنا
تھی۔

۳۔ "تیسری فورس" نے بھی کشمیر کے کافی اندر تک گھس کر کام کرنا فرض
تھی۔

☆○☆

جنوری ۱۹۹۵ء میں آپریشن پر عمل شروع ہوا اور دو سرے مہینے کے لیے منتخب
یونٹ مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو گئے۔ اس سے پہلے "فورس نمبر ۲" کے بہادر لڑکوں کی ٹیم
میں مقبوضہ کشمیر میں کافی اندر تک گھس چکے تھے۔ ان کے ساتھ "معمولی گڑبڑ" یہ ہوئی کہ
ان میں سے کچھ لڑکوں کا "بھاری جنگی سامان" نظروں میں آ گیا۔ یوں بھی اس سامان کا
پوشیدہ رہنا ناممکن تھا۔

اس سامان کی اطلاع "مقامی مخبروں" نے انڈین انٹیلی جنس کو کر دی اور ان کی توقعات
کے بالکل برعکس ابتداء ہی میں انہیں بھارتی فوج نے گھیرے میں لے لیا۔

آفرین ہے ان جیالوں پر کہ وہ کسی بھی مشکل کو خاطر میں نہ لائے اور لڑتے بھڑتے کسی
نہ کسی طرح اپنی منزل یعنی سری نگر پہنچ گئے جہاں کشمیر کی تحریک کا سب سے حسین ذائقہ
ان کا مقدر بنا۔ جب انہوں نے میرواعظ کشمیر سے رابطہ پیدا کیا تو اس نے نہ صرف خود
اسلحہ وصول کرنے اور پہنچانے سے انکار کر دیا بلکہ انہیں کسی بھی قسم کا تحفظ بہم پہنچانے سے
بھی معذوری ظاہر کر دی۔

لیکن کچھ غیرت مند ابھی باقی تھے۔ انہوں نے بڑا جرات مندانہ قدم اٹھایا اور اپنی اور
اپنے خاندانوں کی زندگی داؤ پر لگا کر پاکستانی کمانڈوز کی امداد پر تل گئے۔ اس سلسلے میں سری
نگر کے "بٹ مالو ایریا" (Butmalo Area) کے مجاہدین کو تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے
گی۔

——انہوں نے ان کمانڈوز کو اپنے گھروں میں پناہ دی اور چھپا لیا۔

کچھ ایسی ہی صورت حال کا سامنا "دوسری فورس" کو بھی کرنا پڑا، لیکن وہ ہر طرح کا
خطرہ مول لے کر "مقررہ علاقوں" تک بالآخر پہنچ گئے اور یوں مقبوضہ کشمیر کے اندر پاکستانی
کمانڈوز اور بھارتی فوج میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔

بھارتی وزیراعظم نے اس مرحلے پر بیان بازی کا ایک سلسلہ شروع کر دیا اور بالآخر اسے

HBC

یہ دھمکی بھی دیا کرتی کہ اگر پاکستانی کمانڈوز مقبوضہ کشمیر سے باہر نہ نکلے تو وہ اپنی مرضی کا موسم
کھول دے گا۔
——اس دھمکی کا واضح مطلب یہی تھا کہ ——— اب بھارت رن کچھ اور کشمیر کا بدلہ
لینے کے لیے مغربی محاذ پر حملہ کرے گا۔
——اور اس کے ساتھ ہی اس کی فوج نے بڑی تیزی سے مغربی سرحدوں کا رخ کر
لیا۔

☆○☆

= مسئلہ پاکستانی کابینہ میں زیر بحث آیا تو ایک مرتبہ پھر وزیر خارجہ نے یقین دہانی کروائی
کہ ——— اگر پاکستان مغربی سرحدوں پر بھارت کے لیے اشتعال پیدا نہ کرے تو امریکہ اس
بات کی ضمانت دے رہا ہے کہ بھارت مغربی سرحدوں پر حملہ آور نہیں ہو گا اور امریکہ اسے
کسی بھی صورت میں بین الاقوامی سرحد عبور نہیں کرنے دے گا۔
اب اس مسئلے پر "سیاسی سیانے" سر جوڑ کر بیٹھے کہ بھارت کو کس طرح یقین دلایا
جائے کہ پاکستانی فوج "مغربی سرحدوں" پر اشتعال انگیزی نہیں کرے گی۔
پھر یہ "سیانے" خود ہی ایک فیصلے پر بھی پہنچ گئے اور مسلح افواج نے رن کچھ اور مقبوضہ
کشمیر کی صورت حال کے پیش نظر جو دفاعی اقدامات مغربی محاذ پر کیے ہوئے تھے انہیں ختم
کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
حکم جاری ہوا کہ سرحدوں کے ساتھ ساتھ (خصوصاً لاہور فرنٹ پر) بنائی گئی تمام
Forward Posts کو پیچھے ہٹا لیا جائے اور "متوقع حملے" کے علاقے میں جو بارودی سرنگیں
(مائنز) دشمن کی پیش قدمی روکنے کے لیے دبائی گئی ہیں' انہیں صاف کر دیا جائے۔
"———فارورڈ ایریا" کے کمانڈنگ آفیسر جو دشمن سے دو بدو جنگ کی آرزو نہ جانے
کب سے اپنے سینوں میں پروان چڑھا رہے تھے اور جنہیں گردش حالات نے بہ مشکل دل
کے ارمان نکالنے کا موقع بہم پہنچایا تھا' اس وقت سٹپٹا کر رہ گئے جب جنرل ہیڈکوارٹر سے
انہیں اس قسم کے سگنل موصول ہونے لگے:
"خبردار! کوئی ایسی حرکت نہ ہو جسے "اشتعال انگیز" قرار دیا جا سکے۔"
"" حیران ہوتے تھے کہ آخر اپنے ملک کی سرحدوں کے اندر کوئی دفاعی منصوبہ
"" سے دوسرے ملک کی فوجوں کو اشتعال کیسے آ سکتا ہے؟ بہرکیف ہائی کمان کی
"" سے بھارتی فوج کے لیے لاہور اور سیالکوٹ پر چڑھ آنے کے لیے میدان خود بخود

ہموار ہو گیا۔"

☆○☆

اگست کے اوائل ہی میں فورس نمبر ۲ نے جنرل اختر ملک کی کمان میں "کپرپشن" شروع
کیا اور کشمیر پر پہلا بھرپور وار پھمب کے ہائیں پہلو سے ہوا۔
———پاکستانی فوج نے بھارت کی "بے اینڈ کے" ۸ راجپوتانہ رائفلز کو Shera میں گھیر لیا اور
دشمن فوج کو رگیدتے ہوئے پاکستانی دستے "دیوا" پھمب "کھوڑا" کھوڑی اور "ہاجرہ" اپنی منزل
مقصود Red Hill تک بغیر کسی قابل ذکر نقصان کے پہنچ گئے۔ یہ فورس دریائے توی کے
کنارے کے ساتھ ساتھ پھیل گئی۔
۵ تا ۱۵ اگست کے درمیان یہ سارا علاقہ قبضے میں آ گیا۔ بھارت نے گورکھا بریگیڈ کے
ساتھ جوابی حملہ کیا' لیکن منہ کی کھا کر اپنے زخم چاٹنے پر مجبور ہو گیا۔ پاکستانی فوج کی اچانک
اور تیز یلغار نے بھارتی جوانوں کا مورال تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ان کا مورال بلند کرنے کے
لیے ہی بھارت کے مایہ ناز مونٹین ڈویژن کو کشمیر کی سرحد پر ڈپلائے کر دیا گیا——— بھارتی
سورما جانتے تھے کہ پاکستان کے پاس کوئی "مونٹین بریگیڈ" نہیں ہے۔
۲۵ اگست کی رات بھارتی توپ خانہ حرکت میں آیا اور اس نے درہ حاجی پیر' بھارت
گلی (ٹیٹوال سیکٹر) پر صرف بارہ گھنٹوں میں ۲۰ ہزار گولے داغ دیئے۔ اس اثناء میں پاکستانی
فوج "قلیل نفری" کا شکار ہونے لگی تھی اور مفتوحہ علاقوں پر کنٹرول برقرار رکھنے کے لیے
مزید نفری میسر نہیں آتی تھی۔ ٹیٹوال سیکٹر میں بھی صرف تین سو جوانوں کی ایک کمپنی باقی بچی
جس کے پاس اس شدید اور تباہ کن گولہ باری کا کوئی "عملی جواب" نہیں تھا۔
۲۶ اگست کو دشمن نے پورے بریگیڈ کے ساتھ اٹھنتری کا ایڈوانس کر دیا۔ ہراول میں
پیرا بٹالین تھی۔ دشمن اس رات بے پناہ جانی نقصان اٹھا کر قریباً پچاس ساٹھ گز ایڈوانس کر
گیا۔ ۲۷ اگست کی رات سکیم بدل کر دشمن نے رات ایک بجے حملہ کیا۔ اس مرتبہ دشمن
کے بریگیڈ کو پورے ڈویژن کے توپ خانے کی مدد حاصل تھی۔
آٹھ دن تک دشمن آتش و آہن کی مسلسل اور موسلا دھار بارش کرنے کے بعد بالآخر
درہ حاجی پیر اور بیڈوری کی چوکیوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لو صرف حالت یہ تھی کہ
پاکستانی پلاٹون میں سے جس کی نفری ۲۵ تھی' ۲۲ جوان شہید ہو چکے تھے۔
۳۰ اگست کی رات پونچھ کے شمالی پہاڑیوں سے دشمن کا توپ خانہ آگ برسانے لگا۔
اس نے "چاند ٹیکری" کو اپنی زد میں لے رکھا تھا۔ اس کا پاپن پونچھ کے شمالی حصے سے

ہوگا کہ تنہا "پر قبضہ کرنا تو بعید، دشمن کو اس سے کی جو لیست اگلے روز نوا کرنی پڑی اس
کا شمار کیا اس نے بھی نہیں کیا تھا۔
پھر خبر کی تہ تک پہنچے تو پاکستان ہوائوں کے قدموں تلے سسک رہی تھی۔ بھارتی
روئیے کو پیلور نے دوسرے دن کی خبر میں فراق کر دیا تھا۔
مقبوضہ کشمیر میں پاکستانی کمانڈوز کی مسلسل کامیابیوں سے تنگ آکر بھارت نے اقوام
متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ پاکستانی ہائی کمان نے حملوں کا سلسلہ
روک دیا۔ اس کے فوراً بعد تو ہم بھارتی ہوا کہ مقبوضہ علاقہ اسی طرح خاموشی سے خالی
کر دیا جائے جس طرح خاموشی سے اس پر قبضہ کیا گیا تھا۔ بادل نخواستہ اس عجیب و غریب
جنگ کی پسپائی میں ۲۸ اگست تک واپس اپنی سرحد پر پہنچ گئے۔

☆○☆

ابھی دو تین روز ہی گزرے تھے کہ ایک مرتبہ پھر ہاجی گڑھی میں لبل آیا اور یکم ستمبر کو
تہ ہوئی ہوا کہ پہلے سے خالی کیے گئے علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا جائے۔ اس مرتبہ "مکمل
گرفت" کرنے کی تاویل بھی میسر تھی۔
اس عجیب و غریب صورت حال نے جوانوں کو پریشان کر دیا۔ چوہے بلی کا جو کھیل ہائی
کمان ان کے ساتھ کھیل رہی تھی، اس نے فیلڈ ایریا میں موجود افسران کو چکرا کر رکھ دیا۔
انہوں نے دوبارہ حملہ کو تھو کے عالم میں کیا، لیکن دشمن بھی اب لنگوٹ کس کر میدان
میں آ چکا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے اپنی مورچہ بندیاں نئے سرے سے بہت مضبوطی کے
ساتھ ترتیب دی تھیں۔
پہلے سے خالی کردہ علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کیا حکمت عملی کارفرما تھی؟
——اس کی سمجھ کسی کو نہیں آ رہی تھی۔
——اگر دشمن کو ٹھنڈا رکھنا مقصود تھا تو قابض ہونے کی صورت میں اس نے طیش
کھا کر کب مغربی سرحدوں پر حملہ کر دیا تھا؟ اور پھر—— اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ وہ
پاکستانی فوج کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد اب اس کی مغربی سرحدوں پر حملہ نہیں کرے گا؟
ان سوالات کا جواب نہ تب کسی کے پاس تھا نہ اب ہے۔ ہوشیار اور تازہ دم دشمن پر
حملہ دو زانو ہوں کا کھیل نہیں ہوتا لیکن آفرین ہے ان جانبازوں پر کہ جو جان توڑ کر لڑے۔
دشمن کے چوکنا ہونے کے باوجود اس کی مورچہ بندیوں کے زخم کو اپنے قدموں تلے روندتے

ہوئے دوسری لائن پر آگے بڑھتے چلے گئے اور ہر حملہ آور جوان یہ قسم کھا رہا تھا
کہ واپس تک جا پہنچے۔

☆○☆

اس دوران ایک اور قیامت خیز لڑائی جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے چوہیں گھنٹوں کے لیے رک گئی۔ ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ اس علاقے میں کیا ٹینک کھل استعمال ہوئے ہیں؟
——اور بھاگتا ہوا دشمن اس عرصے میں کہاں کہاں مورچہ بندیاں مضبوط کرنے لگا۔
ان حالات میں کہ حملہ ہو چکا ہے اور کمانڈر کسی ایک "نکتہ" پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں
ضائع کر دیں (جبکہ ایک ایک لمحہ قیمتی ہو) ایسی کمزوریاں نصیب ہو جانا کون سی حیرت کی بات
نہیں تو اور کیا تھا؟
چوہیں گھنٹوں کے بعد ہائی کمان اس نتیجے پر پہنچی کہ ٹینک بھل استعمال ہو سکتے ہیں،
حالانکہ میدانی کمانڈروں نے پہلے ہی روز اس بات کی تصدیق کر دی تھی۔
——چنانچہ ٹینک میدان کارزار میں لائے گئے، لیکن اب مقصد یہ حاصل کرنا قریباً
ناممکن ہو گیا تھا کیونکہ ۲۴ گھنٹوں میں جو نقصان ہم نے اٹھایا تھا اب نقصان کم ہونے کے
بجائے
اور یہ سب کچھ کون اور کیوں سرانجام دے رہا تھا——؟ شاید تاریخ کے اوراق کسی
اس راز کو اگل سکیں۔ فی الحال ہر کوئی خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔ البتہ یہ بات ہم ضرور
بتانا چاہیں گے کہ اس پر ہی بس نہ کیا گیا بلکہ برسرپیکار افواج کا سربراہ تبدیل کرنے کی ایک اور
سازش بھی کی گئی، وہ یہ کہ—— آپریشن کمانڈر جنرل اختر حسین ملک سے کمان واپس لے
لی گئی اور جنرل یحییٰ اس کی بجائے نئے کمانڈر بن گئے۔
موصوف نے آتے ہی مزید ایک دن "سوچ کی حکمت عملی" کو سوچنے میں ضائع کر دیا اور
ان کے اس فیصلے نے میدان کارزار میں لڑتی افواج پر نہایت منفی اثرات مرتب کیے اور
حملے میں سست روی آ گئی۔
لیکن اس سب کچھ کے باوجود کچھ میدانی کمانڈروں کی انفرادی مہارت اور جوانوں کا جذبہ
حریت رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ وہ دشمن کو کاٹتے ہوئے ۵ ستمبر کو اکھنور کے بہت نزدیک تک
جا پہنچے اور پھر ۶ ستمبر کا دن اکھنور پر حملے کے لیے مقرر ہوا۔

پلان یہ تھا کہ اکھنور کی سڑک پر قبضہ کر کے دشمن کی سپلائی منقطع کر دی جائے اور اس کا رابطہ جموں کشمیر (مقبوضہ) سے بالکل کاٹ دیا جائے۔

لیکن یہ خواب ادھورا ہی رہا۔

بھارت کے لیے سوائے اس کے اب کوئی اور چارہ نہ رہا تھا کہ وہ مقبوضہ کشمیر پر پاکستانی فوج کی یلغار روکنے کے لیے مغربی محاذ پر حملہ آور ہو جائے ـــــ اور اس نے ایسا ہی کیا۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی علی الصبح بھارت نے لاہور پر ۳ ڈویژن فوج سے سہ طرفی حملہ کر دیا۔ برکی پر بھارت کے نمبر ۱۷ انفنٹری ڈویژن نے اور بھینی اور باٹا پور پر نمبر ۵ انفنٹری ڈویژن نے حملہ کیا۔ اس سہ طرفی حملے کو کمک دینے کے لیے نمبر ۲۳ ماؤنٹین ڈویژن ان کے ساتھ تھا اور امرتسر کے باہر ایک اور تازہ دم ڈویژن ریزرو میں تیار کھڑا تھا۔

ان سب ڈویژنوں کے ساتھ ایک ایک اضافی ٹینک رجمنٹ اور عقب میں کور کا توپ خانہ تیار کھڑا تھا۔

۶ ستمبر ہی کی صبح بیدیاں بیذور کس کی طرف سے قصور کے راستے لاہور تک پہنچنے کے لیے بھارت کے نمبر ۴ ماؤنٹین ڈویژن' نمبر ۴۱ ماؤنٹین بریگیڈ اور نمبر ۲ انڈی پنڈنٹ آرمرڈ بریگیڈ گروپ نے حملہ کر دیا۔

اس حملے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقبوضہ کشمیر میں پاکستانی دستوں کی پیش قدمی روک کر دفاعی پوزیشنیں اختیار کر لی گئیں اور وہاں سے فوراً" بریگیڈ نکال کر لاہور کی طرف روانہ کیے گئے جہاں بلوچ رجمنٹ کی چند کمپنیاں دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر اس کے حملے کا ڈٹ کا مقابلہ کر رہی تھیں۔

اس حملے کے بمشکل ۲۷ گھنٹے بعد انڈین ہائی کمان نے اپنے پلان کے مطابق ۸ ستمبر کی صبح سیالکوٹ سیکٹر میں زبردست حملہ کر دیا۔ اس حملے میں بھارت کے نمبر ۱ بکتر بند ٹینک ڈویژن (جس میں دو ٹینک رجمنٹیں' ۳۳ کیولری اور ۲ رائل لانسرز اضافی تھیں) نمبر ۳۶ انفنٹری ڈویژن اور نمبر ۶ ماؤنٹین ڈویژن نے ایک لڑاکا موٹرائزڈ بریگیڈ اور توپ خانے کی کم و بیش پانچ سو توپوں کی مدد سے جنرل ڈن کی کمانڈ میں حصہ لیا تھا۔

بلاشبہ یہ دنیائے حرب کی تاریخ کا بہت بڑا بکتر بند حملہ تھا۔ اس حملے نے کشمیر محاذ پر آگے بڑھنے کے امکانات بالکل ہی ختم کر کے رکھ دیئے تھے اور پاکستانی ہائی کمان نے اپنی ساری توجہ لاہور اور سیالکوٹ کو دشمن سے بچائے رکھنے پر مرکوز کر دی۔

جب دشمن نے للکارا

اور آخر ـــــ وہ ساعت بھی آ گئی جس کا ایک مدت سے خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا۔

ـــــ بھارت نے پاکستان کے خلاف اپنی مرضی کا محاذ کھول دیا۔ برصغیر میں کفر اور اسلام کی جنگ شروع ہو گئی ـــــ ایک طرف سے لات و ہبل کے پجاری جانے کہاں کہاں سے امڈ آئے تھے دوسری طرف سے اللہ اکبر کے نعرے فضاؤں میں گونجنے لگے۔

ـــــ اور انہی نعروں کی گونج میں اللہ کے سپاہی اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر چند برس پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے۔ ان کی نظریں اس مقام پر آ کر ٹھہر گئی تھیں جہاں بدر کے مقام پر اللہ کے آخری رسول ﷺ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے چہیتے سے کرم کے لیے دعا مانگ رہے تھے۔

"اے خدا! اپنی امداد کے وعدے کو نہ بھولنا اے خدا! اگر ـــــ یہ چھوٹا سا گروہ فنا ہو گیا تو تیری حقیقی عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔"

ـــــ سر سے پاؤں تک اسلحے میں لیس کفار کہ مسلمانوں کو اپنے ہتھ رفتار گھوڑوں تلے کچلنے پر تلے ہوئے تھے اور آج بھی وہی کفار اپنے ٹینکوں پر سوار ہو کر اسی سرکار مدینہ کے غلاموں کو نیست و نابود کرنے کے لیے پاکستان کی سرحدیں عبور کر رہے تھے۔

دراصل شمع اسلام کی وہ ننھی کرنیں جو قرون اولیٰ کے مسلمان اس برصغیر پر روشن کر گئے تھے ـــــ وہ ہمیشہ ان کی آنکھوں میں کھٹکتی رہتی تھیں۔

ـــــ اور آج وہ اسی روشنی کو معدوم کرنے کے لیے پاکستان کے در و دیوار کو مسمار کر دینا چاہتے تھے۔

کتنی مشابہت تھی اس وقت اور ـــــ اس دور میں! اس وقت بھی مسلمانوں کو اللہ پر بھروسہ تھا اور آج بھی ان کی آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

لاہور پر دشمن کے بے پناہ لشکر کو روکنے کی سعادت جنرل سرفراز خان کے حصہ میں آئی جن کے پاس صرف ایک ڈویژن فوج تھی۔ اس کا تناسب کچھ اس طرح بنتا تھا۔ ہمارے

ایک جنرل کا مقابلہ بھارت کے تین جنرلوں سے تھا۔ دشمن کے تو بریگیڈیئر ہمارے تین اور اس کی قریباً چار سو توپوں کے مقابلے میں صرف سو توپیں تھیں۔

جنگ کے دو ہی روز بعد دشمن نے اپنا بیرانڈو پر بریگیڈ نمبر ۵۰ بھی واہگہ کے میدان میں اتار دیا۔ اب اس کی نفری ۳۵ ہزار تک پہنچ گئی تھی جس کا مقابلہ ہمارے پانچ ہزار سرفروشوں نے کرنا تھا۔

۶ ستمبر ۶۵ء کو لاہور بارڈر کے ایریا کمانڈر نے "آرڈر آف دی ڈے" جاری کیا۔

"پاکستانی فوج کے جوانو! آخری سپاہی ـــــ آخری گولی تک لڑو' سنگینوں سے' خالی ہاتھوں سے' ناخنوں سے لڑو اور دشمن کو نیست و نابود کر ڈالو۔ اپنے وطن کی زمین کا ایک انچ بھی دشمن کے ناپاک قدموں تلے نہ جانے دینا۔"

اس حکم نے جوانوں کے خون میں انگارے دوڑا دیئے۔ وہ جنونی کیفیت میں دشمن پر ٹوٹ پڑے اور واقعی تاریخ حریت کا وہ باب اپنے خون سے لکھ گئے جس کی سرخی اور عظمت ہمیشہ بڑھتی رہے گی۔

جنرل چوہدری نے اپنی نفری اور اسلحے کے زعم میں کہہ دیا تھا کہ وہ ۶ ستمبر کی صبح ۹ بجے لاہور جم خانہ میں شراب کی پارٹی اڑائے گا' لیکن وہ بھول گیا تھا کہ اس کا مقابلہ کس قوم سے ہے۔

بھارتی ٹڈی دل کا پہلا ٹکراؤ سرحدی محافظوں سے ہوا جو اپنی تھری ناٹ تھری گنوں کے ساتھ دشمن کے آرمرڈ ڈویژنوں کے سامنے ڈٹ گئے اور اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہلے جب تک کہ آہن پوش لشکری ان کے جسموں کو روندتے ہوئے نہ گزر گئے۔

اس دوران جنرل نے کچھ کمپنیاں نہر کے پار پہنچا دی تھیں جو سیسہ پلائی دیوار کی طرح غنیم کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئیں۔ ان خدا کے پراسرار بندوں نے دشمن کو پہلے ہی باقاعدہ معرکے میں احساس دلا دیا کہ وہ ناقابل تسخیر ہیں۔ ایک ایک کر کے وہ کٹتے گئے۔ اپنے خون سے عظمت کردار کی گواہی دیتے ہوئے یہ شیر دل صف شکن جیالے دشمن کے حملے کا زور توڑ کر ڈوگرائی تک آ گئے۔

جنرل جانتا تھا کہ یہ لوگ مر جائیں گے لیکن اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گے۔ اس نے تحمل سے جوانوں کو ڈوگرائی تک پسپائی اختیار کروائی۔ اس کے ساتھ ہی پاکستانی توپ خانہ حرکت میں آ گیا۔ کرنل امداد علی کا نعرۂ مستانہ گونجا اور توپچیوں کے "اللہ اکبر" کے فلک شگاف نعروں نے فضاؤں کا کلیجہ چھلنی کر دیا ـــــ ان کا سارا غضب ان کے گولوں میں سمٹ

آیا اور اینڈوالس کرتے دشمن کے پیادہ دستے گاجر مولی کی طرح کٹ کٹ کر گرنے لگے۔

سورج نکلتے ہی فضائیہ کی امداد آ گئی۔ شاہینوں کی پہلی قطار "ہنٹر بمبر" طیارہ بردار جہاز پر لونے کو فضا میں بلند ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کو طے شدہ ٹارگٹ کر پہنچا دی گئی تھیں۔

"اے نبی ﷺ! مومنین کو جہاد کی ترغیب دو۔ اگر تم میں سے بیس ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور تم میں سے سو آدمی ہوں گے تو ایک ہزار کفار پر غالب آئیں گے۔ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (دین کو) کچھ نہیں سمجھتے۔

اب اللہ نے تم پر تخفیف کر دی اور معلوم کر لیا کہ تم میں ہمت کی کمی ہے۔ سو اگر تم میں سے سو آدمی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اللہ صابرین کے ساتھ ہے۔"
(انفعال ۶۵/۶۶)

لاہور کی فضاؤں میں پہنچتے ہی اس فارمیشن نے اپنے لیڈر کی کمان میں "ہنٹر بمبر" کراس کیا اور لاہور کی مقدس فضاؤں کو سلامتی کا مژدہ سناتے آگے نکل گئے۔

غیظ و غضب کے عالم میں فضائیہ کے یہ شاہین آہن پوش لشکریوں سے گھرا ہوا دیکھ کر زمین سے بمشکل سو ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر رہ کر دیوانگی کی سی کیفیت میں دشمن پر اپنا گنوں سے آگ اگل رہے تھے۔

ڈوگرائی سے اٹاری اور راوی سائفن سے ہڈیارہ تک انہوں نے تل بھر کے حساب کیا اور دشمن کو سمجھا دیا کہ لاہور اس کا مرگھٹ تو بن سکتا ہے ـــــ مسکن نہیں۔ سرحدی شہروں کے وہ لٹیرے جو بسیں بھر بھر کر لاہور کی طرف اڑے چلے آ رہے تھے کہ یہاں ۷ ستمبر والے قتل عام اور لوٹ مار کی تاریخ دہرائیں گے' اب ان کی لاشوں کے گرد گدھ منڈلانے لگے تھے۔

پاکستان کی آرٹلری' انفنٹری اور فضائیہ نے دشمن کو احساس دلا دیا تھا کہ اسے لاہور تک پہنچنے کے لیے یہ تین ڈویژن کتے کی موت مروانے پڑیں گے۔

باٹا پور کا پل دشمن کے لیے پل صراط بن گیا تھا ـــــ!

۷ ستمبر کی صبح اس پل کو اڑا کر پاکستانی جیالوں نے بھارتی ہرلوں کی بدبختی پر آخری مہر ثبت کر دی اور ۶ ستمبر کی صبح نو بجے لاہور جم خانہ میں جشن فتح منانے والوں کے لیے ۷ ستمبر کی صبح اپنی لاشیں سمیٹنا ایک مسئلہ بن چکا تھا۔ دشمن کے بڑے حملے کا زور ٹوٹ چکا تھا تو اب وہ

محض کمسانی بلی کمبا لوپنے کے صدق نئی نفری مروانے کے لیے میدان میں اتار رہا تھا۔

☆○☆

عین ان لمحات میں جنرل سرفراز نے تاریخ حرب کا انتہائی خطرناک فیصلہ کیا اور بریگیڈیئر قیوم شیر کی کمان میں Stick Force (ریزرو فوج) کو دشمن پر جوابی حملے کا حکم دے دیا۔ یہ بڑا سنگین فیصلہ تھا کیونکہ محفوظ فوج کی نفری خطرناک حد تک کم تھی۔

۸ ستمبر کی صبح حملہ آور فوج کے جیالے نمودار کر گئے۔ انجینئرز نے ہنگامی پل بنا کر کچھ ٹینک بھی پار اتار دیئے تھے۔ بریگیڈیئر قیوم شیر نے بھینی کی طرف سے واہگہ پر اور بریگیڈیئر آفتاب نے شمل سے ملوطی' رانی اور شمشیر پوسٹوں پر سرفروشانہ یلغار کی۔

یہ یلغار اتنی تیز اور زوردار تھی کہ دشمن کے پندرھویں ڈویژن کا کمانڈر جنرل نرنجن پرشاد اپنے ہیڈکوارٹر کی چار جیپیں جن میں اس کی ذاتی جیپ بھی شامل تھی مع جنگی دستاویزات ۔ میسن کے قریب چھوڑ کر بھاگ گیا اور ہماری محفوظ فوج نے بی آر بی کے پار مورچے قائم کر لیے۔ ڈوگرائی پر قبضہ کر کے ڈیڑھ میل آگے اپنا مورچہ بنا لیا۔ فائر بندی تک دشمن نے اس مورچے پر چھبیس حملے کیے اور اپنی کئی پلٹنیں اور ٹینک اس ناقابل تسخیر مورچے کی فتح کے لیے واصل جہنم کروا لیے' لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ہڈیارہ میں بھارتی سورے کھونڈی اور ہڈیارہ کے دیہاتوں کا قتل عام کر کے اپنی بدبختی کا رونا رو رہے تھے۔ جب بریگیڈیئر اصغر نے دو بٹالین فوج کے ساتھ دشمن کے پورے ڈویژن کو للکارا۔

میجر شفقت بلوچ نے ہڈیارہ نالے پر دشمن کو روک لیا اور کرنل نواز کا توپخانہ دشمن پر آگ برسانے لگا۔ ہمارے او-پی نے دشمن کے عین درمیان گھس کر ایمونیشن سے بھرے ٹرکوں کو نشانہ بنوا دیا۔ یہ ٹرک ہڈیارہ نالے کے پل پر سے گزر رہے تھے جب ان پر قیامت ٹوٹی جس سے پل بند ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی بچ جانے والے پلوں کی حفاظت کے لیے فرنٹیئر فورس کی آر آر جیپیں اور مشین گنیں پوزیشن میں چلی گئیں ـــــ اور میجر شفقت بلوچ کو نہر پار کر آنے کا حکم مل گیا۔ دشمن کے سامنے ہڈیارہ سے برکی تک کا سارا علاقہ پڑا تھا' لیکن جہاں کہیں اس نے سر اٹھانے کی کوشش کی' مستعد اور بیدار او-پی پوسٹوں نے اسے توپ خانے کی مدد سے پسپا کر دیا۔

۱۰ ستمبر کو برکی پر دشمن کا حملہ اب تک کے بھرپور حملوں میں سے ایک تھا۔ دشمن کے

ٹینک اور انفنٹری برکی کے اندر گھس آئی۔ [illegible] نے ایک چوبارے پر آبزرویشن پوسٹ قائم کر کے اتنی مؤثر گولہ باری کرائی کہ دشمن کی ٹینک رجمنٹ کا کمانڈنگ افسر بھی مارا گیا اور بہت سی گاڑیاں اس کے ناکارہ ہو کر رہ گئیں۔ بے شمار جلتے ہوئے ٹینکوں اور ٹرکوں سے بچے کھچے دشمن پیدل ہی بھاگ نکلے۔ ستمبر کا پہلا نشان حیدر میجر عزیز بھٹی کا مقدر بنا۔

یہ پاکستانی فوج کے صف شکنوں کا جنون تھا کہ وہ ہمیں تہہ تیغ کیے بغیر نہیں ہار سکی۔ وہ رات اپنے دامن میں انسانی عظمت و کردار اور جاں نثاری کی بیشمار داستانیں لیے وقت کی گرد میں کھو گئی۔

اس معرکے کے بعد دشمن نے لاشعوری طور پر اپنی ذلت تسلیم کر لی تھی۔ اس کے بعد وہ بزدلوں کی طرح مورچوں میں بیٹھ کر گولہ باری [illegible] ایڈوانس کی جرات نہ کر سکا۔

اپریشن نیپال

بھارتی سورما اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ ۷۲ گھنٹے کے اندر پاکستانی فوج کو مکمل مفلوج کر کے رکھ دیں گے۔ اس لیے سیالکوٹ پر حملہ اڑتالیس گھنٹے بعد کیا گیا۔ جو آپریشن آرڈر انہیں جاری ہوئے تھے ان کی رو سے حملہ آور فوج کو سیالکوٹ کا دفاع کچل کر گوجرانوالہ اور وزیر آباد کے درمیان جی ٹی روڈ کو کاٹ کر چناب تک کے علاقے پر قابض ہونا تھا۔

جنرل چوہدری اسی خوش فہمی کا شکار تھا کہ اول تو دو دن میں لاہور فرنٹ پر وہ پاکستانی فوج کی مدافعت مکمل ختم کر چکا ہو گا۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو سیالکوٹ کا حملہ آور ڈویژن ایک انفنٹری اور مونٹین ڈویژن کی مدد سے لاہور کے دفاع پر عقب سے حملہ آور ہو گا۔

بھارتی کمانڈر انچیف جنگی نقطہ نگاہ سے ایسی سوچ میں حق بجانب تھا۔ دنیا کا کوئی جنگی مبصر بھی اس کی جگہ یہی رائے قائم کرتا' لیکن وہ یہ بھول رہا تھا کہ اس کا مقابلہ گوشت پوست کے انسانوں سے نہیں' آہنی ارادوں کے مالک ان صف شکنوں سے ہے جو سرحدوں پر زندہ رہنے کی تمنا لے کر نہیں آئے تھے---- ورنہ اتنا زبردست حملہ اتنی قلیل تعداد اور نامکمل اسلحے کے ساتھ روک لینا کسی انسانی گروہ کے بس کی بات نہیں تھی۔

جنرل چوہدری نے سیالکوٹ پر تاخیر سے حملہ اس لیے کیا تھا کہ اپنی دانست میں وہ اس دوران پاکستانی ٹینک سکواڈرنوں کو لاہور' بیدیاں اور قصور کے دفاع پر بکھیر چکا ہو گا اور اس کے "آہنی ہاتھیوں" کے مقابلے میں پاکستان کی ایک آدھ ٹینک رجمنٹ کیا کرے گی؟ اس نے دوسری چال یہ چلی کہ ٹینکوں کے میدان کو پھیلاتا چلا گیا اور سیالکوٹ کے شمال سے جسڑ تک لڑائی کو پھیلا دیا۔ یہ علاقہ یوں بھی ٹینکوں کی جنگ کے لیے بڑا موزوں تھا۔ سیالکوٹ کے محاذ پر ہمیں خنجر گھونپنے کی سعادت جنرل ابرار حسین کے حصے میں آئی جن کی مدد میں بریگیڈیئر عبدالعلی' بریگیڈیئر نیازی' بریگیڈیئر مظفر الدین اور نامکمل بریگیڈیئروں کے ساتھ انٹیلی جنس کی اطلاعات پر دشمن کے استقبال کو موجود تھے۔

۷ ستمبر کو اطلاع ملی کہ دشمن سلیمانکی کے علاقے میں اپنا بکتر بند ڈویژن جمع کر رہا ہے۔ بریگیڈیئر عبدالعلی نے "ریکی پٹرول" رات کو اس طرف روانہ کر دی جس نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر دشمن مورچوں سے گزرنے کے بعد واپس آکر اس بات کی تصدیق کر دی کہ انٹیلی جنس کی اطلاعات صحیح ہیں۔

فوراً پاک فضائیہ حرکت میں آئی اور دشمن کے سلیمانکی میں جمع ہونے والے بکتر بند ڈویژن کو وہیں دانوں کی طرح بھون کر رکھ دیا۔ یہ حملہ اتنا جارحانہ اور تیز تھا کہ دشمن بھونچکا رہ گیا اور شاہین اپنا کام کر کے واپس چلے آئے۔

اس دوران دشمن ظفروال کے علاقے میں "حملے کا دھوکہ" دیتا رہا' لیکن جنرل نیازی اس کی چال میں آنے کو تیار نہ ہوئے۔

دشمن کو اس کی اصلیت کا احساس دلانے کے لیے بریگیڈیئر مظفرالدین کے سربلند اپنی کمین گاہوں سے نکلے اور اس کی قلعہ بندیاں روندتے ہوئے جسڑ پر حملہ آور ہوئے۔ انہوں نے جسڑ کا پل اڑا کر چوہدری کے سورماؤں کی "دھوکے کی چال" کو بھارتی علاقے میں ہی دفن کر دیا۔

اس بکتر بند ڈویژن کو اپنے ارادوں سمیت وہیں موت کی نیند سلا کر بریگیڈیئر مظفر نے سیالکوٹ اور لاہور سیکٹر کو "دھوکے" کی زد سے محفوظ کر لیا۔ اس دوران چمب کی قلعہ بندیاں زمین بوس کرنے والے توپ خانے کا بڑا حصہ بریگیڈیئر امجد علی چوہدری کی کمان میں سیالکوٹ کی حفاظت کے لیے واپس آگیا۔

چھ سو ٹینکوں کے ساتھ جنرل راجندر سنگھ کو سیالکوٹ پر بھیجا گیا جس نے صحرائے العالمین (دوسری جنگ عظیم) میں جنرل رومیل کی جنگی چالوں کا گہرا مشاہدہ کیا تھا اور خود کو ٹینکوں کی لڑائی کا چیمپئن سمجھتا تھا۔

یہ زعم جنرل بھول رہا تھا کہ اس کا مقابلہ جنرل ابرار حسین سے ہے جس کا ہیرو سعد بن ابی وقاصؓ ایسا جرنیل تھا جس نے قادسیہ کے میدان میں ایسے ہی "اصحاب فیل کے لشکر" کو روندتے ہوئے تاریخ حریت کا وہ باب لکھا تھا جو آج حربی تاریخ میں سنہرا باب ہے۔

دشمن کا پہلا ٹکراؤ بریگیڈیئر عبدالعلی سے ہوا جنہیں انٹیلی جنس رپورٹ ملی تھی کہ دشمن ٹھراٹکے پر چڑھ آیا ہے۔ بریگیڈیئر پچھلے تین گھنٹوں سے مسلسل بیداری کی حالت میں تھے اور پچھلی ہی رات زبردست لڑائی سے ان کے اعصاب کھنچے ہوئے تھے۔ بریگیڈیئر عبدالعلی نے وائرلیس پر اپنے ٹینک کمانڈر کو چائے کی پیالی کا لمبا گھونٹ حلق میں انڈیلتے

ہوئے حکم دیا۔

"دشمن کا حملہ پسپا ہوا اسی طرف سے آرہا ہے۔ نہر عبور کرنے سے پہلے دشمن کو برباد کر دو۔"

اس دوران بریگیڈیئر اور فرنٹیئر فورس کے جوان دشمن کے ساتھ گھمسان کی جنگ لڑ رہے تھے' لیکن آہنی قلعوں کی مدد سے دشمن اس دیوار میں کئی جگہ شگاف ڈال رہا تھا۔

عبدالعلی نے انٹیلی جنس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ دشمن کی قوت کتنی ہے' انہوں نے دوسرا حکم کر کے بھیجا کہ وہ اپنی ٹینک رجمنٹ کے ساتھ پیچھے ہٹ کر زندہ تو مرتجز ہو جائیں۔

یہ خودکشی کی حد تک دلیرانہ حکم تھا' لیکن سوا اس کے کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

۸ ستمبر کی صبح طلوع ہونے تک دشمن کے سیاہ ہاتھ ٹھراٹکے سے ظفروال تک زمین پر حشرات الارض کی طرح پھیل چکے تھے۔ اس ندی دل کا صفایا کرنے کے لیے بریگیڈیئر عبدالعلی نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور دنیائے حرب کا دلیرانہ حکم جاری کیا۔ توپخانے کے ساتھ انفنٹری کو بھی حکم جاری ہو گیا۔

"آگے بڑھو اور دشمن کو نیست و نابود کر دو۔"

۲۵ کیولری کے تین سکواڈرن بھارتی آرمرڈ ڈویژن کا سر کچلنے کے لیے اپنی کمین گاہوں سے نکلے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۴ بلوچ رجمنٹ کرنل شنواری کی کمان میں کفن بردوش میدان کارزار کی طرف روانہ ہو گئی۔

میجر محمد احمد کے سکواڈرن کو پھلوار کے قریب دشمن کے مست ہاتھیوں کی آنکھیں پھوڑنے کا حکم ملا اور جوش غضب میں وہ جنگی ترتیب کو بالائے طاق رکھ کر دشمن کے عین سامنے اس سے ٹکرا گیا۔ اس کے جان نثاروں نے اپنے سردار کے جذبہ شجاعت کی لاج رکھی اور دشمن کے سامنے آہن' لوہے اور خون کی دیوار تان کر کھڑے ہو گئے۔

اس کے ساتھ ہی شاہبازوں کی دھاڑیں گونجیں اور تین طیاروں کی پیلوس سے جھانکتی گنوں سے دشمن کے ٹینکوں پر راکٹ پھٹنے لگے۔

چونڈہ کے میدان کے سینے پر سرفروشوں کے خون سے دنیائے حرب و ضرب کی اہنت داستان رقم ہونے لگی۔ میجر احمد کا ٹینک ہٹ ہوا۔ وہ دوسرے میں پہنچ گئے —— پھر تیسرے میں!

ان کا جسم زخموں سے چور چور اور وردی خون میں رنگین ہو رہی تھی' لیکن بچتے ہی سکواڈرن کمانڈر پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ میجر احمد کو بیہوشی کی حالت میں زبردستی پیچھے لے جایا گیا اور کیپٹن فرخ خان نے ان کی جگہ سنبھالی۔

میجر آفندی کے ٹینک ڈگری اور تھرڈ سے دشمن پر نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے یلغار کر رہے تھے۔ انہوں نے دشمن کی عطا پوٹا ہارس کو وہ سبق سکھلایا کہ انہیں اپنی ٹریننگ بدلنے پر مجبور کر دیا اور اس جنگ کے بعد سے دشمن نے اپنے ٹینک رسالوں کے ترتیبی نظام کا از سر نو جائزہ لے کر اس کی اصلاح کی تھی۔

تیسرا سکواڈرن میجر رضا خان کی کمان میں نعرۂ تکبیر بلند کرتا دونوں پہلوؤں سے معروف جنگ سکواڈرن کی مدد کو پہنچ گیا۔

اس کے ساتھ ہی مورچہ بند ۲ پنجاب رجمنٹ کے میجر محمد حسین نے جن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا' اپنے گوشت پوست کے جوانوں کو حکم دیا کہ وہ دشمن کی آہنی دیواروں میں راستہ بناتے ہوئے گھسیں اور اس کو بتا دیں کہ ہم بدر کے سپاہی ہیں اور تیرہ سو سال پرانی تاریخ دہراتے ہیں۔

اس حکم کو پاگل پن کی انتہا کہا گیا' لیکن خدائے وحدہ لاشریک کی قسم! اگر چونڈہ کے میدان میں ایسے پاگل موجود نہ ہوتے تو دشمن کے بھیڑیے معصوم پاکستانیوں کی رگوں سے خون نچوڑ لیتے۔

سیکنڈ پنجاب رجمنٹ کے جیالے جیپوں میں آر آر گنیں لگا کر دشمن کے ٹینکوں کے سامنے ڈٹ گئے۔ راکٹ لانچر کندھوں پر اٹھائے سربلند غازی میدان کارزار میں دشمن کے سامنے لیٹ گئے اور اسے للکارا کہ آؤ ہمارے جسموں کو روند کر آگے بڑھو۔

یہیں سے اس روایت نے جنم لیا کہ پاکستانی جوان ٹینکوں کے سامنے جسم سے بم باندھ کر لیٹ گئے تھے۔

اس حملے نے دشمن پر دہشت طاری کر دی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس کا مقابلہ انسانوں سے نہیں' یہ تو کسی اور ہی عالم کی کوئی مخلوق ہیں۔ ملک و ملت کے لیے قربانی کا یہ عظیم الشان مظاہرہ انسانی فہم و ادراک سے بالاتر تھا۔

دشمن کے لشکر میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے آہنی قلعے زمین بوس ہونے لگے۔ گوشت پوست کے انسان ہاتھوں میں گرنیڈ پکڑے' دشمن کے انتہائی نزدیک پہنچ کر اس کے ٹینکوں پر چڑھنے اور خود بھی واصل حق ہو جاتے۔

میجر حسین نے اس پر جس قسم کی [illegible] مشاورت کی اور جو گینٹلز مرد اصلی کی لیجنڈ بنے [illegible] ایڈوانس کر رہی تھی اور میجر رضا کے ٹینک [illegible] تھے۔

یہ معرکہ ہرگز لفظی نہیں تھا۔ اس لیے ان جیالوں میں کوئی باہر فوت ہو گیا تھا۔ دشمن اضافہ مال تیاری کرنے کے بعد اپنے [illegible] وہ بھول رہا تھا کہ اس کا مقابلہ عام انسانوں سے نہیں۔

ایڈوانس کرتے تھرڈ بلوچ کے نوجوان نے کہا "پیر [illegible] آج بے غیرت نہ ہو جانا۔"

ایک اور مورچے سے کوئی خدا کا شیر گرجا۔

"مسلمانو! جس نے آج پیٹھ دکھائی اس پر خدا کا غضب ہو گا۔ خدا کرے اپنے باپ کا بیٹا نہیں۔"

اس للکار نے سربلندوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ وہ بے ہم و بیا لے کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے جنہوں نے بدر و حنین کے مجاہدوں کا لہو لوٹا تھا۔ ہم نہیں جانتے ——— لیکن وہ ہماری تاریخ کا مان ہے۔ ایک عالم نے ان کی سرفروشی کو نذر عقیدت کی۔

چونڈہ کے چپے چپے پر بکھرے خون کی ایک ایک بوند اپنے دامن میں ہزاروں شجاعت و حریت کی کہانیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ سیالکوٹ کے میدانوں کی بوٹی بوٹی کو ان خدا کے پراسرار بندوں نے اپنے خون سے سیرابی بخشی تھی۔

نعرۂ تکبیر بلند کرتے یہ دیوانے معرکے میں اپنے خون سے طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک وہ کہانی لکھ گئے جو تاریخ کے سینے پر ہمیشہ جگمگ جگمگ کرتی رہے گی۔ انہوں نے ابتدا ہی میں دشمن کی کمر توڑ دی اور دنیا بھر کے ماہرین حرب و ضرب نے اپنی زبان دانتوں تلے دبا لی کیونکہ وہ اس "معجزے" پر یقین نہیں کر سکتے تھے۔

جنگ کے آخری لمحات تک غازیان صف شکن شجاعت و ہمت کی ایسی داستانیں رقم کرتے رہے اور انہوں نے "آپریشن نیپال" کو دہلی کے ہی۔ ایچ۔ کیو کی فائلوں ہی میں موت کی نیند سلا دیا۔

☆○☆

"کرنے علاقوں پر بھی دشمن کا یہی حشر ہوا۔
میم کرن' راجستان کا ہزاروں مربع میل علاقہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور جس ان
لمحہ میں جب یہ جیالے دشمن کی کمر توڑنے کے بعد اس پر کاری ضرب لگانے کے لیے
آگے بڑھنے والے تھے' پاکستانی سٹرائیک فورسز تیار کھڑی تھیں' سیاسی بازی گر میدان میں اتر
آئے۔
ان سیاسی بندروں نے میدان کارزار میں جیتا ہوا معرکہ تاشقند کی میز پر ہار دیا اور وہ
قربانیاں اپنا مول چکانے سے محروم رہیں جو شہیدوں نے اپنی ملت' مذہب اور ملک کے لیے
دی تھیں۔

آخری چٹان

سری نگر کے چپے چپے سے شیرو کی پرانی آشنائی تھی۔
——— یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ زندگی میں دوبارہ اس نگر کو
کبھی کشمیر کی جنگ آزادی میں حصہ بھی لے گا کیونکہ اس نے اپنی دانست میں اپنے ہمدرد
سوئے شیرو کو مار ڈالا تھا' لیکن آج جس طرح انگڑائی لے کر وہ دوبارہ بیدار ہوا——— یہ اس
کے گمان میں نہیں آ سکتا تھا۔
کیپٹن اشرف خان اور اس کے پانچ ساتھیوں کی راہنمائی کے فرائض اسے سونپے گئے
تھے۔
ان لوگوں نے بارہ مولا کے راستے سرحد عبور کی تھی اور سری نگر تک وہ بغیر کوئی خاطر
کیے پہنچ چکے تھے۔ کیپٹن اشرف خان کو جس ٹھکانے پر پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی' وہ ٹھکانہ ان
لوگوں کی آمد سے پہلے ہی دشمن کے ہتھے چڑھ چکا تھا اور اب اسے تمام تر احتیاط اپنی فراست
کے ساتھ انجام دینے تھے۔ وہ لوگ یہاں سبوتاژ کارروائیوں کے لیے آئے تھے۔ سری نگر
کا محلہ "بٹ ماڈ" ان کی پناہ گاہ بن چکا تھا۔
یہاں آ کر شیرو کے زخم پھر ہرے ہو گئے تھے۔ اسے علم ہوا تھا کہ نبی خان اور اس کے
بہت سے پیارے اس معرکے میں جام شہادت نوش کر گئے تھے۔ آسیہ کے بھائی سری نگر
چھوڑ کر مہاراشٹر کی طرف نکل گئے تھے۔
وہ ان مقامات پر دیوانہ وار گھومتا رہا جو کبھی اس کی آماجگاہ رہے تھے۔ اس کی بے تاب
نگاہوں نے اس زمین کے چپے چپے کو بوسہ دیا جہاں اس کی معصوم بچی اور بے گناہ بیوی کا
خون بہایا گیا تھا۔
یہاں کی ہواؤں سے اسے اپنی بچی اور بیوی کے خون کی مہک آ رہی تھی' لیکن آج وہ
مجبور اور بے کس نہ تھا۔ اس نے سوچا: "آج وہ اکیلا نہیں۔ وہ آج پاکستانی فوج کے ایک
سپاہی کی حیثیت سے یہاں آیا ہے۔ اب وہ گن گن کر اپنے پیاروں کی موت کا بدلہ لے

گئے۔۔۔۔ اس نے سوچا: "آسیہ، عاکفہ اور اس کی ماں اور دوسرے شہید ساتھیوں کی روحیں کتنی خوش ہوں گی آج۔"

ہر روز شیرو کی رہنمائی میں پاکستانی کمانڈوز کی ٹولیاں رات ڈھلتے ہی اپنے مشن پر نکلتیں اور صبح ہونے سے پہلے کوئی نہ کوئی کارنامہ انجام دے کر واپس آ جاتیں۔ یہ کام وہ اکیلے ہی نہیں، وہاں موجود حریت پسندوں کے بہت سے گروپ کر رہے تھے۔ ان کے کارناموں سے ایک عالم باخبر تھا۔ پاکستان کے ٹی۔ ایچ۔ کیو میں ان کی جان نثاریوں کی رپورٹیں مرتب ہو رہی تھیں۔ ۵ ستمبر سے ۲۳ ستمبر تک انہوں نے دنیائے حریت کے وہ انمٹ باب نقش کر دیئے کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔

اسی رات فائر بندی ہو گئی اور جیالوں کو جنہوں نے فتح سے بے پروا ہو کر ہر قسم کی مدد سے بے نیاز انتہائی سنگین حالات اور منافقانہ ماحول میں جنگ جاری رکھی ہوئی تھی اور جنہوں نے اب اپنے قدم خاصے مضبوط کر لیے تھے، اچانک حکم ملا کہ اپنے مستقر پر واپس آ جائیں۔ انہوں نے یہ کامیابیاں یونہی حاصل نہیں کی تھیں۔ بمشکل گنتی کے چند خوش قسمت ہی زندہ لوٹے تھے۔ ان کے تین چوتھائی ساتھی شہید ہو چکے تھے۔ خود شیرو اور اس کے ساتھیوں کا یہ عالم تھا کہ کیپٹن اشرف خان اور ایک نائیک زندہ بچے تھے۔ یہ نائیک بھی زخمی تھا۔ گولی اس کے بازو سے گزر گئی تھی۔ باقی تمام ساتھی مختلف مہموں میں اپنی جانوں کا نذرانہ کشمیر کی آزادی کو پیش کر چکے تھے۔

مقبوضہ کشمیر سے جو لوگ اس جہاد آزادی میں حصہ لے رہے تھے، ان کے متعلق سب کو علم تھا کہ وہ تو زندہ درگور ہو کر رہ گئے تھے۔۔۔۔ پاکستانی انہیں دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جا رہے تھے اور دشمن ان کے ساتھ جو سلوک کرنے والا تھا، اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

☆○☆

جنگ بندی کے ساتھ ہی دشمن نے اپنی انتقامی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ سری نگر میں پاکستانی کمانڈوز کی جائے پناہ "بٹ ماؤ" شروع ہی سے ان کی نظروں میں کھٹک رہی تھی۔ ۲۳ ستمبر کی رات کو بھارت کی ۲ بٹالین فوج نے اس سارے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے کر [illegible] گوں کو وارننگ دی کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر یہاں چھپے ہوئے تمام پاکستانی کمانڈوز [illegible] کے حوالگی کو بھارتی فوج کے سامنے پیش کر دیں ورنہ اس سارے علاقے کو تس [illegible] کر دیا جائے گا۔

آفرین ہے خدا کے ان پراسرار بندوں پر کہ انہوں نے کسی بھی پاکستانی کمانڈو کو گرفتار کرنے سے انکار کر دیا اور پاکستانی کمانڈوز کی مدد سے علاقوں میں مورچے تعمیر کر لیے۔ مقررہ مدت گزر جانے پر بھارتی فوج حرکت میں آ گئی۔ اس نے اس علاقے پر گولہ باری شروع کر دی۔

محصور سرفروش ہی جان سے گئے، لیکن یہاں بتانے والی ہر قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر بھارتی سورماؤں نے بٹ ماؤ کو اس کے ہزاروں باسیوں سمیت، جن میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی، راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ انہوں نے کسی ایک ذی روح کو بھی زندہ بچ کر نکل جانے کا موقع نہ دیا اور ہی بھر کے خون کی ہولی کھیلنے کے بعد اس علاقے پر بلڈوزر چلا کر زمین ہموار کر دیا۔

بربریت کا یہ مظاہرہ دنیا بھر کے پریس نے دیکھا اور اسے تصویروں سمیت شائع کیا، لیکن عالمی ضمیر نہ جاگا۔ سوائے آہ و بکا بے بس آوازوں کے اور کوئی آواز ان کے حق میں بلند نہ ہوئی۔

شیرو اور اس کے ساتھیوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس رات "بٹ ماؤ" میں موجود نہیں تھے۔

☆○☆

شیرو کو سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ وہ پچھلے ڈیڑھ دو ماہ سے ہر معرکے میں ان کا ساتھی رہا تھا۔ اس مرتبہ جس تیزرفتاری کے ساتھ سارے کشمیر میں جنگ کا نقشہ بدلا تھا، اسے یقین ہونے لگا تھا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت اس کے کشمیر کو غلام نہیں رکھ سکتی، لیکن اس مرتبہ اس کے خواب کی تعبیر اتنی بھیانک تھی کہ اس کے لوگ خطا ہونے لگے۔ وحشیوں اور دیوانوں کی طرح وہ اپنی بوٹیاں نوچ کر رہ گیا۔

۔۔۔۔ اس نے کئی بار شرفو کا گریبان پکڑ کر اس سے پوچھا تھا کہ وہ کیوں اسے دوبارہ کشمیر لے کر آیا تھا؟

شرفو کے پاس اس کے ان جلتے ہوئے اور جلا دینے والے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ خود وہ دیوانوں کی طرح فضاؤں میں بے مقصد گھورتا رہتا اور شیرو کے چند ہونے پر صرف ایک ہی بات کہہ دیتا۔ "شیرو! ہم سپاہی ہیں۔ ہمارا کام سوچنا نہیں، عمل کرنا ہے۔ جیسا حکم ہمیں ملے گا ویسی ہی تعمیل ہم کریں گے۔"

"لیکن میں تو انسان ہوں۔ میرے احساسات تو زندہ ہیں۔ پتھر کا بت نہیں ہوں میں۔"

HBC

[illegible] اب میں شرفو اپنی لال لال آنکھوں سے [illegible] کی طرف دیکھ رہا تھا۔
[illegible] ہوا تھا اور جن پاروں نے [illegible] کر دیا تھا۔
وہ لوگ ان کو کیسی بھیانک موت [illegible] مرنے والے تھے۔

انسان ان پہلے تھے۔ اس نے شیرا ساتھی تو [illegible] کہا تھا۔ شرفو [illegible]
اکا تھا کہ [illegible] اس کی جان سے [illegible] کیپٹن اشرف خان

شرفو نے [illegible] سے پہلے وہ زہراں سے [illegible] کام والوں کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زہراں کے سامنے کیا منہ لے کر جائے گا اور کیپٹن اشرف خان یہ سننے سے قاصر تھا کہ آخر شیرا اس کی بیوی سے ملنا کیوں نہیں چاہتا؟

وہ شیرو کی توجہ بٹانے کے لیے اکثر اس سے اپنے دونوں بیٹوں خالد اور طارق کی باتیں کرنے لگتا۔ اس نے شیرو کو پوچھ سے پچھڑنے سے اب تک کے ایک ایک لمحے کی کہانی سنا دی تھی۔ اپنے اور زہراں کے متعلق ایک ایک بات اس نے شیرو کو بتا دی تھی۔ صرف شیرو کے زندہ ہونے کی اطلاع پر زہراں کے ردعمل سے اس نے شیرو کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ شیرو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

☆○☆

بارہ مولا تک کا سفر عافیت سے طے ہو گیا۔ اب انہیں "پل صراط" عبور کرنا تھا۔
بھارتی سورما جانتے تھے کہ پاکستانی کمانڈوز کو اب واپس جانا ہے۔ انہوں نے تمام سرحدی علاقے پر پھیل کر ان کے "استقبال" کی تیاریاں مکمل کر رکھی تھیں۔
سدھائے ہوئے کتوں کی زنجیریں ہاتھوں میں تھامے وہ ان "مکس بیمیوں" (کمانڈوز) کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ وہ حشرات الارض کی طرح پہاڑی نالوں کے پیچ پیچ رینگ رہے تھے۔ خون آشام بھیڑیوں کی طرح اپنی سرخ اور لمبی زبانیں باہر لٹکائے ان "بد قسمت مخلوقوں" کے منتظر تھے جو لاکھ خواہش کے باوجود "مرحبہ شہادت" سے سرفراز نہ ہو سکے تھے۔

انہیں مسلسل سفر کرتے آج تیسرا دن تھا۔ شام کے وقت ایک سرحدی علاقے میں ایک پہاڑی کی کھوہ میں چھپے ہوئے تھے۔

[illegible] اس کی [illegible] ہوا تھا۔ [illegible] شرفو نے [illegible]
[illegible]
"[illegible] سزا" ایک [illegible] فوجیوں کی طرح [illegible] ایک [illegible]
اس کا ایک [illegible] تھا۔ [illegible] اپنی [illegible] کے [illegible] وہ [illegible]
بدل [illegible] اشرف خان کو مخاطب کیا۔
[illegible] کے کیپٹن اشرف خان کو مخاطب کیا۔
"ہوں؟"
"ادھر سری نگر میں اپنے [illegible] کے [illegible] ہو گئے۔ [illegible]
واپس جانا۔ ہم اپنی [illegible] کے [illegible] کو [illegible] کہیں گے۔" اس [illegible]
کہا۔
"[illegible] وصلہ کرو۔" وہ بہرحال اس [illegible] تھا۔ "سب [illegible] کی مرضی سے [illegible] ہوا۔
[illegible] قدرت نے ہمیں کسی اگلے معرکے کے لیے زندہ بچا رکھا ہو۔ ہم پھر آئیں گے۔
خدا نے وحدہ لاشریک کی قسم! اگر ہماری مائیں [illegible] نہ جنتیں اور ہم نے [illegible]
کے گھاٹ میں [illegible] لیا ہے تو ہم "بٹ ماہ کے شہداء" کا انتقام ضرور لیں گے۔ ہم کشمیر
کو درندوں سے پاک کر کے دم لیں گے۔"
اور اس کے جوان نے سر جھکا کر اس کی بات پر صاد کر دیا۔
شیرو ان دونوں سے ---- ماحول سے، حالات سے بالکل لاتعلق ان کی طرف پیٹھ
موڑے خلاؤں میں ٹکٹکی باندھے اپنا کھویا ہوا کنفیشن تلاش کر رہا تھا۔
---- اس کے عقب میں سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی شام کے سائے گہرے ہوتے
جا رہے تھے۔ ایک پراسرار سی ہوا پورب کی سمت سے سیٹھی، بانجھ درختوں اور ماحول کا
سینہ چھیدتی آہستہ آہستہ پچھم کی سمت بہنے لگی تھی۔ ان کے چاروں اطراف چلیے چیڑ اور
دیودار کے درخت زور زور سے ان کی بربادی اور الم نصیبی کا ماتم کرنے لگے تھے۔ فطرت
کی بے حسی اور کشمیر کی بدنصیبی پر بوڑھا آسمان آنسو بہانے لگا تھا اور بادلوں کے وہ سیاہ
ٹکڑے جو ان کا مقدر بن کر تینوں کے سروں پر سایہ فگن ہو گئے تھے، اب بوند بوند لہو
ٹپکانے لگے۔ پھر آسمان کا کلیجہ شق ہوا اور ایک کوندا لپکا۔ اس کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش

شروع ہو گئی۔ انہوں نے اپنے لمبے کوٹ پہن لیے اور کہرہ کے منہ پر آن کھڑے ہوئے تھے۔

"چلنا چاہیے۔" شیرو نے زور دے کر یہ لفظ ادا کیے تھے۔ اس کے حلق میں کوئی پھانس سی اٹک گئی تھی اور اسے کئی مرتبہ اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

"جوانو! اگر دشمن سے مقابلہ ہوا تو میں تمہیں کور دوں گا۔ تم لوگ پیچھے نکل جانا۔ میرا انتظار پندرہ منٹ کرنا ہے۔ اس کے بعد خود سرحد پار کرنے کی کوشش کرنا۔ گرفتار ہو جاؤ تو دشمن کو اپنے نام اور رینک کے سوا اور کچھ نہ بتانا۔" کیپٹن اشرف فارمیشن میں آ گیا۔

شیرو اسٹین گن تھامے ان دونوں کے آگے چل رہا تھا۔ درمیان میں انہوں نے زخمی نائیک کو کور دیا ہوا تھا جس نے اپنا زخمی بازو گلے میں بندھے گن سلنگ میں لٹکا رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ اپنے پوچ کے بالکل اوپر رکھا ہوا تھا تاکہ کسی بھی لمحے وہ ہینڈ گرنیڈ نکال کر پھینک سکے۔

اپنی دانست میں شیرو انہیں بہت محفوظ راستے پر لے جا رہا تھا۔ رات گہری ہونے لگی تھی۔ بارش کا سلسلہ اب تھم چکا تھا۔ آسمان کی سیاہیوں میں سے ڈرتے ڈرتے کبھی کبھی چاند ان کی طرف جھانک لیتا' لیکن پھر اپنا منہ اندھیروں میں چھپا کر روپوش ہو جاتا۔ اچانک ہی جیسے اس اندھیرے میں سورج نکل آیا۔ یکدم آٹھ دس زبردست دھماکے ہوئے اور فضاؤں میں آگ لگ گئی—— دشمن نے اچانک روشنی راؤنڈ فائر کر کے ماحول کو ننگا کر دیا تھا۔

"کم آن—— دس وے۔" کیپٹن اشرف خان نے دونوں کو اپنے دائیں ہاتھ میں گن تھامے ہوئے بائیں ہاتھ سے ایک ٹیکری کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بندر کی سی پھرتی سے ایک دوسرے کے تعاقب میں اس کے پیچھے ہو گئے۔ "تم دونوں آہستہ آہستہ پیچھے نکلو۔" شرفو نے سرگوشی کی۔

"سر!" اس کے نائیک نے سسکاری لی۔

"مود!" اشرف خان کی سرگوشی میں تنبیہہ بھی موجود تھی۔

"شیرو!!" شیرو نے کچھ کہنا چاہا۔

"شیرو خدا کے لیے! وقت کم ہے..... بحث نہ کرنا۔"

"ہینڈز اپ! تم لوگ ہر طرف سے گھیرے میں آ چکے ہو۔" کسی نے ماؤتھ ا۔ پہلی فائر سے کہا۔

"نکلو۔" شرفو کے منہ سے بمشکل نکلا۔

دونوں ہاتھ کھوپڑی اس کی آڑ میں پہنچتے ہوئے پیچھے نکلنے لگے۔ اس سے ہاتھ ان دشمن کی آواز سنائی دی۔ گولیاں اس لکیری سے ذرا اوپر سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

دونوں بگٹٹ بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ ایک قدرے محفوظ جگہ پر لکیری کے پیچھے وہ رک گئے کہ اب فائرنگ کی آوازوں میں شرفو کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔ پھر کچھ بعد دھماکے ہوئے۔ "ہینڈ گرنیڈ پھینکے تھے۔

دونوں بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔ پانچ منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد انہیں ایک سایہ اپنی طرف زمین سے رینگ کر آتا دکھائی دیا۔ شیرو نے دیوانہ وار اپنی جگہ سے اٹھ کر اور سامنے سے قریب جا کر۔

"شرفو..... خیریت تو ہے.....؟" اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔

"کچھ نہیں..... کچھ نہیں۔" کہتے ہوئے شرفو نے اٹھ کر کھڑے ہونا چاہا لیکن چند انچ اوپر اٹھنے کے بعد ہی وہ منہ کے بل آگے کو جا گرا۔ شیرو نے بلی کی سی پھرتی سے جھک کر اسے اٹھایا اور قریباً گھسیٹتا ہوا اسے اسی ٹیکری کے پیچھے لے آیا۔

نائیک اپنے کیپٹن صاحب کی حالت پر تڑپ اٹھا۔ شرفو کو کوئی کاری زخم لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دوبارہ فائرنگ شروع ہو گئی۔

"آؤ نکلیں یہاں سے۔" شیرو نے نائیک کو مخاطب کیا اور شرفو کے "نہ نہ" کرنے کے باوجود اسے اپنے کندھے پر ڈال کر جھاڑیوں اور جنگلی گھاس کے اس سلسلے میں جا گھسا جس کا اختتام سرحد پر ہوتا تھا۔

ایک قدرے محفوظ جگہ پہنچ کر اس نے شرفو کو زمین پر لٹا دیا۔ اس کے کوٹ کے بٹن کھولے تو سینے پر لہو کا دریا تیرتا دکھائی دیا۔

"سر——! سر——!" اس کا نائیک سسک پڑا۔

"فیلڈ پٹی نکالو۔" شیرو نے انتہائی ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے نائیک سے کہا۔

اس نے شرفو کی قمیص سامنے سے پھاڑ ڈالی۔ اس کے سینے پر ایک گہرا گھاؤ شیرو کا منہ چڑا رہا تھا۔ بڑے حوصلے سے کام لے کر اس نے شرفو اور نائیک دونوں کی فیلڈ پٹی اس کے

زخم پر رکھ کر باندھ دی۔ نائیک بے بسی' جوش' غصے اور دکھ کے عالم میں اپنا سر اب تک کئی مرتبہ جھٹک چکا تھا۔

شرفو نے ابھی تک منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے جگری یار کی طرف دیکھتا رہا تھا اور پھر آہستہ آہستہ بولا۔ "شیرو بھائی! اس مرتبہ میں تمہیں نہیں بچنے دوں گا۔" اس نے رک رک کر کہا اور تھوڑا سا کھانسا—— "پانی.....!" اس کے منہ سے نکلا۔

نائیک نے اپنی بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ شرفو نے دو تین گھونٹ پی کر بوتل پرے ہٹانے کا اشارہ کر دیا۔ گولیاں ان کے گرداگرد انگاروں کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ شیرو نے دوبارہ اسے اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ بمشکل چند گز چلنے کے بعد ہی اس نے شرفو کی کراہ سنی۔

"مجھے ذرا لٹا دو۔" اس نے بڑی مشکل سے شیرو تک اپنی آواز پہنچائی۔

شیرو نے اسے ایک قدرے ہموار جگہ پر لٹا دیا۔ شیرو نے محسوس کیا کہ اس کا نائیک رونے لگا تھا۔ وہ ان سے ذرا پرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"شیرو! میرے بھائی! تم نے..... ایک رون..... تین امانتیں مجھے سونپی تھیں..... افسوس میں تمہاری ماں اور چاچا کو نہ بچا سکا مگر..... آج میں..... تین امانتیں تمہیں سونپتا ہوں..... شیرو! پانی۔"

پتھر کے انسان نے بوتل کھول کر اس کے منہ میں دو گھونٹ ٹپکا دیئے۔

"شیرو——!" شرفو نے درد سے کراہتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "میں نے تم سے بہت باتیں کرنی تھیں۔ شاید ہماری قسمت میں اتنا ہی ملاپ لکھا تھا..... شیرو..... ۱۹۴۷ء میں ہم اکیلے تھے' منتشر ہو کر لڑ رہے تھے۔ تب ہماری کوئی پہچان نہیں تھی—— مگر آج ہماری ایک پہچان ہے۔ ہم پاکستانی فوج کے سپاہی ہیں—— ہمارا گھر پاکستان ہے—— یہی ہے وہ گھر جہاں ہمیں امن میسر آ سکتی ہے۔ شیرو میرے بھائی! کشمیر کی پہاڑیوں سے نکلنے والے تمام دریاؤں اور ندی نالوں نے بالآخر یہیں اکٹھے ہونا ہے—— میری سانسیں نوٹ رہی ہیں شیرو..... وقت مختصر ہوتا جا رہا ہے..... خدا کے لیے یہ کبھی نہ بھولنا۔ اگر یہ آخری حصار بھی ٹوٹ گیا تو روئے زمین پر ہمیں کوئی پناہ گاہ میسر نہیں آئے گی۔ شیرو! میری لاش کو اسی مقدس سرزمین پر پہنچانا جس کے لیے ہمارے اجداد اور ہم خون

بہانے آئے ہیں—— مجھے..... مجھے..... پاکستان چھاؤنی پاکستان—— شیرو——
ان..... پاکستان کو اپنی امان میں رکھنا.....!"
اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

اس کے بعد اس کے لب تو ہلتے رہے' مگر ان سے آواز نہ ابھری۔ شاید وہ قرآنی آیات پڑھ رہا تھا' پھر اس کے لب ساکت ہو گئے۔

نائیک بچوں کی طرح سسکیاں لیتا ہوا اس پر جھک گیا۔ شیرو نے ایک لمحے کے لیے اس کی ویران آنکھوں میں جھانکا' پھر کانپتی انگلیوں سے اس کے پپوٹے بند کر دیئے۔ شدت غم سے اس نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔

فائرنگ اب اور تیز ہونے لگی تھی۔ اس نے سسکیاں لیتے نائیک کو کچھ کہنا چاہا' لیکن اس کا گلا رندھ گیا۔ اپنی ساری توانائیاں سمیٹ کر اس نے شرفو کو دوبارہ اپنے کندھے پر لادا اور چل دیا۔

اسے اپنے گرداگرد والی فائرنگ کی آوازیں سنائی ہی نہیں دے رہی تھیں۔ بس وہ چپ چاپ چلتا رہا—— چلتا رہا۔ اس کے پیچھے ابھی تک نائیک کی کوئی نہ کوئی ہچکی ضرور سنائی دیتی تھی لیکن وہ ماحول سے بالکل بے نیاز چلتا رہا۔ کئی مرتبہ چلتے چلتے نائیک اس کے سامنے آ کر رک جاتا۔ "ہم کو بتاؤ جوان ہم ادھر کیا بولے کہ ہمارا صاحب بھی نہیں رہا۔ ہمارا کپتان صاحب بھی ہم سے روٹھ گیا۔ سب اپنا ڈیوٹی پورا کر گیا۔ ہم کو بولو جوان۔ ہمارا ڈیوٹی کب پورا ہو گا۔ ادھر اپنا کمپنی والوں کو کیا بولے گا—— کیا بتائے گا۔ ہم کو بتاؤ جوان۔" "بٹ لو" کے شہیدوں کی روحیں ہمیں کب چین کا نیند سونے دیں گے۔ ہم کو بتاؤ جوان—— ہم کو بولو!"

اور—— جانے وہ کیا کیا کہتا رہا۔

شیرو ایک لمحے کے لیے رک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتا' پھر کسی سحر زدہ معمول کی طرح چلنے لگتا۔ فائرنگ کی آوازیں اب کم ہوتے ہوتے دم توڑنے لگی تھیں' شاید انہوں نے "حساس علاقہ" پار کر لیا تھا۔

نائیک اب اس کی منتیں کر رہا تھا کہ وہ اپنا "کپتان صاحب" کی لاش خود اٹھا کر لے جائے گا' لیکن شیرو تو جیسے بہرہ ہو چکا تھا۔

سرحد سے بمشکل چند گز دور فائرنگ پھر اچانک تیز ہو گئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر ان کی

آنکھیں پتا چوند ہو گئیں۔ "ہلت ـــــ ہلت!" کی للکاریں کو نجیں' لیکن ـــ ـــ وہ چلتا رہا'
کسی سحر زدہ معمول کی طرح ـــــ اپنی پناہ گاہ کی طرف بڑھتا رہا۔
اسے اپنے گرد و گرد خائیں خائیں کرتی گولیوں کی آوازیں بھی سنائی دیں دے رہی
تھیں۔ اس کے محسوسات کو تو شروع کی موت کے ساتھ ہی موت آ گئی تھی۔ بس اچانک ہی
اسے محسوس ہوا جیسے اس کی ٹانگ میں انگارہ سا دھنس گیا ہو۔
لیکن ـــــ وہ رکنے کو تیار نہ تھا۔
اس کے پیچھے چلنے والا نائیک پاگلوں کی طرح اپنے پونچ سے ونڈ کریئر اچھال اچھال کر
پھینک رہا تھا۔ گرنیڈ پھٹنے سے زیادہ اونچی آواز میں اس کی دھاڑیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ
دشمن کو کبھی جنونیوں کی طرح گالیاں دینے لگتا' کبھی زور زور سے نعرے مارنے لگتا۔
شیرو کے لیے اب قدم اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ اس کی ٹانگ میں گھس آنے والی آگ اب
اس کے خون کی گردش کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئی سارے جسم میں گھوم رہی تھی' پھر
اچانک اس کے سامنے سے فائرنگ ہونے لگی۔ شاید کسی پاکستانی او۔پی نے اسے گھیرے میں
دیکھ لیا تھا اور اب پاکستانی جوان اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لیے کوریگ فائر دے رہے تھے۔
ـــــ وہ اچانک ہی لڑکھڑایا اور پہلو کے بل گر پڑا لیکن گرتے گرتے بھی اس نے یہ
احتیاط برتی تھی کہ اس کے کیپٹن اشرف خان کی لاش کو کوئی گزند نہ پہنچے۔
اور پھر کچھ سائے پاکستانی سرحد سے اسے اپنی طرف بھاگتے نظر آئے۔ شاید وہ اپنے ان
ساتھیوں کو بچانے کے لیے جہنم میں کود گئے تھے۔
تمام احتیاطوں پر لعنت بھیج کر ـــــ!
اس نے ایک سائے کو خود پر جھکتے دیکھا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔
اس کی سماعت سے آخری آواز اسی نائیک کی ٹکرائی تھی۔ "چھوڑ دو مجھے ـــــ میں
ان کافروں کو مار ڈالوں گا۔ میرے صاحب کو مار ڈالا۔ میرا سب سنگی ادھر سری نگر میں رہ
گیا ـــــ میں واپس نہیں جاؤں گا ـــــ چھوڑ دو مجھے ـــــ اللہ اکبر ـــــ یا علیؓ ـــــ
اللہ اکبر ـــــ یا علیؓ۔" اس کے ساتھ ہی شیرو کی تمام حسیات کو موت آ گئی۔ پھر اسے
ہوش ایک فوجی ہسپتال میں آیا تھا۔
مظفر آباد کے اس قصبے میں جب شیرو نے ویگن سے نیچے قدم رکھا تو اس وقت شام اس
بستی میں اترنے لگی تھی۔ اسے ہسپتال سے تقریباً اک ماہ بعد صحت یابی پر رخصت ملی تھی۔

وہاں موجود ہر فوجی کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ یعنی اشرف خان شہید کا حال ہر شخص سے
ڈھکا چھپا تھا۔
ملک کی گراں قدر خدمات پر شیرو کے لیے وہ آنکھ میں احترام سے نہاں موجود تھے۔
وہ لوگ اس کی ہر طرح خدمت کے لیے تیار تھے' لیکن شیرو نے کسی سے کچھ نہ لیا۔ بس کبھی کبھی کوئی بڑا افسر اس سے ملنے آتا تو اس کے ماتھے پر بل پڑ جاتے۔ پہلے ایک ماہ کی فارروالی کے لیے اسے گاؤں نہ جانے دیا گیا۔ وہ اس کے لیے تیار کھڑی تھی' لیکن اس نے ان لوگوں کی پیش کش قبول نہ کی۔
ویگن سے اتر کر وہ پیدل ایک طرف چلنے لگا۔ سورج اس کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔ اس نے اب سرخ آگ کے گولے کا روپ دھار کر مانول کو اور رنگ میں شرابور کر دیا تھا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر لگے درختوں کی سرگوشیاں بڑی واضح اسے سنائی دے رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ رینگنے والی ہوا نے موسم کی خنکی اور ٹھنڈک میں خاصا اضافہ کر دیا تھا۔ گرم چادر اس کے کندھے پر دھری تھی' لیکن اس نے اسے کندھے پر پھیلائے رکھنے کا تکلف نہ کیا۔ ٹھنڈی ہوا میں وہ خاصا سکون محسوس کر رہا تھا۔
آبادی کے ایک کونے میں بنے مکان کی دہلیز سے لگی زہراں اور نوجوان نورولی کی بیوی نے اکٹھے ہی اس سمت دیکھا تھا۔ "یہ تو شیرو ہے ـــــ شیرو ہے زہراں ـــــ میں بچوں کو بتاتی ہوں۔ کہہ کر وہ بچوں کو آوازیں دیتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ شیرو سے ہسپتال میں مل چکی تھی۔
مکان کے دروازے کے باہر دو بچے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات لیے "اجنبی چاچا" کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر شیرو رک گیا۔ اس نے زمین پر بیٹھتے ہوئے اپنی دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ دونوں بچوں نے ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پہلے وہ جھجکے' لیکن پھر دونوں ایک ساتھ ہی دوڑتے ہوئے اس کی پھیلی ہوئی بانہوں میں سمٹ گئے۔
باپ کی وفات کے بعد سے وہ لاشعوری طور پر جو ایک خلا سا محسوس کرنے لگے تھے' ان بانہوں میں سمٹ کر انہیں اپنا ادھورا پن مکمل ہوتا محسوس ہوا۔ جیسے وہ کسی پناہ گاہ میں پہنچ چکے ہوں۔ شیرو کی چھاتی سے چمٹے ہوئے دونوں بچے نہ دیکھ سکے تھے کہ اس کی آنکھیں

HBC

بھیگ چلی تھیں۔ بڑے نامحسوس طریقے سے اس نے دونوں ہاتھوں کو الٹا کر کے بچوں کو سینے سے چمٹائے اپنی آنکھیں صاف کر لیں۔

"تم بالآخر آ ہی گئے شیرو۔" دروازے پر کھڑی زہراں آہستہ سے بڑبڑائی اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار گرم گرم آنسوؤں کے قطرے اس کے گالوں پر بہنے لگے۔

ساتھ والے مکان میں چلتے ریڈیو کی آواز خاصی بلند تھی۔ بہت سے لوگ کورس کی شکل میں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رہے تھے۔

وطن ہمارا آزاد کشمیر..... وطن ہمارا آزاد کشمیر۔

ستمبر ۸۴' لاہور۔

HBC

URDU SAG

کمانڈو
میں ایک جادوس تھا
وادی لہو رنگ
چناروں کے آنسو
کہساروں کی آگ
بھٹکا ہُوا راہی
وطن کی مٹی گواہ رہنا
لہو کا سفر